سالنامہ

ادبِ لطیف

مکتبۂ اُردو لاہور

مکتبہ اردو لاہور

اس وقت جبکہ ملک کے بیشتر ادارے گھٹیا قسم کا جنسی لٹریچر چھاپ کر عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے میں مصروف تھے ہر ایک اصلاحی پروگرام لیکر میدان میں آئے اور ہر قسم کی مشکلات کے باوجود اپنے مقاصد سے کنارہ کش نہیں ہوئے اگرچہ وہ وقت بھی بہت دور رہے جب ہمیں اپنی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے لیکن کم از کم اتنا ضرور ہے کہ اب ملک کا اہلِ نظر طبقہ ہماری کوششوں کو تحسین کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ ذیل میں مکتبہ اردو کی مطبوعات کی فہرست دی جاتی ہے۔ اس فہرست سے مکتبہ اردو کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نے اس فہرست کو سرسری نظر سے دیکھا بھی تو اتنا ضرور آپ محسوس کر سکیں گے کہ ہماری ادبی خدمت کا سلسلہ نہایت وسیع ہے اور ملک کا شاید ہی کوئی نامور مصنف ہوگا جس کا تعاون ہمیں حاصل نہ ہو۔ ان حالات میں آپ کا بھی یہ فرض نہیں کہ آپ ہماری خدمات کی داد دیں اور مکتبہ اردو کی سرپرستی کر اپنا مستقل شعار بنالیں۔

نئے زاویے نئے زاویے کی اشاعت اردو ادب میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہے اس ادبی تحریک کے چلانے والے زندگی سے فرار کے قائل نہیں زندگی کے متعلق ان کے زاویے نئے ہیں۔ اس مجموعہ کی تیاری میں جدید طرزِ فکر سے تعلق رکھنے والے مختلف اہلِ قلم نے حصہ لیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اردو کے بہترین اذہان کی بہترین پیداوار ہے۔ مرتبہ کرشن چندر۔ قیمت مجلد تین روپیہ۔

منٹو کے افسانے سعادت حسن منٹو نئے دور کا کامیاب افسانہ نگار ہے منٹو کی تحریریں ایک زبردست جلیل بھرپور تڑک بھڑک ہوتی ہے اس کی نگاہ گہری اور خیالات وسیع تر ہیں۔ منتخب افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (عٓہ)

ٹوٹے ہوئے تارے کرشن چندر اردو کے مقبول ترین ہر دلعزیز افسانہ نگار ہیں، ٹوٹے ہوئے تارے سب کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو افسانہ نگاری کا معراج دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ)

بگولے احمد ندیم قاسمی کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں آپ کے اشعار اور مختصر افسانے اردو ادب کے اس دورِ جدید میں ایک معزز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو اردو دان ان کے نام سے واقف نہیں اس کی معلومات ناقص ہیں۔ جو ادیب ان کی عظمت کا منکر ہے اس کا ادبی ذوق مکمل نہیں ہے۔ (ڈاکٹر تاثیر) بگولے بیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجلد عہ

گرہن راجندر سنگھ بیدی فن اور نقد نظر کے اعتبار سے ایک مکمل ادیب ہے، گرہن آپ کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں کئی ایک غیر مطبوعہ افسانے شریک ہیں، قیمت مجلد عہ

ماورا — ن۔ م۔ راشد۔ اس مجموعے میں راشد کی مقفیٰ نظمیں، اور سانیٹ ہی شامل نہیں بلکہ وہ جدید آزاد نظمیں بھی ہیں جنہوں نے راشد کو موجد اور پیشرو کی حیثیت سے لازوال شہرت بخش دی ہے۔ کرشن چندر کا تعارف، راشد صاحب کا دیباچہ جدید اردو شاعری پر خاص روشنی ڈالتے ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

نقشِ فریادی — فیض احمد فیض اردو شاعری کے جدید اسکول کے بہت بڑے نقاد و شارح ہیں۔ آپ الفاظ کے پیمان پیکر میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ پہلا مجموعہ کلام نقشِ فریادی، سوز اور خلوص، تغزل اور سیاسی تفکر، رومانیت اور معنویت شعری کا ساحت کامیاب امتزاج ہے۔ مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

آیات و نغمات — شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے افکار کا تازہ مجموعہ جو اردو شاعری کے دورِ ارتقاء کی صحیح جاگتی تصویر ہے۔ آیات و نغمات میں شاعرِ انقلاب نے اپنے آپ کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ اُس کی روح کا عکس ہے۔ اس کے نغمات میں اُن کی وجدانیت آپ کے دل کے تاروں کو مرتعش رکھیں گے۔ بہترین گردپوش، خوبصورت جلد، قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

آہنگ — اسرار الحق مجاز۔ ترقی پسند حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آہنگ اردو شاعری کے موجودہ رجحانات کا بہترین ترجمان ہے۔ اخلاقی و رومانی اور انقلابی رنگ کے لئے آہنگ کا مطالعہ کریں۔ دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد شائع ہوا ہے۔ مجلد عہ

رنگ و بو — پروفیسر فیاض محمود، اردو افسانہ نگاری کو حدِ کمال تک پہنچانے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ رنگ و بو اردو میں صحیح ہندوستانی معاشرت کے تمام خدوخال بڑی وضاحت سے پیش کرتا ہے۔ دلچسپی، قوتِ مشاہدہ، نفسیاتی تجزیہ، رنگین نگارش آپ کے افسانوں کی جان ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے (عہ)

دانہ و دام — راجندر سنگھ بیدی۔ حیاتِ انسانی کی گہرائیوں میں اُتر کر جو کچھ دیکھتے ہیں، جو کچھ محسوس کرتے ہیں، ان کو اس کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا مصنف ہی کی شدتِ احساس کے ساتھ حقائق کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ ہر ایک افسانہ حقیقت میں ڈوبا ہوا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

باسی پھول — علی عباس حسینی۔ شگفتہ پھول کبھی نہ کبھی وقت مرجھا جاتے ہیں، ان کا حسن اور خوشبو جاتی رہتی ہے۔ مگر علی عباس حسینی کے باسی پھول (چند افسانے) گلشنِ ادب کے وہ گلہائے خندہ ہیں جو کبھی بھی مرجھا نہیں سکتے۔ اردو کے تمام نقادوں نے ان افسانوں کو جدید افسانہ نگاری کا معراج قرار دیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

حُسن کی قیمت — حکیم احمد شجاع صاحب کے افسانے۔ سحر اعجاز کا ایک نادر مجموعہ ہے جس میں عورت کی محبت، گناہ کی کشش اور نیکی بدی کی طاقت کے ہر پہلو کو ایک نہایت ہی پُرزور اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کے اسرار کا پہلا انکشاف جو دنیائے ادب اور مشاہیر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت عہ

کونپل ۔ اوپندر ناتھ اشک اردو، ہندی، پنجابی ہی نہیں گجراتی، مرہٹی اور تامل میں بھی لکھتے ہیں کونپل آپ کی بہترین منتخبہ معاشرتی و سماجی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کا ہر ایک افسانہ فنی لحاظ سے مکمل، دلچسپ، موثر اور فرسٹ ہے۔ قیمت عہ

طلسم خیال ۔ کرشن چندر رفعت آثار، مالی واقع ہوئے ہیں۔ ان کے افسانے رومانیت کی خوشبو سے لبریز ہیں۔ لیکن انہوں نے واقعیت سے کہیں بھی گریز نہیں کیا۔ حیاتِ انسانی کا گہرا مطالعہ موجودہ معاشرت پر طنز کے تیز تر نشتر جس [illegible] بے تکلف ظرافت بھی ہے۔ ان کی زبان بہت پاکیزہ ہے۔ ان کی ترکیبوں میں جدت ہے۔ طلسم خیال ایک درجن منتخبہ افسانوں کا مجموعہ ہے قیمت عہ

پاپی ۔ اوپندر ناتھ اشک کے ڈرامے زندگی کا مرقع دیتے ہیں۔ وہ ہماری معاشرتی کمزوریوں کو اس طرح بے نقاب کرتے ہیں کہ انہیں پڑھ کر ہم اپنے گرد و پیش کی حالت کو دیکھنے اور اس پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ سماجی رسوم اور توہم پرستی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی روح کس طرح تڑپتی ہے۔ اس کی بہترین تصویر اشک کے بہترین [illegible] طربیہ، طنزیہ اور المیہ ڈراموں کے مجموعہ پاپی میں دیکھئے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

آؤ ۔ سعادت حسن منٹو کے دس ریڈیائی ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے جو دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی اور حیدرآباد سے بارہا نشر ہو چکے ہیں۔ بہترین [illegible] کے ٹائٹل قیمت ایک روپیہ (عہ)

شعلے ۔ پروفیسر حمید علی، فطرتِ انسانی کے اسرار و رموز آشکار کرنے والے ریاکاری کے حسین نقاب کو چاک کرنے والے افسانے وہ کتاب جسے ادب دوست اور شاعر چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں۔ زبان [illegible] اور دل [illegible] حسن و لطافت، سرمایہ و محنت کی کشمکش صاف اور شستہ اردو۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

سرکش روحیں ۔ دنیا کے مشہور مصنف جبران خلیل جبران نے ان افسانوں میں اپنی دلدادہ و سرکش روحوں کی [illegible] کا نقشہ کھینچا ہے جو سرکشی میں آلام [illegible] طوفان کی طرح [illegible] ترجمہ ملک کے مشہور ادیب ابوالعلا چشتی (حاجی لق لق) نے براہ راست عربی سے کیا ہے۔ قیمت بارہ آنے (۱۲)

حاجی لق لق کے افسانے ۔ ارے بھائی آپ نے اب تک حاجی لق لق کے افسانے نہیں پڑھے۔ آج ہر شخص حاجی لق لق کے افسانوں کا دیوانہ ہے کیونکہ حاجی لق لق اردو ادب میں اپنی مخصوص مزاح نگاری کا واحد مالک ہے۔ آپ اسے [illegible] جانتے ہیں۔ تو آج ہی حاجی لق لق کے افسانے پڑھئے۔ ٹائٹل [illegible] آپ اسے دیکھتے ہی بے اختیار ہنس پڑیں گے قیمت ایک روپیہ۔ (عہ)

نغمۂ حرم ۔ (اختر شیرانی) جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہر جگہ روشنی پھیل گئی ہے اسی طرح حضرت اختر شیرانی کی دلآویز رومانی نظموں کے مجموعہ کے متعلق یہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ اختر شیرانی کا مجموعہ کلام ہے اس وقت اختر

رفیقِ تنہائی: [illegible] ہندوستان کا [illegible] دیہاتی نظموں کا مجموعہ ہے جو آزاد یوں کے لحاظ سے ہیں۔ سال آپ ہے عمر علی عباس حسینی ہے [illegible] دیہاتی [illegible] کا مجموعہ لکھنو کی سادہ وصاف اردو قیمت

منظر و پس منظر: [illegible] کا مجموعہ جو ادبی حلقوں [illegible] سادہ معمولی ہیں۔ ان افسانوں میں [illegible] کی عادتی [illegible] کا اندازہ [illegible] ہے [illegible]

ٹیپو کی حکومت: [illegible] کی [illegible] سیاست [illegible] کے دستخط [illegible] اور شرائف السلطنی سے جاری اعلان [illegible] جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے میں انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے [illegible] دوسرا [illegible] مجلد عمر

ترکی جمہوریہ: [illegible] کے بعد [illegible] رکوں [illegible] کے لئے [illegible] کوشش [illegible] سید محمد ہاشمی اس قابل قدر (امراؤ تش) [illegible] عثمانی [illegible] کے بعد [illegible] جمہوریہ کی مکمل [illegible] کے کارنامے [illegible] پیش کرتے ہیں۔ قیمت عمر

لینن: کارل مارکس کے [illegible] سب سے پہلے لینن نے [illegible] عملی صورت دی [illegible] کا [illegible] انقلاب روس ہے۔ کتاب [illegible] کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر محمد [illegible] کتاب میں [illegible] کو نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عمر)

صحرانورد کے خطوط: [illegible] کا مجموعہ [illegible] کے خطوط جیسی دلچسپ اور رنگین کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی صحرانورد کے [illegible] دو [illegible] کا [illegible] رات [illegible] کی طرح بسیط ہیں [illegible] اور [illegible] میں [illegible] عجائب و [illegible] قیمت ڈھائی روپے (ہیر)

پریم کا بادو: [illegible] کا مجموعہ [illegible] کو پڑھتے [illegible] کے سامنے ہندوستان کا عہد ماضی [illegible] انگریز [illegible] کے ساتھ [illegible] کی [illegible] کے عالم میں [illegible] ہیں۔ [illegible] کی لاثانی تحریر [illegible] ہے

دنیا کی حور: [illegible] یہ کتاب [illegible] کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ بالکل ہمارے تمدن اور معاشرت کے مطابق ہے [illegible] خود کو [illegible] الفاظ کا [illegible] ہے اور [illegible] غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے دل و دماغ پر [illegible] اور [illegible] عام ہے۔ زبان کی سلاست، سادگی [illegible] کی [illegible] نے کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ کیا ہے قیمت عمر

آبگینے: [illegible] انصاری کے قطعات [illegible] اردو کی شاعری میں [illegible] کے لائق ہیں۔ [illegible] کی یہ [illegible] شاعری کی جدت طرازی [illegible] کے [illegible] کے اعتبار سے اردو شاعری میں [illegible] کا اضافہ [illegible] حسن، جدت [illegible] اور وحدت آفرینی ان قطعات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عمر)

آزادی کی راہیں ۔ برٹرینڈ رسل ۔ تحریک آزادی کی داستان بہت پرانی ہے ۔ ابتدائے آفرینش سے انسان ایک مسلسل جدوجہد کا شکار رہا ہے ۔ اس کتاب میں مغربی مفکر برٹرینڈ رسل نے ان تحریکوں کا ذکر کیا ہے جن کی بنیاد پر آزادی ملی ہے ۔ اس میں ان حالات کی وضاحت کی گئی ہے جس نے دست و بازو ... زبردست ... کے مختلف سیاسی تحریکوں کا محرک بنایا ۔

ماتا ہری ۔ ... ماتا ہری دنیا کی وہ عورت ہے جو ... کے سامنے ... ہے ۔ یہ ایک ایسی ... جاسوسہ ہے جس نے اپنے ... دنیا ... عالم ... میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا ۔ کتاب کا ہر باب بے حد دلچسپ ... ہے جرمن جاسوسہ ماتا ہری کی ... اور ... کا علم اس کتاب کے مطالعہ سے ہوگا ۔ قیمت ایک روپیہ ۔

سیرت امام ابن تیمیہ ۔ تقی الدین ابو العباس احمد ابن تیمیہ کی داستان حیات ۔ ان کی ساری زندگی ... کی ... آپ کا ... کے بعد ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے مرتب کیا ہے ۔ کتاب ... خوبصورت ... مجلد عہ

پاکستان اور چھوت ... چودھری ... کی یہ کتاب ہندو مسلم تعلقات کو ... اچھے رنگ میں پیش کرتی ہے ... ہندوستان سے دور بیٹھے کسی مبصر کا بیان نہیں بلکہ ... ہندوستان میں ... کی ... اس باب پر ... اخبارات سے اس موضوع پر لکھی گئی ... کتاب ... ہے ۔ قیمت ۲

ادبستان ... دہلوی اپنی مخصوص انشاپردازی کی ... کے لیے بہت شہرت رکھتے ہیں ۔ ... نثر ... میں ... قاری کے دل و دماغ پر نشے کی لہر دوڑا دیتی ہے ۔ ... مصنف کے تمام مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے ... کی شعریت ... کتاب کے آغاز میں اردو کے لاثانی رومانی شاعر حضرت اختر شیرانی کا بسیط مقدمہ بھی ... مجلد دو روپے (عہ)

زندگی کے موڑ پر ... طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ ۔ اردو ادب میں اپنی طرز کی پہلی تصنیف ۔ طویل مختصر افسانہ اگرچہ مغربی ادبیات میں ... لیکن اردو میں تقریباً ایک نئی سی چیز ہے ۔ زیر طبع ۔

تین پیسے کی چھوکری ۔ ... کے اسلوب میں مصنف کی مخصوص انشا کی ... ہر فقرہ دل میں اتر جاتا ہے کہیں ... ہیں تو کہیں مسرت ، کہیں طنز ہے تو کہیں درد ۔ آپ ... ہر فقرے پر تڑپ اٹھیں گے اور محسوس کریں گے کہ الفاظ ... کی طرح آپ کے دل میں اتر گئے ہیں ۔ مجلد عہ

منٹو کے ڈرامے سعادت حسن منٹو ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں لاثانی ہے ۔ منٹو کے افسانوں کے بعد منٹو کے ڈرامے ... طویل ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ جس میں مشہور ڈرامہ ... بھی شامل ہے جس کے نشر ہونے پر ہندوستان کے طول و عرض میں شور برپا ہو گیا تھا ۔ زیر طبع ۔

میرزا غالب: سعادت حسن منٹو نے میرزا اسد کے عشق و محبت کی دردناک داستان قلمبند کی ہے۔ مستند سوانح حیات بھی ہیں جن میں جابجا افسانوی رنگ بھر گیا ہے۔ اس چابکدستی سے غالب کی داستانِ حیات کے منتشر ٹکڑے جمع کیے گئے ہیں کہ ایک شاندار ڈرامہ تیار ہو گیا ہے۔

نقشِ دوام: سید عبدالحمید عدم کی سلاست آفریں، جذبات پرور نظموں اور وجد آفریں، دلآویز غزلوں کا مجموعہ۔ جدید نظم گوئی کے ارتقا، موجودہ دور کے شاعروں کے بہترین تغزل اور فلسفیانہ جذباتی رنگِ سخن سے لطف اندوز ہونے کے لئے نقشِ دوام کا مطالعہ کریں۔ مجلد مطلا عہ

آہنگِ رزم: وقار انبالوی — آہنگِ رزم اردو ادب میں جنگی ترانوں کا پہلا اور بہترین مجموعہ ہے۔ ہر نظم میں سپاہی کی زندگی کے جوش انگیز پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کتاب کو ہندوستان کی مشہور صحافت نے اس دور کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن مجلد آٹھ آنے

روحِ ادب: حضرت جوش ملیح آبادی کا سب سے پہلا مجموعہ نظم و نثر جو اہلِ ذوق کے پُراصرار مطالبہ پر ۲۲ سال بعد شائع کیا جا رہا ہے۔ شاعرِ انقلاب نے روحِ ادب میں کیا پیش کیا ہے۔ اس کی تعریف حضرت اکبر الہ آبادی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں: ”عبرت، معرفت، بیخودی، جوش، روحانی سے آپ کے اشعار لبریز ہوتے ہیں۔ آپ نے چشم بددور عمدہ طرزِ بیان پایا ہے، ایسی سوسائٹی میں رہ کر ایسے خیالات عالی حیرت افزا ہیں۔“ قیمت

ادبِ کثیف: حاجی لق لق کا ادبِ کثیف اس بے ربط اور غیر موزوں ادبِ لطیف کی دلچسپ اور روح پرور پیروڈی ہے جو آج کل کے بعض نوجوان لکھتے ہیں۔ ادبِ کثیف کا ایک ایک جملہ غمگین سے غمگین شخص کے لب پر تبسم کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

پیغمبرِ صحرا: یہ شیخ خالد لطیف گابا کی انگریزی کتاب پرافٹ آف دی ڈیزرٹ کا اردو ترجمہ ہے جس میں اصل کی تمام خوبیاں برقرار رکھی گئی ہیں۔ اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات کو آسان، عام فہم اور دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد دو روپے (عہ)

آخری فیصلہ: جناب قیسی رامپوری کا ”آخری فیصلہ“ نہایت دلچسپ اور دلآویز ناول ہے جس کے کردار جیتے جاگتے انسان ہیں جس کے ہوشربا واقعات کا تسلسل آپ کو ورطۂ حیرت میں گم کر دیگا، مزاحیہ حالات آپ کے دل کو کشتِ زعفران بنا دیں گے۔ قیمت

شبستانِ الم: محترمہ زبیدہ سلطانہ کے افسانوں کا مجموعہ (زیر طبع)

کچھ آنے والی کتابوں کا سلسلہ

سوشلزم — فریڈرک اینگلز شاہین — اشرف عطا جاگیرداری — عبداللہ ملک گورکی کی ڈائری — حسن عباس
سرمایہ داری — عبداللہ ملک عناصرِ تہذیب — ابوسعید قریشی مشین اور مزدور — باری سبھاش بوس۔ گاندھی۔ گوپال متل
کارل مارکس — باری عصمت انونو — اشرف عطا محمد عربی — باری رضا شاہ پہلوی — اشرف عطا
انقلابِ فرانس — باری پھول اور کانٹے — گوپال متل ہندوستان کے لیڈر — یوسف جعفر علی ٹراٹسکی — نریندر ناتھ
راجہ اور کسان — مترجمہ عبداللہ شہنشاہ حبشہ — اختر اورینوی اقبال اور اس کا پیغام — ڈاکٹر خالد وفا فاشزم — ترجمہ باری

سالنامہ

ادبِ لطیف

سنہ ۱۹۴۲ء

نگران:-

فیض احمد فیض

ایڈیٹر:-

چوہدری برکت علی
چوہدری نذیر احمد

مکتبہ اُردو لاہور

224

فہرست

ادارہ

اشارات

ادبِ لطیف کا سالنامہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اس شمارہ کے لکھنے والوں اور اُن کی تحریروں کے متعلق ہمیں توصیف و تعلّی کی ضرورت نہیں۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک مصنف کی ادبی شہرت اور اس کی کسی ایک تحریر کی ادبی قدر و قیمت میں مطابقت نہیں ہوتی اس لئے ہماری ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ ہر تحریر کو ایک یکساں اور قطعی معیار سے جانچا جائے اور کسی تحریر کو محض لکھنے والے کے نام کی وجہ سے مستحسن یا مذموم قرار نہ دیا جائے۔ اسی وجہ سے ہم اس شمارہ کو اور بھی زیادہ مسرت اور اعتماد سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس میں آپ کو نہ صرف ہر صنفِ ادب کے مقتدر ادباء کے نام یکجا دکھائی دیں گے۔ بلکہ ہر تحریر بذاتِ خود ایک امتیازی قیمت کی حامل دکھائی دے گی۔

ہماری تنقیدی اصطلاحات 'مبادیٔ تنقید' کے سلسلے کا تیسرا مضمون ہے اس سے اگلا مضمون 'ترقی پسند ادب کی نوعیت' کے متعلق ایک بحث کی صورت میں ہوگا۔ 'ادب اور پروپیگنڈا'، 'شاعر کی اقدار'، 'عملِ شعر کی نفسیاتی تحلیل' اس سلسلے کے دوسرے موضوعات ہیں۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ مضامین ہمارے تنقیدی ادب میں مستقل اضافہ ہوگا۔

آج کل اکثر سننے میں آتا ہے کہ ادب کو زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود ادب کے اکثر شائقین کو زندگی کے روزمرہ حقائق سے ایک گونہ بُعد ہے۔ کئی ایک نوجوان ایسے ہیں جنہیں ارسطو سے لیکر رچرڈز تک مشہور نقّاد کے معقولات حفظ یاد ہیں لیکن ادب اور زندگی کے متعلق نہایت صحیح نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود انہوں نے یہ دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ فاشزم کسے کہتے ہیں اور اشتراکیت کس بلا کا نام ہے۔ بہت سی سُنی سُنائی باتیں ہم سب کو یاد ہیں لیکن ہماری موجودہ زندگی کے اقتصادی نظام، موجودہ دور کی اہم سیاسی تحریکات، اس صدی کے اہم تاریخی واقعات اور ان کے علل و اسباب کے متعلق ابھی تک ہماری معلومات نہایت محدود ہیں۔ 'مبادیٔ تنقید' کے ساتھ ساتھ ہم اس شمارہ سے سیاسی مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کر رہے ہیں۔ 'سرمایہ داری کا عروج اور زوال' اس سلسلہ کا پہلا مضمون ہے اس کے بعد پروفیسر محبّ الحسن فاسیت کے عروج و ارتقاء اور اس کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر روشنی ڈالیں گے۔

گزشتہ کی طرح ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ تنوّع کے ساتھ مختلف تحریروں میں ایک مرکزی ربط اور تسلسل قائم رہے۔ اس وقت ہمارے ادب میں بہت سے متضاد اور متناقض رجحانات کارفرما ہیں۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی ہمارا دور رومانیت اور حقیقت پسندی کا دور ہے۔ ہماری سماجی زندگی اور اس کے مختلف پہلو اب مضامین کی حد سے گزر کر 'تجربات' میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں سماجی زندگی کی معنویت اب

محض مضمون آفرینی نہیں بصنف کی اپنی شخصیت اور اُس کے اپنے مشاہدات کا اظہار ہے۔ اسی رجحان کو چند ایک ترمیمات اور تشریحات کے ساتھ ترقی پسندی کہا جاتا ہے اور موجودہ دور میں سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ استوار رجحان یہی ہے۔ ایک ادبی رسالہ نہ صرف اپنے دور کے مختلف رجحانات کی آئینہ داری کرتا ہے بلکہ ان کی اضافی اہمیت بھی واضح کرتا ہے (یا کم از کم اُسے ایسا کرنا چاہئے) چنانچہ ادبِ لطیف کا ادبی نقطۂ نظر اور مرکزی رجحان وہی ہے جو آج کل کے اردو ادب کا رجحان ہے۔ اور مسرت کی بات ہے کہ اُسے اس رجحان کے قائم رکھنے میں ادبی یا فنی اقدار سے کوئی گھاٹے کا سودا کرنا نہیں پڑا۔

ہمیں اُن سب کرمفرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے سالنامہ کی تدوین و ترتیب میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ افسوس ہے کہ کاغذ کی گرانی اور کمیابی کے سبب حجم اور ضخامت میں کفایت ناگزیر ہو گئی اور بہت سے مضامین قلتِ گنجائش کے سبب شائع نہ ہو سکے۔ ہم اُن معاونین سے معذرت چاہتے ہیں جن کے مضمون سالنامے میں شامل نہیں کئے جا سکے۔ ان میں سے بیشتر آئندہ اشاعتوں کے لئے رکھ لئے گئے ہیں ؎

معذرت۔ ہمیں اس امر کا یقیناً افسوس ہے کہ سالنامہ کی اشاعت میں اتنی تاخیر ہوتی۔ لیکن اس تاخیر کے بیشتر اسباب غیر اختیاری تھے۔ ایک مدت تک تو سائز کے متعلق تذبذب رہا اسلئے کہ رسالہ کے عام سائز کا کاغذ قطعاً نایاب ہو چکا تھا، اسی موقعہ پر صوبہ بھر کے تاجروں اور دوکانداروں نے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ بہزار دشواری کاغذ فراہم ہوا، اور اسی وجہ سے مضامین کی کتابت بھی التوا میں پڑی رہی۔ بہرحال ہم اُمید رکھتے ہیں کہ سالنامہ کے مضامین اس کوفت کی بہت حد تک تلافی کر دیں گے۔ سالنامہ کو دسمبر اور جنوری کا پرچہ تصور کیا جائے۔ فروری کا پرچہ عنقریب قارئین تک پہنچ جائیگا۔

چودھری افضل حق اور حکیم آزاد انصاری۔ ہمیں دُکھ ہے کہ قریباً ہر شمارہ میں اشارات کا خاتمہ کسی نہ کسی اندوہناک خبر پر کرنا پڑتا ہے۔ ایک سال کے اندر اندر ٹیگور، اعظم بیگ چغتائی، فانی بدایونی اسکے بعد دیگرے ہم سے رخصت ہو گئے۔ ماہ گذشتہ میں ملک کیجان نثار چودھری افضل حق اور ادب کے مخلص شیدائی حکیم آزاد انصاری بھی چل بسے۔ چودھری افضل حق اس بدنصیب ملک کے اُن بے غرض اور بے خوف فرزندوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے سرمایہ کا ہر حبہ، اپنے وقت کی ہر ساعت، اپنے خون کی ہر بوند سعیٔ آزادی پہ نچھاور کر دی۔ جن کی ہستی سے عاشقانِ پاک طینت کا تصور اب تک دنیا میں موجود ہے۔ چودھری افضل حق کی وفات ارباب وطن اور ارباب علم و ادب کے لئے یکساں اندوہناک ہے۔ ایسا تیز مسلسل جسمانی اور دماغی کاوش کے ساتھ ساتھ مرحوم تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی اُسی مستعدی اور خلوص کے ساتھ سرگرم رہے جو اُن کی مسلسل سیاسی کاوشوں کا خاصہ تھا۔ زندگی، محبوبِ خدا، آزادیٔ ہند، جواہرات، پاکستان اور عورت (انگریزی) اُن کی مقبول کتابیں ہیں۔ حکیم آزاد انصاری اس پُرانی روایتِ شاعری کی یادگار تھے، جس کے نام لیوا اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ خالص الفاظ کی فصاحت زبان و روزمرہ اور شائستگی کی طرح ایک مردہ فن ہوتا چلا جا رہا ہے اور یہ امر بہت قابلِ افسوس ہے۔ اسلئے کہ ان فنوں کے بہت سے عناصر ایک مخصوص جمالیاتی حظ کے حامل ہیں۔ جسے ہمیشہ کے لئے کھو دینا گویا ایک عضو کا ایسا ہے جس سے عمداً دستبردار ہونا ہے۔ آزاد کی شاعری کا دوسرا خاصہ اُن کی اپنی شگفتہ اور بے تکلف شخصیت ہے جس کی وجہ سے اُن

کے کلام میں جگہ جگہ رنگینی اور سادگی کی لہریں رواں دواں دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کا مجموعہ کلام معارفِ جمیل کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو رہا ہے

ڈاکٹر تاثیر

موجودہ اردو غزل

نگارِ بابت جنوری فروری ۱۹۴۱ء پیشِ نظر ہے۔ نیاز صاحب نے مجھے تبصرہ کرنے کے لئے کہا۔ یہ "غزل نمبر" کا خیال بہت خوب ہے اردو کے بہت سے غزل گو شعراء کے اپنے انتخاب کردہ اشعار اور حالات اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ چند نام یونہی درج کئے گئے ہیں اور چند علاوہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ مدیر کے تنقیدی توازن کا معاملہ ہے! ——— اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ درج کردہ اشعار واقعی بہترین ہوں! اس مجموعہ میں شعراء کے خود نوشت حالات خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہیں۔ اکتیس شعراء کا تذکرہ ہے۔ ان میں پانچ ہندو ہیں۔ تین حضرات نے حالات بہم نہیں پہنچائے۔ باقی تیئیس رہ گئے۔ ان کی ایک مشترک صفت قابلِ توجہ ہے۔

(۱) آرزو لکھنوی۔ "جدِ اعلیٰ ہرات کے رہنے والے تھے"۔ (۲) اختر شیرانی الافغانی (۳) امید امیٹھوی۔ "مورثِ اعلیٰ۔۔۔۔ ولایت غزنی سے ہندوستان آئے" (۴) تاجور "درانی افغانی" (۵) ثاقب "وطن طبرستان"۔ "مولد آگرہ" (۶) جوش "بزرگ قابل سے آئے، اکثر افراد اس خاندان کے سلطنت اودھ میں اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے" (۷) فانی۔ "اصلی وطن کابل" (۸) ماطق۔ "مورثِ اعلیٰ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تشریف لائے"۔ (۹) ناطق لکھنوی "جدِ اعلیٰ۔۔۔۔ بغداد سے ہندوستان آئے" (۱۰) یگانہ "چنگیزی" (۱۱) آزاد "سلسلہ حضرت ایوب انصاری تک پہنچتا ہے"۔

ان گیارہ حضرات نے توضاحت اور التزام سے اپنا غیر وطنی ہونا ظاہر کیا ہے۔ باقی بزرگوں کے متعلق چند معلومات توجہ طلب ہیں۔

(ا) اثر لکھنوی ——— "اسلاف خاندان شاہی سے متوسل تھے" (ب) جلیل ——— "نظام دکن کے استاد۔۔۔۔ شاہزادگان اور صاحبزادگان بھی حسب حکم سرکار کلام دکھاتے ہیں"۔ (ج) جگر ——— "مورثِ اعلیٰ۔۔۔ شاہجہان کے استاد"۔ (د) حفیظ ——— "میرا خاندان دو سو برس پہلے چوہان راجپوت کہلاتا تھا۔۔۔۔۔ سورج بنسی ہونیکا "مدعی" (ک) فراق ——— "میرے بزرگوں کو پانچ گاؤں شیر شاہ کے دیئے ہوئے ہیں" (ل) کیفی ——— "بزرگ۔۔۔ فرخ سیر۔۔۔ کے مرکزی دفاتر میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہو گئے"۔ (م) ساحر ——— "رنجیت سنگھ اور ان کے جانشینوں کے مشہور دیوان راجہ دینا ناتھ آپ ہی کے خاندان کے ایک معزز رکن تھے۔ آپ رائے بہادر۔۔۔۔ رئیس دہلی کے خلفِ اکبر ہیں"۔

یہ اٹھارہ حضرات رئیسوں نوابوں اور بادشاہوں سے خاندانی تعلقات رکھتے ہیں۔ شاید تین چار اور بھی اسی قسم کی روایاتِ نسبی کے حامل ہونگے۔ اور اس امر کو شعوری طور پر وجہِ فخر سمجھتے ہونگے۔ باقی ماندہ شعرا میں سے چند ایک ضرور طبقۂ امرا کی طرزِ عمل اور سماجی روایات کو پسند کرتے ہونگے (کبھی حسرت کو کبھی جگر کو کبھی کسی اور کو شاید اسی رعایت سے "رئیس المتغزلین" کے لقب سے نوازا جاتا ہے... نادانستہ طور پر سہی!) ایک شاعر[1] یہ کہہ کر کہ جدید اردو ادب کی تعمیر کرنے والے ۔۔ فیصدی میرے شاگرد ہیں مطمئن نہیں ہوا۔ اور جب تک ذاتی سرمایہ ۲۰ ہزار تک نہیں لیا، چین نہیں آیا۔ ان حضرت نے صوبجاتی نفاق کو بھی ابھارنا چاہا ہے! رئیسوں، نوابوں کے درباریوں کی طرح۔ غرض بیشتر متغزلین حضرات کا سماجی رشتہ طبقۂ رؤسا سے ہے۔

یہ توضیحات مدح یا تنقیص کی غرض سے نہیں کر رہا۔ ایک جاذبِ توجہ حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے۔ ان شعرا میں سے جو نظم گو بھی ہیں یعنی احسان دانش، اختر شیرانی، جوش، حفیظ، سیماب، تلوک چند، ملا، افسر میرٹھی کسی نے بھی اپنے رئیسی تعلقات کا خود ذکر نہیں کیا (حفیظ بھی کہتا ہے کہ "غرور میری ذات تک پہنچا اور ختم ہو گیا") غزل گو کیوں نمائش پسند ہیں اور نظم گو روایات کے بندھن سے آزاد معلوم ہوتے ہیں۔ کیا یہ افتادِ طبیعت خود غزل اور نظم کی صنف سے متعلق تو نہیں؟ (واضح رہے کہ "غیر وطنی" ہونا .... "ولایتی" ہونا . موجبِ فخر سمجھا گیا ہے کیونکہ "افغان" اور "مغل" حاکم اقوام تھیں۔ ان کے عمائد "ولایتی" تھے۔ اب صورتِ حالات مختلف ہے۔ مگر وہ افتخار کی روایت موجود ہے۔ آجکل "ولایت" سے مراد یورپ ہے۔ اور "ولایت رفتہ" ہونا وجہِ ناز ہے)

ان اکتیس شعرا میں سے کوئی بھی (آنند نرائن ملا اور فراق کے علاوہ) بی۔ اے سے آگے نہیں بڑھا۔ پانچ (اثر، حسرت، فانی، محروم، افسر) بی۔ اے پاس ہیں۔ اور ان ساتوں میں سے غالباً صرف فانی[2] نظم نہیں کہتے۔ حسرت نے بھی بہت کم نظمیں کہی ہیں۔ اثر کی نظمیں بہت کم شائع ہوئی ہیں!

نظم گو شعرا انگریزی سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اختر، جوش، حفیظ، سیماب، کیفی، روش، علی اختر، محروم، ملا، افسر یعنی احسان کے علاوہ سب کے سب! خالص غزل گو شعرا کی اکثریت انگریزی تعلیم سے بے نیاز ہے! —— پرانی رئیسی روایات سے وابستگی اور نئی تعلیم سے بے تعلقی۔ یہ ہے عام متغزلین کے ذہنی پس منظر کا ایک نمایاں پہلو! ——

مدیرِ نگار نے ان شعرا کو "دورِ غزل گوئی کی آخری نشانیاں" کہا ہے۔ غزل سے ان کی مراد "غزل یعنی حسن و عشق والی غزل" ہے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ حسن و عشق کا بازار سرد پڑ گیا ہے۔ یا یہ کہ "غزل" بحیثیت ایک صنفِ سخن حسن و عشق کے محرکات کے اظہار کے لئے بیکار ہو گئی ہے؟

---

[1] یعنی شمس العلماء مولانا تاجور — مدیر

[2] یہ مضمون اگست ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا جب فانی زندہ تھے۔ مدیر

[illegible] صاحب کا استدلال کچھ ایسا قابلِ قبول معلوم نہیں ہوتا۔

"غزل" سے مراد یا تو محض "یک قافیہ کلام ہے۔ مگر قصائد اور نظمیں بھی یک قافیہ ہو سکتی ہیں۔ یا "غزل" سے مراد حسن و عشق کے مضامین ہیں اور یہ غزل اور نظم میں مشترک ہیں۔ یا ان دونوں کا امتزاج یعنی یک قافیہ عشقیہ کلام ـــــ یہ قصاید کی تشبیب میں اور نظموں میں بھی ہو سکتا ہے اور پھر مروجہ غزل میں غیر عشقیہ مضامین بھی ہوتے ہیں۔

میری رائے میں "غزل" کے لئے یک قافیہ ہونا ضروری ہے۔ یہ نفی وصف ہے اور اس کا دوسرا بنیادی وصف یہ ہے کہ مختلف اشعار میں منطقی تسلسل نہ پایا جائے۔ اشعار متفرق ہوں ـــ مضمون کے اعتبار سے ـ ـ جب تسلسل ہوتا ہے تو ہم صراحت سے اسے مسلسل غزل یا قطعہ وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ گویا غزل کے لئے تسلسل غیر معمولی ہے ـــ غزل کی ساخت میں یکانگت ردیف قافیہ سے ہوتی ہے۔ اور مضمون متفرق ہوتے ہیں!

کیا یہ اوصاف ہماری تمام شاعرانہ ضروریات کے منافی ہیں۔ اور لازمی طور پر ہم فنا پذیر ہیں؟

یک قافیہ اشعار دنیا کی شاعری میں ہر دور میں کہے گئے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ یہ انتظام بیکار ہو جائے حسن و عشق کے مضامین کی عالمگیری بھی مسلمہ ہے۔ فطرتِ انسانی حسن و عشق سے وابستہ رہی ہے اور رہے گی۔ اشعار میں منطقی تسلسل کا نہ ہونا بھی کسی طرح طبعِ انسانی کے منافی نہیں ہمارے احساسات اور جذبات کی رَو عموماً غیر مسلسل اور غیر منطقی ہوتی ہے۔ اس لئے عدمِ تسلسل عین مطابقِ فطرتِ انسان ہے۔ آج کل تو نثر میں بھی (بالخصوص افسانوں میں) شعورِ انسانی کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے کہ خیالات آگے پیچھے چلے آتے ہیں۔ کبھی ماضی کبھی حال کبھی مستقبل میں۔ اچھلتے ہوئے سے! Joyce اس انداز کا امام تھا اور شاید ہی کوئی جدید مصنف ہو جس پر اس کا اثر نہ ہو ـــ تو پھر یک قافیہ مگر غیر مسلسل اشعار یعنی غزل کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنف مٹنے والی ہے! ـــ

حقیقت یہ ہے کہ غزل مٹ نہیں رہی بلکہ جس نہج کی غزل داغ کے وقت تک مروج تھی وہ شاید مٹ رہی ہے (داغ کے وقت تک بھی غزل کے ملئے دو واضح طریق تھے۔ نقاد دلی اور لکھنو سکول کا نام دیکر ان میں امتیاز کرتے ہیں) اس کی وجہ ظاہر ہے۔

ہماری غزل درباروں کی پیداوار تھی۔ بڑے بڑے نوابوں اور مٹے ہوئے رئیسوں کے درباروں کی! ـــــ اس میں اسی قسم کے تاثرات کا اظہار ہوتا تھا۔ جو اس فضا میں پنپ سکتے تھے۔

نواب صاحب کا دربار ہے۔ درباریوں کے جتھے ہیں جو جوڑ توڑ میں لگے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ اور نواب کی توجہ، شاعر ہو یا کوئی اور پروردۂ سرکار ہو۔ ان لوگوں کی زندگی اور مسرت کا باعث ہے۔ نواب مطلق العنان۔ دروازے پر صاحب دربان ہیں!

یہ نواب کے دربار کا نقشہ ہماری "غزل" کا سرمایہ حیات تھا۔ غزل کا بھی اور غزل گو کا بھی۔

چنانچہ شعراء کا معشوق بھی گویا نواب تھا۔ وہی "رقیب" وہی "دربان" وہی مطلق العنان، متلون المزاج شخص!

ادب اور فن کی سرپرستی انہی درباروں میں ممکن تھی۔ عوام اس قابل نہ تھے کہ شعراء کی قدر کر سکیں۔ یا ان کو زندہ رکھ سکیں طباعت

اور عام تعلیم کا دائرہ بہت مختصر تھا (خواندگی چند مقررہ کتابوں تک محدود تھی)

اس دربار میں شاعری کی حیثیت بہت ادنیٰ تھی۔ اس کی حیثیت محض تفریح کا سامان بن سکتی تھی۔ چنانچہ غزل میں شاعر ہمیشہ بدنصیب اور نامراد عاشق ہوتا تھا۔ اور بوالہوس رقیب کامیاب! —— ہوس — دنیاداری۔ افادی کاروبار ایک طرف اور عشق، ادب، رومانی تحریکات دوسری جانب! —— ظاہر ہے کہ نواب کے دربار میں افادی قدریں زیادہ بلند مرتبہ تھیں اور ادب و فن محض تفریحی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر شاعر تفریحی دائرے سے باہر جانا چاہتا تو نامقبول ہوتا تھا۔

ہلکی پھلکی تفریحی غزل کی شاعری۔ درباری فضا میں کامیاب ہوئی۔ چبھتے ہوئے فقرے، اچھوتے ہوئے خیالات، پھبتی، طعن، ہجو —— یہ تھا درباری غزل کا سرمایہ۔

مگر جب یہ دور بدلا، جب رئیسی نظام ٹوٹنے لگا۔ تو غزل نے بھی پلٹا کھایا۔ —— خود رئیسوں اور نوابوں کو جان کے لالے پڑ گئے ساہوکار، تاجر، کارخانہ دار، متوسط طبقہ کے لوگ، صاحب امر ہوتے اور پرانے حاکم نواب دیوالیہ ہونے لگے۔ طاقت کا توازن بدلا اور اس میں کئی دربار الٹ گئے۔ نوابوں نے اپنے اخراجات کا بجٹ بنانا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے سب سے زیادہ غیر ضروری مدلعین شعراء اور صناع خارج ہوئے۔ درباروں کے ساتھ درباری شاعری بھی مٹنے لگی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ نئے فرمانروا بدیشی تھے۔ ان کی زبان۔ ان کا ادب۔ ان کی معاشرت بالکل مختلف تھی۔ اور جب انہوں نے سیاسی استقامت کے بعد یہاں کے ادب کی طرف توجہ کی تو شاعری کے پہلے دربار میں جو لاہور میں منعقد ہوا۔ "نظم" ظہور پذیر ہوئی۔ انگریزی شاعری کے مضامین اردو میں منظوم ہونے لگے۔

مگر غزل مٹی نہیں۔ کیونکہ اس کی روایات بہت گہری تھیں۔ اور اس کی بنیادیں فطرتِ انسانی میں پیوست تھیں۔

واضح رہے کہ غالب جو اس نئے دور میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ وہ درباری غزل سے طبعاً بغاوت کر چکا تھا۔ صاف صاف کہتا تھا۔ ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

ظرفِ تنگنائے غزل، غرض شاعر درباروں سے خارج ہو کر آزاد ہو گئے —— نوابوں سے دور ہو کر وہ عام فطرتِ انسانی اور جذبات کے نزدیک آ گئے۔

چنانچہ حسرت کا تصورِ عشق نوابی نہیں —— انسانی ہے! ——

اس طرح غزل کو ایک نئی زندگی حاصل ہو گئی —— مگر یہ زندگی ایک نہایت معین اور محدود دائرے میں محصور ہے۔ ہمارے موجودہ متغزلین میں فقط ملیل کا تعلق "دربار" سے ہے۔ اور یہ "دربار" بھی پرانی قسم کا دربار نہیں۔ اصلاح شدہ

دربار ہے لیکن ہے درباری۔ اور حالات کے بدلنے کے باوجود ذہنی روایات وہی پرانی ہیں۔ اس قسم کی غزل یقیناً ختم ہو رہی ہے۔ مدیر نگار کا یہ کہنا کہ "جلیل اس وقت اپنے رنگ کے تنہا کہنے والے ہیں" بالکل بجا ہے اور یہ قول کہ "جلیل کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ نہ کوئی مضمون آفرینی نہ فکر و خیال کی بلندی" میرے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ کامیاب درباری شاعری لازماً تفریحی ہوتی ہے ایسی کہ نہ دماغ پر آنچ آئے نہ دل میں پیچ و تاب پیدا ہو لفظوں محاوروں کا "الٹ پھیر" روانی بے تکلفی۔ واہ واہ کیا روزمرہ ہے کیا ناپاب تابیہ ہے۔ ردیف زندہ کر دی ہے! — یہ زبان یہ محاورے تو اظہارِ خیالات کے ذرائع ہیں مگر جب کوئی سماج زوال پذیر ہوتی ہے تو ذرائع مقصد بن جاتے ہیں اور جب کوئی آرٹ (شاعری یا ادب) زوال آمادہ ہو تو ذریعہ اظہار بذاتِ خود مقصدِ اظہار ہو جاتا ہے۔ جب "خیال و فکر کی بلندی" نہ ہو تو پھر الفاظ اور محاوروں کی "روانی" اور "بے تکلفی" ہی رہ جاتی ہے۔ اگر شاعر میں کچھ جوہر ہوا تو "فن برائے فن" ہو گیا۔ اور اگر محض مہارت ہوئی تو "فن برائے تن"! ———

حسرت نے اس پرانی درباری غزل سے آزاد ہو کر ایک نئے دور کی ابتدا کی۔ اس کا عشق خلوص و پیار کا آئینہ دار ہے عالمگیر ہونے کے باوجود ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ محض روحانی تعلقات کو بیان کرتا ہے اور محسوسات کو ہوسناکی سمجھتا ہے۔ اس کا مخاطب ایک انسان ہے۔ انسان کی لطیف ترین جنس "عورت"! وہی عورت جو دل، دماغ، بدن، روح، ہر قوتِ انسانی پر چھا جاتی ہے۔ اور اپنی نزاکت اور لیپی کے باوجود سطوت و جبروت کا مجسمہ ہوتی ہے۔ جن کے سامنے ہوس "ہوس" رہتے ہوئے عشق بن جاتی ہے۔ اور مجاز کا ایک پہلو حقیقت! ؎

دل ہی کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی — روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا — جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی
ہم رضا شیوہ ہیں تاویل ستم خود کر لیں — کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

یہ کوئی نادیدہ خیالی تصور نہیں۔ "ان" کا نام و نشان بھی ہے جستجو کا امکان بھی ہے!

حسرت نے عشقیہ شاعری میں محسوسات کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ جو اختر شیرانی جیسے شبابی باغی شاعروں کا مخصوص مضمون بن گیا ہے معشوق ایک معین "شخص" ہے جس کا حواسِ ظاہری سے تصور کیا جا سکتا ہے۔ ؎

؎ پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں — یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی
؎ محجوبی و رنگینی ہیں جز و بدن تیری — سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری
؎ محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی
؎ رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

اس پیکرِ رنگ و بو کے اثرات بھی حسی ہیں ؎ ایک لرزش خفی مرے سارے بدن میں تھی!

شدتِ خلوص، موضوعِ عشق کا تعین، جذبات کی انفرادیت ـــــ یہ ہیں اس نئی غزل کے اوصافِ خصوصی۔ منجملہ اور اوصاف کے اور جب تک انسان اپنی فطرت پر قائم ہے غزل کے یہ اوصاف شاعری سے الگ نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہر دور کے بنیادی حقائق مختلف ہوتے ہیں۔ اور انسانی ذہن کی توجہ پہلو بدلتی رہتی ہے۔ راگ تو اپنی اپنی جگہ سب اچھے ہیں، مگر بے وقت کی راگنی ناگوار گزرتی ہے۔ اگر ملک پر ایک خونخوار غنیم حملہ آور ہو تو اس وقت بانسری کا نغمہ اگر جاذبِ توجہ ہو گیا تو تمام قوم ہلاک ہو جائے گی۔ نہیں تو وہ بگل کی آواز میں فنا ہو جائے گا۔ اور قوم اپنی توجہ اپنی مدافعت کی طرف مبذول کر سکے گی۔!

اقبال حافظ کی شاعری کا منکر نہ تھا۔ وہ اس کی ساحری کا ایسا معتقد تھا کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں تمام قوم ان دلکش نغموں کے اثر سے مبہوت و بیکار نہ ہو جائے۔ اور ایسی حالت میں جب ملکی ضروریات، حقائقِ حاضرہ، اس بات کے مقتضی ہیں کہ ہر جوانمرد کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ بانکے سپاہی بنسری سنبھالے محوِ رقص ہو جائیں۔

اقبال حافظ کو بہترین غزل گو سمجھتا تھا۔ اور موجودہ دور کی غزل کی اقدار بفرقِ مراتب وہی حافظ کی سی ہیں۔ !ـــ

ہمارے "ترقی پسند مصنف" اس معاملے میں اقبال کے پیرو ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو بنیادی حقائق کی توضیح اور تعین میں ہے شاعری کا نظریہ مختلف نہیں!

آج جب دنیا ایک خونخوار جنگ کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہے۔ جب آزادی اور زندگی کے بنیادی اصول معرضِ خطر میں ہیں ـــ مشرق و مغرب ہر دو جانب سے ایک خون کا سیلاب ہماری طرف امڈتا چلا آ رہا ہے۔ جسمِ انسانی کے لتھڑے، جبڑے، پنڈلیاں، انتڑیوں میں الجھے ہوئے پھیپھڑے، عورتوں، بچوں، نوجوانوں، بوڑھوں کی لاشیں شکستہ کشتی کے تختوں کی طرح لہو کی لہروں میں ابھرتے ڈوبتے دکھائی دے رہے ہیں۔ کھوپڑیوں کے انبار، لاشوں کے مینار قدم قدم پر استوار ہو رہے ہیں۔ اس وقت اس قسم کے اشعار ؎

؎ عشق پر پھر چھا گئیں رعنائیاں ۔۔۔ اُف تری ٹوٹی ہوئی انگڑائیاں (آرزو)

؎ فصلِ بہار ذوقِ نظر عالمِ شباب ۔۔۔ اب کیا خبر رہا ہے کہ ایماں نہیں رہا (آسی)

؎ یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو ۔۔۔ تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ (احسان دانش)

؎ جب میں نے سنا ہے نام اُن کا ۔۔۔ دل پہ اک چوٹ سی لگی ہے (علی اختر)

؎ کون آیا مرے پہلو میں خواب آلودہ ۔۔۔ زلف برہم کئے با چشمِ حجاب آلودہ (اختر شیرانی)

؎ آپ کل گزرے ہیں جس راہگذر سے پہلے ۔۔۔ وہیں بیٹھا ہے کوئی جا کے سحر سے پہلے (حمید امیٹھوی)

؎ کیا آگ لگائے کوئی نالے کے اثر کو ۔۔۔ پہلو میں وہ بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے سر کو (مجبور)

؎ ملامت کرد ان کو ضد پر تمہاری ۔۔۔ نہیں بھی اگر چاہتا جاہتا ہوں (تاجور)

اعوض الف بے تے سے نک یہی حال ہے۔ ایسے اشعار ایسے سنگین دور میں کسی ہوشمند انسان کو بھلا کس طرح قابلِ توجہ معلوم
ہو سکتے ہیں! وہی تیرو والی بات ہوئی کہ کملائے تدم جل رہا ہے اور حضرت سارنگی بجا رہے ہیں!
میں نے جنگ کا نام اس لئے لیا ہے کہ دورِ حاضر کی یہ ایک بین حقیقت ہے۔ یوں ہندوستان میں صلح کا زمانہ بھی جنگ سے کم
ہولناک نہیں۔ اندھا کر دینے والا افلاس اور ہمت شکن سیاسی ادبار۔ یہ کیا کم مصیبتیں ہیں۔ مگر ہمارے شاعر ہیں کہ طبلہ بجائے
جاتے ہیں۔ ہم وطن سانس توڑ رہے ہیں مگر ان کے سُر تال کا حساب قائم ہے۔ شاید اس لئے کہ ان کی اکثریت رنگین روایات کی
حامل ہے۔
مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضروری نہیں کہ یہ حالات قائم رہیں۔ اچھے دن بھی تو آسکتے ہیں جب ان شعرا کا کلام کام آئے گا۔
اور یہ بھی کہ جری سپاہی ہر وقت بار ردی نہیں رہتے۔ سستاتے بھی ہیں اور سستانے کے وقت لوریاں سننا چاہتے ہیں۔ اور
پھر یہ بھی کہ جو کم بخت مصیبت سے تنگ آکر ہمت ہار دے آخر اُسے بھی کوئی جائے فرار درکار ہو گی۔!
میں اس وقت ان مختلف نظریات کا محاکمہ کرنا نہیں چاہتا۔ افادی، اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کی یہ الجھن ایک الگ سلسلہ مضامین کی
محتاج ہے۔
یہاں اجمالی طور پر اتنا کہنا کافی ہے کہ نظم گو شعرا کے لئے حقائقِ حیات کی تلاش شاید زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ ان کی ہر ایک نظم ایک
مستقل اور مسلسل نقطۂ نظر کی ترجمان ہوتی ہے مگر غزل گو تو چلتی پھرتی دنیا کا آدمی ہے۔ ہری چگ ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو بیک وقت مختلف
پہلوؤں سے دیکھتا ہے۔ اس کو جانچنے کا معیار یہ ہو گا کہ اُس کا عام جذباتی اور فکری رجحان کیا ہے۔ اور کیا یہ رجحان سطحی ہے یا ایک گہرے
خلوص کا نتیجہ ہے۔ ہم عام زندگی میں بھی تو یہی کرتے ہیں۔ دوستوں اور عام انسانوں کو بھی اسی طرح جانچتے ہیں۔
میں یہ نہیں کہتا کہ شاعری ہمیشہ ایک واضح تنقیدِ حیات ہوتی ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ نظم ہو یا غزل اس سے شاعر کا ایک واضح شعری
کردار نمایاں ہوتا ہے۔ نقاد کا کام اس شعری کردار کی پرکھ ہے اور یہ پرکھ زندگی کی بنیادی اقدار سے تعلق رکھتی ہے۔
قدیم ہماری غزل میں نہ انفرادیت تھی نہ خلوص۔ اس لئے اس کے نقاد محض وضع قطع کو دیکھنے کے عادی تھے۔ درباروں میں انسانوں
کی جانچ بھی کچھ اسی طرح ہوتی تھی۔ اور آج بھی سوسائٹی کے مہذب چلتے پُرزوں حلقوں میں انسان درزی کے سِلے ہوئے سوٹ کی کاٹ اور
جاء کی پیالی پیش کرنے یا اٹھانے کی روش سے قابلِ قبول یا مردود قرار دیا جاتا ہے۔ مگر جب انسان کے باہمی تعلقات فطرت کے بنیادی جذبات
پر ہونے کا رلانے جب معاشقہ نہیں عشق کیا جائے، کیا نہ جائے بلکہ ہو جائے، تو ہم معیاری اقدار بھی گہری ہو جاتی ہیں۔ "مہذب" لوگوں میں بھی۔
دلی سکول اور لکھنؤ سکول کا فرق بھی یہی ہے۔ اردو شاعری کی روایات اس وقت قائم ہوئیں جب دلی کا شاہی دربار بے طاقت
ہو چکا تھا۔ نوابوں نے جا بجا نقلی دربار قائم کر رکھے تھے۔ شاعری گنجفے اور نجوم کی طرح رئیسانہ کھیل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ ان

درباروں میں سب سے زیادہ ثروت لکھنؤ کی ہو اہی تھی۔ فرج سے لیکر مذہب تک سب اندھا دھند کی طرح مشغلے تھے۔ تھکے ہوئے مفلوج احساس کو برانگیختہ کرنے کے مختلف ذریعے۔ چونکہ دلّی دربار میں ابھی فارسی ہی کا دور تھا اس سے وہاں اردو شاعری ان مسموم اثرات سے کچھ کچھ بچی رہی اور پھر چونکہ ایک دن کی طوائف الملوکی نے تصوف کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس لئے شعر کی طبیعت میں کچھ کچھ تفکر اور عمیق خیالی کا عنصر پایا جاتا تھا اور کچھ کچھ انفرادیت کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ لکھنؤ کی طرح تصنع کی کسا بیت سی تھی (لکھنؤ میں واقعیت زیادہ تھی اور دلّی میں موہومیت) مگر خود میر تقی کو پورب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ اور دلّی اور لکھنؤ ایک ہو گئے۔ ناسخ لکھنؤ میں اور غالب استاد ضمیر دلّی میں ایک ہی بولی بولنے لگے۔ اردو غزل ہموار ہو کر رہ گئی (فارسی غزل نے بھی مطلق العنان سلاطین کے دربار میں پرورش پائی اور جس قدر وہ طرز حکومت منضبط تھی اسی قدر اس دور کی غزل بھی) تاریخی دلّی سکول کی غزل کو ایرانی روایت کی ذریت نے ایک حد تک سنبھالے رکھا، غالب میں رئیسانہ شان اور طبعی رحجان نے ایک معین انفرادیت کا انداز پیدا کر دیا تھا۔ مگر جب غدر نے رئیسی نظام کو پاش پاش کر دیا تو شعراء کو ایسا جھٹکا لگا کہ جس میں جو کچھ تھا بہت نمایاں ہو کر ظاہر ہونے لگا۔ رامپور اور حیدرآباد کے دربار نے نظام کو کچھ سہارا دیا۔ اور داغ کا تعشق اور امیر کا فن کچھ دیر فروغ پاتا رہا۔ مگر سماج پلٹا کھا چکی تھی۔ اور یہ کچے پشتے نئے طوفان کو روک نہ سکے۔

مگر پرانی سماجی روایات صدیوں تک اثر انداز رہتی ہیں۔ حالی وغیرہ نے نئے حقائق کا جائزہ لینا شروع کیا۔ مگر مسدس کے مرثیاتی انداز کے علاوہ وہ شاعری کو کچھ اور نہ دے سکے۔ ملک بہت تیزی سے بدل رہا تھا۔ اور ایک نیا نظام تعمیر ہو رہا تھا جہاں وہاں سیاسی تحریکوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ اور نئی امیدیں بندھ رہی تھیں۔ چنانچہ اقبال کا "شکوہ" "مسدس" حالی کے انداز میں ہے۔ وضع میں اور مرثیہ خوانی میں بھی۔ مگر "نیا شوالہ" اور "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" ایک تعمیری طرز خیال کے حامل ہیں

غزل بھی ان رجحانات سے اثر پذیر ہوئی عاجزانہ درباری لہجے کی جگہ صحت مند اور باتمکین فطری جذبات لینے لگے۔ شاعر دوبارہ انسان بن گیا۔ دلّی سکول اور غالب کی روایات کا احیا ہونے لگا۔ اور ان پرانی روایات کے ساتھ ساتھ ایک نئی قسم کی انفرادیت رونما ہونے لگی۔ اس روش کا عروج حسرت کے کلام میں نظر آتا ہے۔

مگر جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ انفرادی عشق اور خلوص کی شاعری حقائق وقت سے بہت دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اکثر نئے شاعر نظم گو ہیں مگر غزل کے ایک نئے دور کا آغاز اقبال کی بال جبریل سے ہوتا ہے۔ اقبال کے ایمان کی حدت نے بارد اور منجمد خیالات کو جذبات کی سی گرمی عطا کر دی۔ راسخ یقین نے فلسفہ کو شاعری کا رتبہ بخش دیا ہے ؎

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز ... اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں انگیز [1]

اس لئے یہ کہنا کہ غزل ہرگز نہ مرنے والی ہے کچھ ایسا معقول قیاس نہیں۔ لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے۔ کہ اقبال کی غزل یک قافیہ اور غیر مسلسل ہونے کے باوجود موضوعی یگانگت رکھتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نظمیہ غزل ہے۔ متفرق اشعار مختلف مضامین ایک واضح

[1] بال جبریل میں مسلسل ردیف کے بغیر مرثیہ بکثرت ہیں۔ یہ بھی بار انداز ی حال غور ہے۔ مدیر

نظام خیال کے ماتحت تنوع کے باوجود متناقض نہیں - ع

کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

نکاسکے متغزلین (استادوں" کے علاوہ کہ ان کا انداز وہی پرانا روایتی "فن برائے فن" کا ہے، حالی اور اقبال کے وزیانی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ دور تاریخی طور پر بہت انقلابی" ہے۔ اس "انقلابی" فضا کا ہی یہ اثر تھا کہ غزلیں کہنے والے نظمیں کہنے لگے۔ اور شعر محض درباری آرائش کا سامان، رئیسوں کی محفل کا دل بہلاوا نہ رہے۔ ذمہ دار لوگوں کی طرح زندگی کے بنیادی تجربات سے متاثر ہونے لگے۔ بسا اوقات اُن کی شاعری خطابت بن کر رہ جاتی ہے۔ مگر یہ اور بحث ہے۔ غزل گو اس طوفانِ حوادث سے گھبرا کر اور ۔۔۔ کی طرف سمٹ گئے گہری گہری خندقیں کھود کر محصور ہو گئے۔ معاملات اور نازک جزئیاتِ نفسی مدفنی مدمے ہیں جن کے ذریعے متغزلین سماجی حقائق سے جان بچا رہے ہیں۔ مگر اس دنیا میں ایسا طلسماتی خلا کس طرح بنایا جا سکتا ہے جس میں باہر کی ہوا نہ پہنچ سکے۔ خارجی اور داخلی دنیا کو سیسہ بند دیواروں سے الگ الگ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

ان متغزلین کے کلام کو دیکھیے۔ جو سب سے زیادہ قدامت پسند اور "استاد" ہیں۔ ان پر بھی اس انقلابی دور کا اثر موجود ہے جس طرح ان کی شاعری سطحی اور نفسی ہے اسی طرح یہ اثر بھی محض لفظوں تک محدود ہے۔ یہ لوگ اپنے وقت کے ضمیر سے نا آگاہ ہیں اس لئے ان کا کلام وقت کے اثرات سے آزاد ہے۔

اسی کو لیجیے۔ مانے ہوئے استاد ہیں۔ "میرے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک ہے" اور ان کی شاعری کا نچوڑ یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے مختلف مسلکوں اور مختلف اسکولوں کا اتباع کیا۔ ابتدا میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں ۔۔۔ حالی کے رنگ میں شعر کہے۔ ایک زمانے میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا۔ ایک زمانے میں یہ سودا ہوا کہ ہر شعر میں کوئی محاورہ نظم ہونا چاہیے۔ کلام غزل، نظم، قصیدہ ۔۔ تمام اصنافِ سخن میں بہت کافی ہے۔ غرض جاندار اور چھائے ہوئے ہیں

مگر دیکھیے اصل انقلاب تو نہیں مگر "انقلاب زندہ باد" کا یہ نعرہ اس طرح گلی گلی کوچہ کوچہ گونجا ہے کہ اس کہنہ مشق استاد کے اپنے تیار کردہ اشعار کے چند صفحوں میں بھی "انقلاب" کا لفظ بار بار آیا ہے ؎

جب چمن میں کچھ انقلاب ہوا — اک نہ اک آشیاں خراب ہوا

مجھے احساس کم تھا ورنہ زندگانی میں — مری ہر سانس کے ہمراہ مجھ میں انقلاب آیا

حیرت آباد دنیا میں الٹا آئے انقلاب — جو مرا دل تھا وہ اب آئینہ وار رہے

ہو چکا تھا روشناس آفاتِ انقلاب — میں نے ہر آغاز کو سمجھا کہ انجام ہو گیا

ٹھہر گیا اسی مرکز پہ انقلاب آ کے — شکستِ دل کی صدا بن کے رہ گیا ہوں میں

خدا جانے اس دل کہاں جا کے ٹھہرے ۔۔۔ بڑے انقلابات سے ہو رہے ہیں

آسی سے عمر اور استادی کی شہرت میں کہیں بڑھ کر میرزا ثاقب لکھنوی ہیں۔ پوری بہتر سال کی عمر میں، اسی لئے اُن کے اشعار میں نئے فیشن کے رواجی لفظ نسبتاً کم ہیں۔ یہ "انقلاب" شاید ان کے انتخاب میں بھی دو تین بار آگیا ہے! لفظی اثرات پر زیادہ بحث بیکار ہے اس دور کی اہم خصوصیت شعرا کی دروں بینی ہے جس کی بڑی وجہ تلخ حقائق سے چشم پوشی اور جس کا ایک نتیجہ احساسات و جذبات کا خورد بینی تجزیہ ہے، خود نگری کم اور خود بینی زیادہ! شاعر نظر اٹھا کر نہیں بلکہ نظر جھکا کر نبضِ حیات پر نہیں بلکہ اپنی نابض پر ٹکٹکی جمائے رکھتا ہے!

اس تجزیاتی انداز کا ایک منظہر "سا" اور "سے" کے الفاظ کا عام رواج ہے گویا شاعر بار بار ایک کیفیت کو جانچ رہا ہے۔ تول رہا ہے، اندازہ کرتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے بھر پرکھتا ہے اور مماثلت کو بھی مشابہت سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ جانتا ہے کہ ہر تجزیہ، ہر کیفیت اپنے محل پر یکتا ہے اس لئے تشبیہِ تام کا استعمال اگر ناروا نہیں تو بے محل ضرور ہے اور یہ بھی نہیں تو اُسے ناتسلی بخش کہنا بڑی حد تک جائز ہے۔ بہرصورت پوری طرح تسلی بخش نہیں۔ یہ اگر مگر، ڈگمگایا ہوا خیال، خود بینی اور بے یقینی، دورِ حاضر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ حالاتِ زندگی ہی کچھ اس طرح کے ہیں۔ ہندوستان میں پرانا زرعی نظام ٹوٹ رہا ہے، زراعتی زندگی ختم ہو رہی ہے اور صنعتی دور کا آغاز ہے۔ سڑک پر بیل گاڑی اور موٹر کا تصادم اور اوپر ہوائی جہاز غرا رہے ہیں اور خود یوروپ کی سطوت خونریز جنگوں میں مبتلا ہے، طرابلس کے جنگ کے بعد بلقان کی لڑائی اور پھر گزشتہ جنگِ عظیم۔ عالمگیر بدحالی کے بعد ابی سینیا کی تباہی، اسپین کی خانہ جنگی، چین جاپان کی مسلسل پیکار اور اس پر موجودہ ہولناک جنگ، خود اپنے ملک میں خلافت اور کانگریس کی معرکہ آرائیاں، ہندو مسلم اور برٹش سامراج کی گرفت، بے کاری اور ایک انقلابی اشتراکی نظام کی ابتدا۔ کوئی نظر جمائے تو کس حالت پر؟

اس ایک "سا" "سی" کے استعمال ہی سے اس ذہنی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے (ان الفاظ کا فیشن اس قدر ہے کہ آسی[1] "بڑے انقلابات" کے ساتھ بھی "سے" "کو برت رہے ہیں)

فانی، فراق اور ملا کو لیجئے۔ بی۔ اے۔ ایم اے۔ ایل ایل بی تک پڑھے ہیں ؎

نہ مشرقی ہیں نہ مغربی ہیں عجیب سانچے میں ڈھل رہے ہیں

فانی کی عمر ۶۳ سال کی ہے۔ مگر اس کی یاسیت اور متذبذب خیالی اس کی اپنی زندگی اور حالاتِ حاضرہ کے عین مطابق ہے[2]

در پیش ہے پھر مسئلہ طاقت و بدار

---

[1] انقلاب اور "سا" کے فیشن کا اجتماع آسی کے ہاں "خوب" ہوا ہے ؎ بڑے انقلابات سے آ رہے ہیں۔ اول تو ایک انقلاب نہیں انقلابات ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے انقلابات۔ اس پر بھی "سے" کی موہومیت قائم ہے۔ تاثیر

[2] یہ مضمون اگست میں لکھا گیا۔ جب فانی زندہ تھے۔

(پہلا مصرع غالب کے طرز میں ہے، اور دوسرا مصرع

پھر کچھ نگہ شوق سے گھبرائی ہوئی سی

داغ کے انداز میں ہے) داغ اور غالب کا یہ امتزاج ہمارے متغزلین کی عام روش ہے۔ دوسرا شعر ہے

اک عالم دل ہے یہی دنیا بھی فردوس　　　ہر شے نظر آتی ہے لجائی ہوئی سی

اور

دیکھوں رہے دونوں یہ ہنسی آئی ہوئی سی

داغ نے بھی ایک اسی قسم کی غزل لکھی ہے۔

آنکھوں میں کچھ ملال سا داغ کچھ انفعال سا

مگر اس نے حسن و عشق کے ظاہری احساسات پر اکتفا کیا ہے۔

فراق کی عمر ۴۰ سال کی ہے۔ چند مصرعے ہیں

ع　دل کی کلی ہوا نیاں مایوسی آ کے رہ گئیں

ع　تاروں کو بھی نیند آئی ہوئی سی

ع　اک انگڑائی آئی ہوئی سی

ع　حسن افسردہ سا تھا اور عشق کو حیرت سی تھی

ع　بجھی بجھی سی وہ نظر ملی ملی سی وہ نظر

ع　آسمانوں کو بھی جیسے آ رہی ہو نیند سی

احمد امین ملالی عمر ۴۴ سال ہے۔ مدتوں انگریزی شعر کہتے رہے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

دامن آئی آگ سے رنگ سی پانی کی بوند　　　تھا ہی کیا آنسو میں عرفِ التجا ہونے کے بعد

چند مصرعے ہیں۔

ع　آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار　ع　تھک رہا اک زباں پہ آنکھیں جھکی سی تھیں

گر بالکل لے رد بھی نہیں سکتے۔ قدم قدم پر رکاوٹ اور احتیاط ہے۔ داغ اور فانی کے یہاں یہ حالت معشوق کی ہے اور فانی عشق سے باہر ذکر اس کے نزدیک شاید عشق کا جذبہ ہی اک یقینی حقیقت ہو سکتا ہے۔ باقی سب کچھ واہمہ اور ذہنی ہے) جو شاہدات ہیں ان کو بے یقینی

لے خاص ردیف میں ساتھی ہیں۔ — ناصر

سے دیکھتا ہے۔ ذوقؔ نے معشوق سے گزر کر عاشق کو بھی شرم، احتیاط اور ضبط میں شریک کر لیا ہے اور ملاّؔ نے عاشق کو معشوق بنا دیا ہے یہاں تک کہ ؎

مجھے پتہ نہیں کچھ کہہ دے نظر بھری ابھی گلہ کہ پیام نظر زباں پہ نہیں

یعنی معشوق تقاضائے بے باکی کر رہا ہے اور عاشق ڈر رہا ہے! اور یہ کہ ع

وہ تو اٹھا چکا نقاب ہم ہی نظر اٹھا سکے

لیکن جہاں ملاّؔ اندرونی جذبات کے متعلق اس قدر منفعل ہے وہاں مسائلِ حیات کے متعلق کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کرتا ہے تلافی کے طور پر۔ فانی کے برعکس۔

اس وقت ملاّؔ کی نظمیں معرضِ بحث میں نہیں۔ ان میں یہ بغاوت زیادہ قوی ہے۔ مگر غزل بھی دیکھئے کس طرح ڈانٹ کر کہتے ہیں ؎

سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے

جواب دہی کے سیدھے طرح بازی (ملاّؔ کی بھی تو ہیں) نہ درج کر دی ہے! اقبال کا انداز ("یہ جہاں تیرا ہے یا میرا") بھی بظاہر کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ مگر وہاں بے باکی کا سبب عقیدت کا جوش ہے اور یہاں بے اطمینانی اور انکار کے جھکولے! ؎

تری ہستی کے منکر ہوئے جاتے ہیں جہاں والے سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے

؎ یا یہیں کہہ دے کہ راحت تری قسمت میں نہیں یا جو دینا ہے تو دے آج قیامت میں نہیں

یہاں بھی لہجہ وہی ہے اور کہا ہے، گو مضمون خیالی ہے، خدا سے گزر کر مذہب کے متعلق کہا ہے ؎

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

اس رومانی الحاد کے منشیکار جوش ملیح آبادی ہیں اور ان شراروں کو کالجوں کی بے تعلیمی ہوا دے رہی ہے! یقینی الحاد کے لئے مثبت تعلیم درکار ہے! اور یقینی ایمان کے لئے بھی!

آج کل لوگ عموماً اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ فرقہ داری کا احیا تو محض اقتصادی اور سیاسی حالات کی وجہ سے ہو رہا ہے ورنہ بقولِ اقبال۔ ع ہوس منزل لیلیٰ نہ تو داری و نہ من! ـــــ یہ ناپختگی اس زمانہ کی پیداوار ہے۔

فراقؔ اور ملاّؔ ابھی ناپختہ ہیں مگر (شاید اسی لئے) وہ پختہ کاروں سے زیادہ نئی پود کے صحیح ترجمان ہیں۔ ان میں ہضم و تحلیل کم ہے۔ رائج تاثرات کو زیادہ شخصی مدافعت کے بغیر اگل دیتے ہیں۔

نگار کے اس گلدستہ میں چار پختہ کار شاعر ایسے ہیں جنہیں معاصرین میں بوجوہ نمایاں امتیاز اور قبول عام و خاص حاصل ہے۔ حسرتؔ، جوشؔ، حفیظؔ اور جگرؔ! (میرے نزدیک اثرؔ کی مہذب غزل موجودہ دور میں ایک بالکل الگ حیثیت رکھتی ہے، مگر اسے قبول عام حاصل نہیں۔ ہر بھی نہیں

سکتا۔ اس کے جانچنے کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہوگا مگر جوش کی نظم اس کی غزل پر اس قدر حاوی ہوگئی ہے کہ اب اُسے غزل گویوں میں شمار کرنا مناسب نہ ہوگا۔ جوش کا شاعرانہ ارتقا ہمارے دور کے خیالات کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ اسکا جائزہ یہاں بے محل ہوگا۔

حفیظ کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کے گیت ہیں اور اسکی وہ نظمیں جس میں اُسنے فنی تجربات کچھ ایسی سادگی اور بے تکلفی سے کئے ہیں کہ ہمارے بہت ہی جدید شعرا بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک لکھتا ہے کہ حفیظ نے جو فنی تجربات بحر اور ہیئت کے لحاظ سے کئے۔ اُن کا اثر بڑا گہرا ہے صرف مختلف بحروں میں ہی نظم ہوا بلکہ آزاد نظم کی حد تک جا پہنچا۔ اُنکا "شاہنامۂ اسلام" اللہ رہا ہے۔ مگر اس کی غزل اب تک زندہ ہے اور اردو ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

حفیظ کی غزل میں سادگی اور خلوص تو ہے مگر انفرادیت کم ہے۔ وہ واضح اور شخصی تجربات کا اظہار ضرور کرتا ہے مگر اسکی واردات عام تجربات سے مختلف نہیں مگر اس کی بے ساختگی دلپذیر ہے اور یہی اس کا ترنم ہے۔

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے — تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے
ہوش میں آ چکے تھے ہم جوش میں آ چکے تھے ہم — بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے
رونق بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں — دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے
اہلِ زباں تو ہیں بہت کوئی نہیں ہے اہلِ دل — کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

مصرع "ہوش میں آ چکے تھے ہم جوش میں آ چکے تھے ہم" ۔ پے بہ پے ہم آہنگ الفاظ ہیں اور "لب پہ حکایتیں رہیں" "دل میں شکایتیں رہیں" ۔ دو لخت بھی ہیں اور پیوستہ بھی۔ مطلع کس قدر طرحدار ہے اور یہ زمیندارانہ خلوص سے لبریز! محض لفظی اُلٹ پھیر نہیں۔ مقطع میں اپنے متعلق وہی کہا ہے جو میں لکھنا چاہتا ہوں۔ ساری غزل میں ایک اردو تی کیفیت ہے اور ایک موضوع ہی سے خطاب! سہل ممتنع کلام ہے!

حسرت کی جذباتی طبیعت پر حقائقِ وقت نے ایسا گہرا اثر کیا کہ وہ شدتِ احساس کی وجہ سے خاموش ہو کر رہ گیا۔ اس کی غزل اسکے ان تاثرات کے اظہار کی کفیل نہ ہوئی اور نظم کے لئے اس میں مناسب تسلسل اور افکار کی یکجہتی نہ تھی۔ اُس کے غزلیہ خلوص کا خارجی ثبوت ہے کہ اس نے شدت سے ہی ہوئی واردات کو کھلے الفاظ میں دہرانے سے انکار کر دیا ہے۔

جگر عالم عزلگو ہے اور اسے اس پر ناز بھی ہے۔ جگر خود کہتا ہے کہ "حسن و عشق ہی میری زندگی ہے"۔ مولانا سلیمان ندوی "شعلۂ طور" کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں۔ وہ انہیں اُلٹ پھیر کر دہراتے رہتے ہیں اور یہ کہ جگر کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق ہے۔"

جگر کی شاعری میں انفرادی واردات و تجربات بہت کم ہیں۔ اس کا شاعرانہ معشوق نادیدہ ہے اور جہاں کہیں معمولی واردات میں ان میں داغ کا سا عامیانہ پن ہے اور وہ جذبہ بس اُدہ ہے۔ داغ "آپکا غلام نہیں" میں "عشق کو ذلیل و رسوا صورت میں پیش کرنے سے انحراف ہے۔ وہ جگر میں بھی ہے۔ مگر جگر نے داغ کی طرح حسن کو رسوا نہیں کیا۔ حسن و عشق کے تعلقات کو فطری سطح پر رکھا ہے لیکن جگر کا عشق عموماً عشقبازی ہو کر رہ جاتا ہے۔

اُف یہ تیغ آزمائیاں توبہ — تیری نازک کلائیاں توبہ

ملہ میرین جی "ادبی دنیا" میں دیا تبر

اسیوں کا وہ چڑھا سینا — گوری گوری کلائیاں توبہ
نظروں نظروں میں سرگزشتِ فراق — دوروں جواب دہائیاں توبہ
یہ بھی چشمِ مست جام بدست — پھر وہی نغمہ رائیاں توبہ

بقولِ جگر یہ غزل اُن کی زندگی کے معاشقہ کے ایک اہم واقعہ سے متعلق ہے۔ مگر اس واردات میں وہ داغ سے آگے نہ بڑھ سکے "آہ توبہ" اس قسم کے الفاظ سے شخصی احساس کی شدت ظاہر ہوتی ہو تو ہو، شاعرانہ احساس کا خلوص ثابت نہیں ہوتا۔ اور محض شدتِ احساس کسی ذاتی یا شاعرانہ تجربہ کو عمیق نہیں بنا سکتی۔ لیکن اس قسم کے اشعار بھی اس کے ہاں بہت کم ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کے واردات کی سطحیت عموماً نظر انداز کی جاتی ہے اور اس کے نامردہ عشق ہی کو دید ہی قرار دیا جاتا ہے اور نیک پاک لوگ داغ کو بازاری مگر جگر کو روحانیت کا متلاشی گردانتے ہیں۔ تو پھر جگر کی غزل کی اس قدر دھوم کیوں ہے ——— اس کی بڑی وجہ جگر کی مستی ہے۔ ذاتی مستی اور شاعرانہ مستی! جگر کہتا ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے اور جگر کی زندگی جہاں رند مشرب لوگوں کے لئے لذت کا ذریعہ ہے وہاں آرزو کشتہ محروموں کو تسکینِ لذت کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ نوجوان اسے "بغاوت" سمجھتے ہیں اور بے مزہ زندگی گذارنے والے اسے رومانی تصور کرتے ہیں۔ اس طرح جگر ایک جیتا جاگتا افسانہ بن کر رہ گیا ہے اور ناکردہ کار لوگ اس کی رندانہ زندگی میں مخصوص طریقہ سے شریک ہو کر بن پئے جھومتے ہیں اور اس کے پرستار اس کی موجودہ خشک زندگی کو "شاعرانہ توبہ" کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں۔ اس کی شاعرانہ مستی کی بنیادی وجہ بھی وہی عاشقانہ تجربات کی کمی ہے۔ اسے حسن کی تلاش ہے۔ اور وہ اپنی محرومی سے کبھی کبھی کراہتا بھی ہے "آپ میرے کلام میں . . بہت ہی نازک سی موجِ درد ضرور محسوس کریں گے" مگر یہی محرومی اسے "خوگرِ ملال" نہیں ہونے دیتی اور اس کی مستی کو افسردگی سے بچا لیتی ہے۔ اس طرح اس کے کلام میں ایک قسم کی تندی پائی جاتی ہے اور ایک قسم کی منفی طہارت بھی۔ یہ مستی کامرانی یا کامرانی کی امید کی مستی نہیں۔ نشاط انگیز مستی نہیں اندوہ ربا نشہ ہے۔

جگر کے معرکہ کے اشعار عموماً عشق کے متعلق ہوتے ہیں وہ دوسرے عشقیہ واردات کا تجزیہ کرتا رہتا ہے اس نے ایک طرح کا فلسفۂ عشق وضع کر لیا ہے۔ جو مضمحل مزاجوں کے لئے فلسفۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے حقائق کے متعلق کسی قسم کی تلخ تبدیلی کئے بغیر خوش اوقات لوگ ذاتی جذبات کی آغوش میں پرورش پاتے رہتے ہیں اور اپنی پرانی اقدار پر نہ فقط قانع رہتے ہیں۔ بلکہ اُن شخصی عشقیہ اقدار کو نئی اقدار سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس نے حقائقِ حیات کی مختلف اقدار کو جانچنے کے بجائے حقائق ہی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ حقائق غیر حقیقی ہیں اصل حقائق تو محض شخصی جذبات کی اچھل کود ہے۔ اور یہ اچھل کود اصل حیات ہے!

زیست ہے زیست جو رگ رگ میں رواں ہے مئے عشق — موت ہے موت اگر رقص نہیں جوش نہیں

ساری غزل دیکھئے۔ حسن و عشق کے متعلق کلیئے مرتب کئے گئے ہیں۔ دونوں کو آمنے سامنے نہیں کیا۔ کوئی تجربہ

بیان نہیں کیا

تو سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے تُس — کوئی سنے ہے جو آغوش در آغوش نہیں
عشق اگر حسن کے جلووں کا ہے مرہونِ کرم — حسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

لیکن بنا اندازہ کیا ہے ہوش کو بے ہوشی قرار دیا ہے۔

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انہیں ہوش نہیں — میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں
کونسا جلوہ یہاں آتے ہی بیہوش نہیں — دل مرا دل ہے کوئی ساغرِ سرجوش نہیں
پینے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں — میری آغوش کو بے حسرتِ آغوش نہیں

ان تجربات کے بجائے ان کی یادیں ہیں سے

کبھی ان مدبھری آنکھوں سے پیا تھا اک جام — آج تک ہوش نہیں ہوش نہیں ہوش نہیں
مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش — پھر بھی اک چیز ہے ایسی جو فراموش نہیں
مل کے اک بار گیا ہے کوئی جس دن سے مگر — مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

بے خودی اس کی تلاش سے

پاؤں اُٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف — اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

[illegible] غزلوں کی غزلیں اسی طرح کی ہیں۔ واردات کم تاثرات اور اسنادات زیادہ ہیں۔ چونکہ یہ اسناد جذبات کے متعلق ہے اس لئے ان میں بجز خیالی کی برودت پیدا ہو گئی ہے۔ مٹھی میں لیجئے تو یہ سمندر کی جھاگ ہے اور جو نظارہ باری پر اکتفا کیجئے تو ایک طلسماتی عیارہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔

ع نشہ ہائے شراب رنگ، ساز ہا مست طرب! ——

جگر کا قابلِ توجہ کلام وہ چند غزلیں ہیں۔ جو اُس کے دیوان کی اشاعت کے بعد مختلف رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ اور یہ برعکس غزلیں اردو غزل میں ایک واضح حیثیت رکھتی ہیں۔ شعلۂ طور بڑی حد تک مایوس کن ہے اور اس میں بھرتی کی کثرت ہے +
تاثر

محبّ الحسن

سرمایہ داری اس کا عروج اور زوال

سرمایہ داری کی سب سے پہلے داغ بیل انگلستان میں پڑی اور وہیں اس کی نشو و نما ہوئی کیونکہ انگلستان کا سیاسی، معاشی اور مذہبی ماحول اس کی ترقی کے لئے بہت موزوں تھا۔ دنیا کے کسی اور ملک میں اس وقت یہ حالات موجود نہ تھے۔ مشرقی ممالک کو خارجی حملوں اور جاگیری جنگوں کی وجہ سے کبھی ایسا امن و امان نصیب نہ ہو سکا کہ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کا سلسلہ برابر قائم رہتا۔ غیر مہذب اقوام مثلاً ساکا، ہن اور منگول کے حملوں نے نہ صرف تجارتی راستوں کو ایک عرصہ کیلئے غیر محفوظ کر کے تجارت کو اور نتیجۃً صنعت و حرفت کو غیر معمولی نقصان پہنچایا، بلکہ سماجی نظام کی بنیادوں کو بھی درہم برہم کر دیا۔ ان وجوہات سے صنعتی ترقی کبھی اس حد تک نہ ہو سکی کہ ایک نئے سماجی نظام کی تشکیل ہو سکے۔

اگر ہم یورپ کی طرف توجہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ پندرھویں صدی میں اہل پرتگال اور اہل ہسپانیہ سب سے زیادہ منظم اور مہم پسند لوگ تھے۔ یہ اس کشمکش اور جد و جہد کا نتیجہ تھا جو ان کو آزادی حاصل کرنے کے لئے موروں (MOORS) کے خلاف کرنا پڑی۔ اور جب آزادی نصیب ہو گئی تو کامیابی کے نشہ میں مخمور ہو کر انہوں نے بڑی بڑی مہمیں سر کیں۔ کولمبس نے نئی دنیا تلاش کی اور واسکوڈے گاما نے ہندوستان جانے کا بحری راستہ معلوم کیا۔ اہل پرتگال نے فن جہاز رانی و جہاز سازی میں اتنی ترقی کی کہ وہ مشرق کی تمام بحری تجارت پر جو کہ اہل عرب، وینس و جنیوا (VENETINS And GENOFSE) کے ہاتھوں میں تھی قابض ہو بیٹھے۔ اہل ہسپانیہ کے حصہ میں نئی دنیا اور اس کی سونے کی کانیں آئیں۔ چنانچہ سولھویں صدی میں یہ دونوں قومیں دنیا کے ایک بڑے حصہ پر چھائی ہوئی تھیں۔

لیکن سترھویں صدی سے ان کا زوال آنا شروع ہو گیا۔ اول تو ہالینڈ اور انگلستان نے اشتراک کر کے ان کی طاقت کو بالکل توڑ دیا۔ اس کے علاوہ جاگیری نظام اور رومن کلیسائی اثرات نے ہسپانیہ اور پرتگال پر ایسی جمود کی کیفیت طاری کر دی کہ وہاں کوئی ایسا طبقہ نہ پیدا ہو سکا جو نئی زمینوں اور نئے اصولوں کا علمبردار ہوتا۔ ہسپانیہ قرون وسطیٰ کے نظام کی زنجیروں میں ابھی تک جکڑا ہوا ہے۔

سترھویں صدی سے ہالینڈ کا عروج شروع ہوا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد برطانیہ نے اس سے تجارتی رقابت اور جنگ پر کمر باندھ لی۔ جس کا نتیجہ اس کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ وہ ایک چھوٹا سا ملک تھا اور برطانیہ سے مقابلہ کرنا اس کے امکان سے باہر تھا۔ چنانچہ اس صدی کے آخر سے اس کا زوال شروع ہوا اور برطانیہ اس کا قائم مقام بنا۔ فرانس نے بھی سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں بہت ہاتھ پیر پھیلائے۔ تجارت کے لئے کمپنیاں بنائیں۔ نئی دنیا میں نوآبادیاں قائم کیں اور ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے انگلستان سے بڑی

نہیں معرکہ آرائیاں کیں۔ لیکن فرانس کو بھی اس تجارتی دوڑ میں شکست ہوئی۔ وہ بھی ہسپانیہ کی طرح جاگیری نظام اور مذہبی تعصب کا شکار ہو کے رہ گیا۔

ان ممالک کے برعکس انگلستان کے سماجی ارتقا نے ایسا رنگ اختیار کیا کہ صنعتی انقلاب وہیں ہوا اور موجودہ سرمایہ داری نظام کی بنیاد بھی وہیں پڑی۔ انگلستان میں بارھویں اور تیرھویں صدیوں ہی سے ایک ایسا درمیانی طبقہ پیدا ہونے لگا تھا جس نے اون کی تجارت کی وجہ سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی شروع کر دی۔ سولھویں صدی میں اس طبقہ نے اتنی اہمیت اختیار کر لی کہ ٹیوڈر حکمرانوں کو باغی امرا کی سرکوبی کے لیے اس سے تعاون کرنا پڑا۔ ٹیوڈر خاندان نے اس مدد کے بدلے تجارت کو فروغ دینے میں ہر طرح سہولتیں بہم پہنچائیں۔ تجارتی کمپنیوں کی سرپرستی کی۔ نوآبادیاں قائم کیں۔ انگلستان کی بحری طاقت کی بنیاد ڈالی اور ہسپانیہ سے لڑائی مول لی۔ ان وجوہات سے تجارتی پیشہ لوگ اس قدر قوی ہو گئے کہ جب اسٹوارٹ خاندان کا دور دورہ ہوا اور انہوں نے تجارت پر پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں تو ان لوگوں نے مقابلہ پر کمر باندھی۔ اس کا نتیجہ ۱۶۴۲ء ۔ ۱۶۴۹ء کی خانہ جنگی تھی۔ اس جنگ میں شاہی استبدادیت اور جاگیرداری کو شکست ہوئی، اور ۱۶۶۰ء کے بعد عنانِ حکومت تجارت پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کی وجہ سے تجارت میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور ایسے قوانین و ضوابط بن گئے جن سے اس میں اور فروغ ہوا۔ ٹیوڈر حکمرانوں کی وسیع الخیالی، بیدار مغزی اور تدبر کی وجہ سے انگریز فرانسیسیوں اور جرمنوں کے مقابلہ میں بہت پہلے ہی سے ایک متحد قوم بن چکے تھے۔ وہ بڑی حد تک اور ملکوں کی مذہبی جنگوں کے خطرناک نتائج سے محفوظ رہے۔ اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنی قومیت کی تشکیل مذہبی یکسانیت اور مذہبی رواداری پر استوار کر لی۔ ملک کی داخلی تجارت محاصل سے آزاد تھی اور خارجی تجارت کے لیے بحرِ اٹلانٹک میں واقع ہونا تائیدِ قدرت کے مترادف تھا۔ ان سب حالات سے فائدہ اٹھا کر تجارتی طبقہ نے اپنی دولت خوب بڑھا لی۔ کارخانے قائم ہونے لگے تاکہ دوسرے ملکوں کو (خاص کر امریکہ کی انگریزی نوآبادی کو جسے اشیا کی بہت ضرورت تھی) مصنوعات بھیجے جائیں۔ لیکن چونکہ ان کارخانوں میں ہاتھ سے کام ہوتا تھا۔ اس لیے نہ صرف انگریزی نوآبادیوں کو ان کی ضروریات کا سامان پہنچانا مشکل تھا۔ بلکہ ذرائع آمدنی بھی محدود تھے۔ اس وقت یہ ضروری تھا کہ دولت آفرینی کا کوئی دوسرا طریقہ وجود میں آئے۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے آخر سے ایجادات اور اختراعات ہونی شروع ہوئیں اور ہاتھ کے بجائے مشین سے چیزیں بننے لگیں۔ یہی وہ حیرت انگیز تغیر ہے جسے صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا کہ انگلستان نے اپنے سماجی، سیاسی اور خاص کر اقتصادی ارتقا کی بدولت اس حد تک ترقی کر لی تھی کہ وہ انسانی تہذیب کے پچھلے ذہنی اور سائنسی کارناموں سے مستفید ہو کر ایک بالکل نیا قدم اٹھائے اور دنیا میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا کر دے۔ یہاں پر میں صنعتی انقلاب کے صرف اقتصادی اور سماجی پہلو پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔

اس کا جو سب سے اہم نتیجہ ہوا وہ یہ تھا کہ اس کی وجہ سے ایک نئے سماجی نظام کی جس کو ہم سرمایہ داری کہتے ہیں تشکیل شروع ہو گئی۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اٹھارھویں صدی کے قبل سرمایہ داروں کا بالکل وجود نہ تھا۔ سرمایہ دار تھے۔ لیکن ان کی دولت محدود تھی۔ کیونکہ ذرائع

پیداوار سادہ اور محدود تھی یا نہ تھے اور تجارت ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں کی وجہ سے بہت کم تھی۔ حکومت اور رعایا دونوں کا ذریعہ
آمدنی زراعت رہی تھی اور منعم اور رعایا سب باہم پیوستہ تھے۔ اس زمانے کے تمام سماجی نظام کی بنیاد یہی تھی لیکن صنعتی انقلاب سے ایک
عظیم الشان تبدیلی واقع ہونے لگی۔ سرمایہ پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد ہو گئے۔ نئی ایجادات اور اختراعات کی وجہ سے تجارت اور صنعت و
حرفت لوگوں کی زندگی پر حاوی ہو گئی۔ اور بجائے اس کے کہ لوگ کاشتکاری کو اپنا ذریعہ معاش بنائے رکھتے اب اکثریت نے فیکٹریوں کی
ملازمت کر کے اپنا سب مال اسی طرح کر دیا۔ رعایا اور منعم کے دیرینہ تعلقات منقطع ہو گئے اور اس کے بجائے مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان
نئے رشتوں کی بنیاد پڑ گئی۔

کسانوں نے خود زمینوں کا تحفظ نہ کیا۔ معاشی ترقی کی بدولت انہیں گزارہ کرنا پڑا۔ پندرھویں ہی صدی سے انگلستان میں بڑے بڑے
زمینداروں نے اپنی زمینوں کو کاشتکاروں کے قبضے سے نکال کر احاطہ بندی شروع کر دی تھی۔ ان کھیتوں میں وہ بھیڑیں پالتے تھے کیونکہ اون
کی تجارت زراعت کے مقابلہ میں زیادہ منفعت بخش تھی لیکن اس احاطہ بندی سے جس کو کہ پارلیمنٹ نے بھی قانوناً جائز قرار دیدیا ہزاروں
کسان بے روزگار ہو گئے اور شہروں میں روزی کی تلاش میں پھرنے لگے۔ صنعتی انقلاب سے ان کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا کیونکہ بڑے زمینداروں
نے زراعت مشینوں کے ذریعے سے شروع کر دی۔ جس سے احاطہ بندی کی تحریک اور بھی زیادہ تیز ہو گئی۔ اس وجہ سے بیچارے کاشتکاروں کو
بے روزگار ہو کر اور دیہات کی آزاد اور صحت بخش زندگی کو خیرباد کہہ کر ملوں میں غلامی کرنے کے لیے شہروں میں آنا پڑا۔

اس زمانے میں کوئی فیکٹری کے قانون تھے اور نہ مزدور اتنے ہوشیار اور منظم تھے کہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ کر سکتے۔ سرمایہ داران سے
جانوروں کا سا برتاؤ کرتے۔ کام بہت لیتے لیکن اجرت اتنی بھی نہ دیتے کہ وہ اپنا پیٹ پال سکیں۔ پانچ چھ برس کے بچوں اور حاملہ عورتوں
سے بھی سخت سے سخت کام لیے جاتے۔ اندازہ کیجیے کہ ان کی محنت و مشقت کے کام لیے جاتے کہ ان کا حال فیکٹریوں کے زنگ لگے پرزے
ہو جاتے ہیں۔ مزدوروں سے چودہ چودہ اور سولہ سولہ گھنٹے کام لیا جاتا اور ان کو رہائش کیلئے مرغیوں کے ڈربے ایسے مکانوں میں جگہ دی جاتی
ایک چھوٹے اور گندے کمرے میں پورے پورے خاندانوں کو زندگی بسر کرنا پڑتی۔ اکثر چھوٹے بچے اپنے گندے بستروں سے دو تین یا چار بجے صبح
کو اٹھائے جاتے اور رات کے دس گیارہ بجے تک ان سے بہت ہی معمولی اجرت پر کام لیا جاتا۔ کارل مارکس ایک بیس سالہ لڑکی کے دردناک قصے
کو جس کا نام میری این واکلے تھا اس طرح سے درج کرتا ہے۔ میری ایک بڑے اور معزز عورتوں کے کپڑے سینے کے فرم میں ملازم تھی۔ اس کو
روزانہ ساڑھے سولہ گھنٹے اور بعض اوقات بیس گھنٹے متواتر کام کرنا پڑتا۔ اس کے بدن اور گھٹتی ہوئی طاقت میں تھوہ اور شراب سے جان ڈالی
جاتی۔ آخرکار ایک مرتبہ ایک شاہی رقص کے سلسلہ میں اس کو اعلیٰ طبقے کی خواتین کا لباس بنانے میں ساڑھے چھبیس گھنٹے کی مسلسل محنت
کرنا پڑی۔ اس کے بعد اس کو ایسے کمرے میں سونے کو جگہ ملی جس میں تقریباً تین اور لڑکیاں تھیں۔ اس میں نہ ہوا کا گذر تھا اور نہ کوئی آرام کا سامان
تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری دو دن بیمار رہ کر مر گئی۔ اس واقعہ کو استثنائی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ نمونہ ہے ان لاکھوں مزدوروں کی زندگی کا جن کو افلاس

اور غم کے سوا کبھی آرام و آسائش میسر نہ آتی تھی۔ ان سب باتوں پر مستزاد ایک اور ہیبت ناک مصیبت اُن کے سر پر منڈلایا کرتی تھی۔ یہ بیروزگاری کا خوف و خدشہ تھا۔

مغربی یورپ کی صنعتی ترقی سے کساد بازاری کا آنا لازم ہوگیا۔ چونکہ نئی ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ برابر جاری رہا اس لئے دولت کی پیدائشی قوتیں بھی ترقی کرتی گئیں۔ سرمایہ میں اضافہ ہوتا گیا اور نئے نئے ذرائع پیدائش بھی قائم ہوتے گئے۔ لیکن اشیا اپنی کھپت سے کہیں زیادہ پیدا ہونے لگیں۔ چنانچہ اس کی وجہ سے قیمتیں کم ہو جاتیں اور چونکہ فائدہ کی گنجائش کم ہوتی اس لئے سرمایہ دار اپنی فیکٹریوں کو بند کر دیتے اور ہزاروں مزدور بیروزگار ہو جاتے۔ اکثر قیمتوں کو بڑھانے کے لئے سرمایہ دار ہزاروں ٹن سامان تو جلا دیتے یا اس کو سمندر میں پھینک دیتے۔ لیکن ہر حالت میں عوام ہی کو مصیبت اور تنگدستی کا شکار ہونا پڑتا۔

ان دشواریوں کا حل یوں ہو سکتا تھا کہ اول تو پیدائش ایک خاکے اور نظام کے ماتحت کی جاتی اور یہ مدنظر رہتا کہ اس میں اور عوام کی ضروریات میں ایک توازن قائم رہے لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ سرمایہ داری نظام میں پیدائش کسی خاکے اور تخمینے سے نہیں بلکہ اندھا دھند طریقے سے کی جاتی ہے۔ سرمایہ دار لوگوں کی ضروریات مدنظر نہیں رکھتے بلکہ ان کو اپنے ذاتی فائدہ کا خیال رہتا ہے۔ دوسرا حل یہ تھا کہ مزدوروں کو اتنی کافی اجرت دی جاتی کہ وہ اپنی تمام ضروریات زندگی کا سامان خرید سکتے۔ اس طرح مال کی کثرت اور خریداروں کی کمی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ کساد بازاری کا وجود بھی غائب ہو جاتا۔ لیکن اس اسکیم پر سرمایہ دار کب عامل ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ یہ ان کے اصولوں کے منافی ہے۔ وہ پیداوار کی لاگت کو کسی طرح بھی بڑھانا نہیں چاہتے۔ اس کے اختیار کرنے کے معنی تھے کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے پیروں کلہاڑی ماریں۔

چنانچہ سرمایہ داروں نے اپنی مشکلات کا حل یوں کیا کہ وہ دوسرے ملکوں کی طرف متوجہ ہونے لگے تاکہ ان پر سیاسی اثر یا حکومت قائم کر کے ان کو اپنے مال کی منڈیاں بنائیں۔ انگلستان نے ہندوستان کی اندرونی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسی غرض سے اس پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور رفتہ رفتہ اس کی صنعت و حرفت کو ختم کر کے اس کو اپنی مصنوعہ اشیاء کیلئے منڈی بنا لیا۔ یہی حال ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ممالک کا بھی ہوا یعنی یہ کہ وہ برطانیہ کو کچا مال بھیجنے لگے اور اس کے بدلے میں ان کو انگلستان کی بنی ہوئی چیزیں ملنے لگیں۔ انیسویں صدی کے پہلے پچاس برس تک برطانیہ کی تجارت کا سکہ تمام دنیا پر جما رہا اور وہ تقریباً ہر جگہ اپنا مال بھیجتا رہا۔ لیکن یہ سلسلہ ہمیشہ تو قائم نہیں رہ سکتا۔ فرانس نے جو کہ شاہی استبدادیت، جاگیری نظام اور مذہبی تعصب کی وجہ سے ابھی تک پیچھے تھا **۱۷۸۹ء** کے انقلاب کے ذریعے سے ان چیزوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور صنعتی ترقی شروع کر دی۔ جرمنی نے بھی انیسویں صدی کے وسط سے جبکہ وہاں قومی اتحاد قائم ہوگیا صنعت و تجارت کے میدان میں قدم رکھا۔ اس کے بعد اٹلی کی باری آئی۔ اسلئے کہ اسکو قومی آزادی بعد میں نصیب ہوئی اور وہ ۱۸۷۰ء میں اس قابل ہوا کہ مرکزی حکومت قائم کر سکے۔ چونکہ برطانیہ اور فرانس میں اور ملکوں کے مقابلہ میں سماجی اور سیاسی حالات پہلے موافق ہو گئے تھے انیسویں صدی کے آخری بیس سال میں اس براعظم کی بھی باری آئی اور برطانیہ، فرانس، بلجیم اور جرمنی نے یہاں بڑی بڑی نو آبادیاں حاصل کیں اور تقریباً اس کے ۹/۱۰ حصے پر قابض ہو گئے لیکن باوجود اس کے سرمایہ دار ملکوں کو سیری

حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی حالت عمر عیار کی زنبیل کی سی تھی جس میں کچھ نہ کچھ مادہ ختم ہو جاتا۔ چونکہ سرمایہ بڑھتا رہا نئی ایجادات ہوتی رہیں اور پیدائش کی قوتوں میں اضافہ ہوتا گیا اس لئے جو نوآبادیاں اور مقبوضات ان کے پاس تھے وہ ان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو گئے اور پرانی تقسیم تسلی بخش ثابت نہ ہو سکی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز سے مغربی یورپ کے ممالک میں ایک دوسرے کے دائرۂ اثر کو اس سے چھیننے کی جدوجہد شروع ہوئی جرمنی نے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے صنعتی میدان میں انگلستان اور فرانس کے بعد قدم رکھا اور اسلئے اسکے ہاتھ بہت کم نوآبادیاں لگیں لیکن اس نے اتنی تیزی سے ترقی شروع کر دی کہ اسکو نوآبادیوں کی کمی بہت جلد محسوس ہونے لگی۔ جرمنی کو ایسے خطے کی ضرورت تھی جہاں سے اسکو اپنی فیکٹریوں کیلئے مال دستیاب ہو اور جہاں وہ اپنی مصنوعات بھیج سکے چنانچہ جرمنی انگلستان اور فرانس کو تباہ کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ فرانس اور انگلستان بھی جرمنی کی صنعتی ترقیوں اور تیزی اور بحری قوت کو دیکھ کر حسد کرنے لگے اور اس کی تباہی کے درپے ہو گئے۔ ان ممالک کے مفاد کے تصادم کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کی جنگ تھی

لیکن اس جنگ سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس لئے کہ اب سرمایہ داری کا آخری دور آ پہنچا تھا۔ اس صدی کے شروع ہی سے اجارہ داری کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور آ یہ شدید ہو گئی۔ سرمایہ داروں نے اسکو بین الاقوامی تجارتی منڈیوں میں کامیابی کا اور منڈیوں پر قبضہ کرنے کا بہت اچھا ذریعہ تصور کر لیا۔ کیونکہ یکجہتی کے ساتھ اور ایک ہی مقام پر مال سستا بنایا جا سکتا ہے اور سستا بیچا بھی جا سکتا ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ وہ الگ الگ بنایا جائے۔ اس کے علاوہ بڑی کمپنیاں کساد بازاری کا مقابلہ بھی آسانی سے کر سکتی ہیں۔ لیکن اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ ان چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کے جو کساد بازاری سے خود ختم ہو گئیں باقی کو یا تو بڑی کمپنیوں نے مجبور کر کے اپنے میں شامل کر لیا یا ان کو مقابلہ کے ذریعے تباہ کر دیا اس طرح سے کارٹل (CARTAL) ٹرسٹ (TRUST) اور کمبائن (CAMBINE) کے قائم ہونے کا سلسلہ برابر تیز ہوتا گیا۔ لیکن اس سے کساد بازاری کا آنا بند نہ ہو سکا بلکہ پہلے انیسویں صدی میں تو یہ ایک میعادی بیماری تھی۔ مگر اب یہ ایک مستقل مرض بن گئی۔ اور وہ تمام تضادات جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اب نمایاں طریقے سے ابھار دکھلانے لگے۔ تجارتی رقابتوں، اقتصادی محاصل اور نوآبادیوں کی کی از سرِ نو تقسیم کی جدوجہد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور سرمایہ دار ملک پھر دوبارہ جنگ کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔ اس نظام کے فطری نقائص تھے جو اس کو تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف دھکیل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور عنصر تھا جو اسکی فنا کا خواہشمند تھا۔ مزدور طبقے جو محسوس کرنے لگے کہ سرمایہ داروں کی تباہی اور بربادی میں ان کی نجات اور بہبودی کا راز پنہاں ہے۔ ان میں اتنا سیاسی شعور اور اتنی بیداری پیدا ہو گئی تھی ۔

کہ وہ سمجھنے لگے کہ سماج کا معاشی نظام بہت ناقص ہے اور اس کا نقص صرف تباہی۔ جنگ۔ بیروزگاری اور افلاس کا پیدا کرنا ہے۔ اس سے تنگ آ کر انہوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ سرمایہ داری کو ختم کر دیں اور اس کے بجائے ایسا نظام قائم کریں جس میں ذرائع پیداوار (یعنی فیکٹریاں۔ زمین۔ کانیں وغیرہ) افراد کی نہیں بلکہ تمام قوم کی ملکیت ہوں۔ پیدائش کی بنیاد ذاتی منفعت پر نہیں بلکہ ضرورت عامہ پر ہو۔

سرمایہ داروں کے سامنے ان حالات میں تین صورتیں تھیں اول تو کچھ دے دلا کر مزدوروں کی تالیف قلوب کر لیتے اور اس طرح سے ان کو باغیانہ ارادہ سے باز رکھتے۔ انیسویں صدی میں سرمایہ دار اس اصول پر ایک حد تک عامل رہے اور اپنی نوآبادیوں کی لوٹ کے مختلف دسترخوان سے چند سوکھے ٹکڑے مزدوروں کو بھیک دیتے رہے لیکن بیسویں صدی سے ان مقبوضات اور نوآبادیوں کی قومی تحریکوں اور صنعتی ترقیوں نے رفتہ رفتہ اس بات کو مشکل بنا دیا۔ اسکے علاوہ سرمایہ داروں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بین الاقوامی تجارتی مقابلہ میں کامیابی کی یہی صورت ہے کہ مزدوروں کو جتنی ہی کم اجرت دی جائے اتنا ہی بہتر ہوگا لیکن وہ اس

چکی تھی ہوچکے تھے۔ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے لڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ ان حالات میں سرمایہ داروں کے سامنے دو طریق کار تھے اول تو یہ کہ وہ مزدوروں سے بغیر مقابلہ کئے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیتے اور اپنی تباہی کو خاموشی کے ساتھ قبول کرتے لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کہ کوئی جماعت بغیر قوت آزمائی کئے ہوئے اپنے مفاد کو نہیں چھوڑتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مزدوروں کی طاقت بالکل ختم کر دی جائے۔ کیونکہ یہی ان کے پہلو میں سب سے بڑا خار تھا۔

جرمنی اٹلی اور اسٹریا کے سرمایہ داروں نے اسی اصول پر عمل کیا اور اپنی بقا کیلئے ایک ایسی مطلق العنان حکومت قائم کر دی جس کا مقصد مزدوروں کی طاقت کو فنا کر دینا تھا۔ اس استبدادی نظام کو ہم فسطائیت کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ممکن ہو گیا کہ سرمایہ داری کی بوسیدہ عمارت کچھ عرصہ کے لئے جبر و ظلم کے کمزور ستونوں کے سہارے پر رک سکے۔ گویا کہ فسطائیت اس وقت وجود میں آئی جبکہ سرمایہ داری نظام اپنے خلقی نقائص اور تضاد اور مزدوروں کے حملوں کی وجہ سے اپنی آخری سسکیاں لے رہا تھا۔ ہٹلر اور مسولینی نے آکر اس میں ایک وقتی جان ڈال دی۔

جرمنی اور اسٹریا میں فسطائی انقلاب اس وجہ سے کامیاب ہوا۔ کہ گذشتہ جنگ عظیم میں انکو شکست ہوئی جس کی وجہ سے وہاں اقتصادی بدحالی بہت بڑھ گئی اور وہ تضاد جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے زیادہ شدت کیساتھ محسوس ہونے لگے۔ ان ملکوں کے مزدور منظم اور بیدار تھے اور باوجود اپنے لیڈروں کی غداری کے سرمایہ داروں کیلئے خطرناک تھے اس لئے انکی سرکوبی ضرور تھی۔ اٹلی میں بھی یہی حالات پیش آئے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ اٹلی بجائے شکست خوردہ ملک ہونے کے فاتح ملک تھا۔ کیونکہ جب اس نے دیکھا کہ اتحادیوں کا پلہ بھاری ہو رہا اور انکی فتح ہوگی تو وہ فوراً اس کی طرف ہو گیا۔ لیکن جب ورسائی کا صلحنامہ ہوا تو اٹلی کو جن نو آبادیوں کے ملنے کی امید تھی اور جن کا اتحادیوں نے پوشیدہ طرح سے وعدہ بھی کیا تھا وہ حاصل نہ ہو سکیں اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مسولینی اور اسکے ساتھیوں نے یہ نعرہ لگانا شروع کیا کہ اگرچہ اٹلی کو جنگ میں فتح ہوئی لیکن صلح میں شکست ہوئی۔ اسطرح کے پروپیگنڈے سے فسطائی لیڈروں نے عوام کے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ سرمایہ داروں نے انکی بڑی مالی امداد کی اور آخر کار مزدوروں کے لیڈروں کی خیانتوں کیوجہ سے اور جمہوری حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ملک میں فسطائیت قائم کر دی۔

انگلستان اور فرانس میں یہ نظام قائم نہ ہو سکا اس لئے کہ ان کو جنگ میں فتح ہوئی اور اپنی نو آبادیوں کی مدد سے وہ سرمایہ داری کی کمزور عمارت کو سنبھالتے رہے لیکن اقتصادی دشواریوں اور تضاد کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہاں بھی فسطائی رجحانات ترقی کرتے گئے۔ بالڈوین اور چیمبرلین۔ دلادیر اور لاوال کی خارجی اور داخلی پالیسیاں اس بات کی شاہد ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ فسطائیت سرمایہ داری کا ایک دور ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ آخری دور ہے۔ اسلئے کہ اسکی تباہی کے بعد دنیا کے سماجی نظام کی تشکیل بالکل دوسرے ہی اصولوں پر ہوسکے گی۔ سرمایہ داری اور فسطائیت میں جو اختلافات ہیں وہ ظاہری ہیں بنیادی نہیں ہیں۔ اختلافات محض اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ فسطائیت سرمایہ داری کے تحفظ کے فرائض انجام دینے میں مصروف ہے لیکن اگر غور سے دونوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں کوئی بنیادی اختلافات اور تضاد نہیں ہیں۔ اس لئے کہ دونوں میں دولت آفرینی عوام کے نکتہ نظر سے نہیں کی جاتی بلکہ نجی فائدہ کیلئے اور دونوں میں ذرائع پیداوار پر قبضہ سماج کا نہیں ہوتا بلکہ افراد کا ہوتا ہے لیکن ہم تاریخ کے اس دور میں پہونچ گئے ہیں جب کہ یہ اصول اب زیادہ عرصہ تک کارفرما نہیں رہ سکتے۔ ہٹلر اور مسولینی نے ہمارے موجودہ نظام میں جان ڈالنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن اس میں خود اتنی سکت نہیں باقی رہی ہے کہ وہ اب اور زندہ رہ سکے۔

فیض احمد فیض

ہماری تنقیدی اصطلاحات

ایک ادیب نگار کو جہاں ہماری زبان سے اور بہت سی شکایات ہیں وہاں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ آج ہمیں حسب ضرورت تنقیدی اصطلاحات نہیں ملتیں اور ان کے عجز بیان کا سبب ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری زبان میں تنقیدی لغت موجود ہی نہیں یا اس میں ایسے الفاظ کی کمی ہے جو مختلف تنقیدی تصورات کو ادا کر سکیں۔ اس شکایت کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ہمارے ہاں تنقیدی الفاظ و تراکیب کے استعمال میں اختلاف اور ابہام موجود ہے۔ ان کی اصطلاحی اہمیت زائل ہو گئی ہے۔ اصطلاح اور عام لفظ میں فرق ہی یہی ہے کہ ایک عام لفظ کے ارد گرد بہت سے موہوم غیر معین تصورات کا ہالہ سا ہوتا ہے۔ لیکن ایک اصطلاح کا مفہوم بالکل معین اور غیر مبہم ہوتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہم اسے اصطلاح کہہ ہی نہیں سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان اصطلاحات کی تعداد بھی نسبتاً بہت وسیع نہیں۔ ہم نے ابھی تک یہ برتنے کی کوشش نہیں کی کہ ہمارے مجوزہ محاسن و معائب، محاسن و معائب میں کتنی تمیز اور گہرائی پیدا کی ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر کے کلام میں سلاست ہے، روانی ہے، خلوص ہے، جدت ہے، وغیرہ وغیرہ تو نہ اس شاعر کے کلام کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں نہ اس کے کلام کے حسن و قبح کا پتہ چلتا ہے۔ ہم نے یہ الفاظ اس بار بار اتنے مختلف معنوں میں استعمال ہوتے دیکھے ہیں کہ اب ان سے دو چار ہوتے ہی کوئی واضح تصورات کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان الفاظ کے متعلق کافی بحث و توضیح کی ضرورت ہے لیکن تمام الفاظ کی وضاحت کافی طویل ہے اور ان سب کو ایک مضمون میں سمیٹنا دشوار ہے۔ اس لئے میں نے اس مضمون میں چند زیادہ کثیر الاستعمال الفاظ چنے ہیں۔ بحث کی ابتدا کرنے کے لئے تشبیہ و استعارہ۔ تشبیہ اور استعارہ کے معانی میں تو ایسا اختلاف یا ابہام نہیں لیکن ان کا صحیح مقصد اور خاص شعر میں ان کی اہمیت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں موجود ہیں۔ آج تک کسی شاعر کے کلام کا محاسبہ کرتے وقت تشبیہوں اور استعاروں کی جدت اور برجستگی پر کافی زور دیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ غالب کی عظمت کا راز اس کی اچھوتی تشبیہوں اور جدید استعاروں میں پوشیدہ ہے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں تو مجھے ضرور ہے کہ ایک شاعر محض تشبیہوں اور استعاروں کے بل بوتے پر بڑا شاعر بن سکتا ہے۔ تشبیہ اور استعارہ کی اہمیت جانچنے سے پہلے ہمیں ان کی صحیح نوعیت معلوم کرنی چاہئے۔ شاعر اپنے ... کوئی اکائی پڑھنے والے تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس اکائی کی وضاحت کیلئے اسے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ لہٰذا وہ اسے ایک مختلف اکائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ کہنے کی بجائے کہ فلاں چیز ایسی ہے وہ یہ کہتا ہے کہ فلاں چیز فلاں چیز جیسی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ قدرت کلام کا مظاہرہ نہیں عجز کا اظہار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لکھنے والا اپنے مضمون کی تمام خصوصیات کو مناسب الفاظ کے جامے میں پیش نہیں کر پاتا

اظہار کے لیے اُسے الفاظ نہیں ملے مجبوراً سیدھے راستے کی بجائے تشبیہہ استعارہ کی پگڈنڈی یا شارٹ کٹ اختیار کرنا پڑے۔ پہلا راستہ طویل بھی ہو اور دشوار بھی دوسرا مختصر بھی ہے سہل بھی اس عمل میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تشبیہہ یا استعارہ منزل نہیں راستہ ہے اور راستہ کی اہمیت محض منزل کی وجہ سے ہوتی ہے اور اگر ایک منزل ہی اہم نہیں ہے تو اس کا راستہ اور بھی ناقابل اعتنا ہوگا شاعر یا لکھنے والے کی منزل تو اس کا مضمون یا خیال ہے اگر یہ منزل بالکل معمولی ہے تو راستہ کی رنگینی اسے دلفریب نہیں بنا سکتی۔ اس لئے تشبیہہ استعارہ شعر یا ادبی تحریر میں کوئی مقصود نہیں فقط ایک راستہ یا ایک آلہ ہے اور راستے یا آلے کی طرح اس کا حسن و عیب اضافی ہے ہم کسی شاعر کو اس کی تشبیہوں اور استعارہ کی وجہ سے محض مذموم قرار نہیں دے سکتے۔ نہ کوئی شاعر محض ان کے اچھے ہونے سے بڑا ہو سکتا ہے۔ ادب برائے ادب کی طرح تشبیہہ برائے تشبیہہ یا استعارہ برائے استعارہ بھی ایک گمراہ کن نظریہ ہے۔

سلاست روانی اور صفائی سلاست اور روانی دراصل دو تشریح کے محتاج ہیں عام طور سے ہم اس شاعر کے کلام کو سلیس کہتے ہیں جو ہلکے پھلکے ہندی یا الفاظ استعمال کرے جسے فارسی اور عربی کے الفاظ اور خصوصاً فارسی تراکیب سے نفرت ہو لیکن اس رائے کی حمایت کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے مثلاً اگر ہم دو ایسے اشعار کو سامنے رکھیں جن میں سے ایک فارسی نما ہے اور دوسرا ہندی نما تو یہ لازمی نہیں ہے کہ ہندی نما یا سلیس شعر زیادہ سہل الفہم ہو۔ غالب کے یہ اشعار دیکھئے۔

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اور دوسری طرف۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اب ان میں سے سلیس کون ہیں اور مشکل کون؟ اگر الفاظ کو دیکھا جائے تو پہلے دو اشعار یقیناً سلیس ہیں۔ لیکن اگر معانی پر نظر ڈالی جائے تو دوسرے دو اشعار اور بھی زیادہ واضح ہیں۔ پھر یہ ہے کہ فارسی زبان کے قطرہ موج، کام نہنگ، غم ہستی اتنے ہی آسان الفاظ سمجھے جاتے ہیں جیسے ہندی میں بات اور چپ وغیرہ۔ سلیس شعر تو وہی ہونا چاہئے جس کا مطلب آسانی سے ذہن میں آجائے۔ لیکن کسی شعر کو مغلق اور پیچیدہ بنانے کے لئے فارسی الفاظ کی مدد لینا ہرگز ضروری نہیں ہے یہ ضرور ہے کہ جہاں کوئی فارسی ترکیب آئی تحریر میں پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ہندی میں آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے بہت سلیس ہے اور فارسی میں تو گویا خاقانی اور بیدل کے سوا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ یہ بات نہیں دراصل کسی تحریر کی سلاست کو الفاظ کی نوعیت سے بہت کم تعلق ہے۔ اگر خیال لکھنے والے کے ذہن میں صاف ہے اور اس نے اسے سہولت سے ادا کر دیا ہے۔ تو اس کی تحریر میں فارسی کی بجائے لاطینی کی تراکیب ہوں تو بھی ہم اسے سلیس ہی کہیں گے۔ البتہ امکان یہ ہے کہ اگر الفاظ

نہ زیادہ مانوس ہوں تو مضمون زیادہ آسانی سے ہم تک نہ پہنچیگا۔ روزمرہ گفتگو کے الفاظ زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ ان میں جو کچھ کہا یا لکھا جائے ہمارا ذہن زیادہ جلد قبول کرلیتا ہے۔ لیکن یہ امکان سے تردد نہیں ہے۔ سلاست اور روانی کے متعلق ہمارے تنقیدی خیال میں نقص یہ ہے کہ ہم نے مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر دیا ہے سلیس سے ایسی تحریر مراد لیے گئے ہیں جس کے الفاظ ہماری سمجھ میں آجائیں۔ یہی بات روانی اور بے ساختگی کے متعلق بھی صحیح ہے۔ روانی کے معنی یکساں حرکت کے نہیں۔ اب الفاظ تو حرکت کرتے نہیں۔ پڑھنے والے کا ذہن حرکت کرتا ہے اور اس حرکت کی یکسانی ان تصورات کے باہمی تعلق پر منحصر ہے جو الفاظ اس کے ذہن میں منضبط کرتے ہیں اگر لفظ کا پیدا کردہ صوتی اور معنوی تصور ہر بعد کے لفظ کے تصور میں آسانی سے تحلیل ہوتا اور گھلتا ملتا چلا جائے گا تو پڑھنے والے کے ذہن کو ایک آسانی ایک فرصت کا احساس ہوگا۔ اسی کو ہم روانی کہتے ہیں۔ سلاست کی طرح یہ بھی فارسی ہندی کا جھگڑا نہیں معانی کی مورد نشست کا مسئلہ ہے۔ الفاظ کے خارجی تسلسل کی پیدائش نہیں ان کی داخلی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح بیساختہ سے یہیں ایسی تحریریں یا اشعار مراد لیے جاتے ہیں جن میں کوئی بے جا نمائش کوئی تصنع کوئی آورد محسوس نہ ہو لیکن عملاً ہم نے اس لفظ کے معنی اس سے بہت زیادہ محدود کرلئے ہیں عام طور سے ہم بیساختہ ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں روزمرہ بول چال کے الفاظ میں بہت ہی عام اور پیش پا افتادہ تجربات کا اظہار کیا جائے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں   کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسے اشعار بے ساختگی کی بہت ہی ادنیٰ مثالیں ہیں اور اس میں لکھنے والے کے فن و غور کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا تجربات کی اپنی نوعیت کا۔ اگر کوئی شاعر نسبتہً زیادہ گہرے اور زیادہ دقیق تجربات کا ایسی ہی سہولت سے اظہار کرے تو نہ صرف یہیں اس کے اشعار کو بیساختگی سے متصف کرنا چاہیئے بلکہ اس بے ساختگی کو فنی اعتبار سے فوقیت بھی دینی چاہیئے۔ ساختگی کو ہم خوبی اس لئے کہتے ہیں کہ احساس ایک خوشگوار اچنبھا سا، ایک فوری تحیّر سا پیدا کرتا ہے اور یہ احساس عاشقانہ معاملات کے علاوہ حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات بھی پیدا کرسکتے ہیں۔ اگر مندرجہ بالا اشعار بے ساختہ ہیں تو یہ کیوں نہیں ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم   مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

یا

وہ حرفِ راز جو مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں   خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

ستارہ کیا مری تقدیر کا پتہ دے گا   وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

شوخی، ظرافت، سوز و گداز۔ شوخی اور ظرافت کا اب تک محاسنِ شعر میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی فلم کو اس لئے داد دی جائے کہ

اس میں ہم نے بہت اچھے ہیں یا ایک کتاب کو اس لئے شاہکار گردانا جائے کہ اس کی جلد نہایت خوبصورت ہے ہر فن کی ایک مخصوص فرصت ہوتی ہے اور اسی کے وجود یا غیر موجودگی سے ہم اس فن کے کسی نمونے کو کامیاب یا ناکامیاب ٹھہراتے ہیں۔ شاعری اور مزاح دو الگ فن ہیں اور دونوں کا اپنا اپنا مخصوص ردِ عمل ہے، جب ہم ایک مزاحیہ شعر کو اچھا شعر کہتے ہیں تو ہم اس شعر کے مجموعی تاثر کا تجزیہ نہیں کرتے، دراصل ہمیں ایسے شعر کو ایک کامیاب لطیفہ کہنا چاہیے اور اسی حیثیت سے اس کی پرکھ کرنی چاہیے، شوخی اور ظرافت جو یہاں ضرور ہیں لیکن ان کی وجہ سے شعر میں صرف ایک غیر متعلق قدر کا اضافہ ہوتا ہے۔ شعر کی اپنی خوبی یا برائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ فن ریاضی نہیں ہے، اس میں ایک اور ایک ہمیشہ دو نہیں بناتے کبھی نصف بھی ہو جاتے ہیں۔ شوخی اور ظرافت سے کسی کو خیال گذرا ہوگا کہ اگر یہ محاسن ہیں تو سوز و گداز محاسن کیوں نہیں۔ چنانچہ سوز و گداز بھی محاسن قرار دئے گئے۔ دوسرے الفاظ میں اگر شعر پڑھنے والے کے دل میں کوئی طربیہ کیفیت مرتب کرے تو بھی اچھا ہے اور کوئی المیہ کیفیت مرتب کرے تو بھی اچھا شعر ہے، اسے سیدھے طریقے سے یوں کہا جاسکتا تھا کہ جو شعر پڑھنے والے کے دل میں کسی نوع کی جذباتی کیفیت مرتب کرے اچھا شعر ہے اور یہ بہت حد تک صحیح بھی ہے۔ ہر شعر عام طور سے ایک جذباتی تجزیہ کا آئینہ ہوتا ہے اور اگر پڑھنے والا اس کے جذباتی پہلو سے متاثر نہیں ہوتا تو شاعر کا اظہار کامیاب نہیں ہے۔ لیکن ان تاثرات کو انواع میں تقسیم کرنا اور پھر نوع کو بجائے خود ایک خوبی تصور کر لینا بہت گمراہ کن ہے قدما کا مطلب بھی غالباً یہی ہوگا لیکن متاخرین نے تقلید کی دھن میں جزو کو اصل ور امثال کو مصدقات میں شامل کر دیا۔

تصوف۔ اسکول میں ہمارے اساتذہ ہر شعر میں تصوف کی چاشنی ڈھونڈا کرتے تھے اور اگر انہیں کسی شعر میں اس کا سراغ نہیں ملتا تھا تو فرمایا کرتے تھے "ابے میاں، لغو شعر ہے آگے پڑھو" اب تصوف کا شعر کے لوازمات میں شمار نہیں ہے۔ لیکن اس کے مفہوم کے متعلق کافی غلط فہمی موجود ہے، تصوف ایک عقیدہ بھی ہے اور ایک کیفیت بھی، بعض شعرا محض صوفیانہ عقائد کو نظم کرتے ہیں اور بعض ان ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں جن پر ان عقاید کی بنیاد ہے۔ لیکن جس طرح ہم کسی شاعر کو محض اس وجہ سے انقلابی یا اشتراکی شاعر نہیں کہہ سکتے کہ اس کے کلام میں انقلاب کا لفظ بار بار دہرایا جاتا اسی طرح ہمیں کسی شاعر کو محض اس وجہ سے صوفی شاعر نہیں کہنا چاہیے کہ اس میں ہمہ اوست کے نظریے کی تکرار موجود ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں،

یا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا،

اور اس قسم کے اشعار کو حکیمانہ فلسفیانہ یا اور جو بھی چاہے نام دے لیجئے لیکن انہیں صوفیانہ اشعار نہیں کہا جاسکتا، ان میں تصوف کی بنیادی کیفیت موجود نہیں ہے۔ مقاصدِ شعر کے لئے ہم محض اسی کیفیت کو تصوف کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر عقائد کو سہارا دینے کے لئے کوئی شدید جذبہ موجود نہ ہو تو اول انہیں شاعری کی سرحد میں داخل کرنا ہی دشوار ہوتا ہے اور دوسرے ان میں خلوص کی جھلک پیدا نہیں ہوتی۔

مضمون آفرینی اور معاملہ بندی' ظاہر ہے کہ مضمون آفرینی کے بغیر کوئی شعر، شعر کہلا ہی نہیں سکتا۔ لیکن ہمارے ہاں مضمون آفرینی کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں کافی اختلاف ہے' عام طور سے ہم مضمون آفرینی سے یہ مراد لیتے ہیں کہ مضمون کم ہے اور آفرینی زیادہ' اگر شاعر کوئی بالکل نیا' بالکل ناشنیدہ مضمون پیدا کرے تو ہم اُسے مضمون آفرینی نہیں کہتے لیکن اگر کسی پُرانے فرسودہ مضمون میں کوئی تفصیل بڑھادی جائے کچھ ادل بدل کر دیا جائے یعنی بگلے کے سر پر موم رکھ کر پکڑا جائے تو مضمون آفرینی مسلّم' مثلاً یہ شعر مضمون آفرینی کے نمونہ ہے'

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

اور یہ نہیں ہے

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

ظاہر ہے کہ مضمون آفرینی کا یہ بہت غلط استعمال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مضمون کا لفظ غلط معنوں میں استعمال ہو رہا ہے' بجائے اس کے شاعر کے اپنے محسوس کردہ تجربات کی بجائے وہ بندھے ہوئے عنوانات مراد لیے جاتے تھے۔ جن پر قریباً ہر شاعر طبع آزمائی کرتا تھا۔ حسد و رقابت' معشوق کی بے وفائی' دنیا کی بے ثباتی' عاشق کی نقاہت' شبِ ہجراں کی طوالت' شاعر کے لیے یہ مختلف اقسام کے مصرعہ ہائے طرح تھے جن پر وہ زیادہ سے زیادہ کوئی خوبصورت گرہ لگا سکتا تھا' اسی کشیدہ کاری کو ہم مضمون آفرینی کہتے ہیں۔

بندشِ قافیہ } بندش کی چستی' قافیہ کی موزونیت اور مختلف صنائع کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ تشبیہہ استعارہ کی طرح **صنائع و بدائع** } یہ بھی شعر کے تاثر کو واضح کرنے کے ذرائع یا آلات ہیں' ان کی اہمیت بھی قطعی نہیں اضافی ہے۔ ان کی موجودگی بھی شعر کے حسن کی شرط یا دلیل نہیں بلکہ اس حسن کی تخلیق کے بہت سے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جو کثرتِ استعمال کی وجہ سے قریب تر اور آسان تر ہے۔

ایک اور بات کی تشریح بھی لازمی ہے اکثر سننے میں آتا ہے کہ مشرقی ادب کو مشرقی معیار سے جانچنا چاہیے اور اس مشرقی معیار کے عناصر وہی ہیں جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے' مغربی ادب و تنقید کے معقولات مختلف ہیں اور اُن کا ہمارے خالص مشرقی ادب پر اطلاق کرنا پانی کو گز سے ناپنے کے مترادف ہے' یہ مشرقی اور مغربی کی تفریق سطحی اور گمراہ کن ہے' ادب کی طرح تنقید بھی وقت اور ماحول کی پیروی کرتی ہے' ادبی کتابیں پہلے لکھی جاتی ہیں تنقیدی قوانین بعد میں وضع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر دور کے نقادوں کو اپنے معاصر ادبا میں جو خصوصیتیں نظر آتی ہیں اُنہیں کو وہ محاسن قرار دے لیتے ہیں' اور پھر اُنہیں کو سامنے رکھ کر تنقید کے قواعد و ضوابط بھی مرتب کر لیتے ہیں' جب معاشی ماحول بدلتا ہے تو لکھنے والے بھی بدل جاتے ہیں' اور نقادوں کی آرا بھی' یہ ہر سماج کا داخلی فعل ہے اور اسے مشرق یا مغرب سے تعلق نہیں' پرانی سماج اور اُس کے ادب ایک ایسے طبقہ کی تقلید کرتے تھے جسے نام و نمود کی ہوس بھی تھی' اس کے مٹ جانے کا ڈر بھی' یہ طبقہ اس ڈر کا اعتراف کبھی حزنیت اور تصوف کے رنگ میں کرتا تھا کبھی تعیش اور لذت پرستی کی صورت میں زندگی میں اس کی واحد کوشش یہ بھی کہ اُس کے دل

دو دماغ کو آنچ نہ آنے۔ اس دور کا ادب انہیں جذباتی ضروریات کو پورا کرتا تھا۔ کوشش کی جاتی تھی۔ ہلکے پھلکے الفاظ ہوں کہیں زاہد پہ پھبتی ہو کہیں بے ثباتی دنیا کا تذکرہ، مضامین خواہ سادہ ہوں خواہ مغلق لیکن ہوں ایک ہی ڈھب کے جن سے سب کا ذہن مانوس ہو، پھر شعر میں تو ابارہ سجع و مسجع ہو اور بگیاتی نفاست۔ انہیں خصوصیتوں کو نقادوں نے محاسن شعر قرار دیا۔ اب یہ طبقہ مٹ چکا ہے معاشی نظام کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے۔ اب ادب ایک مختلف طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کی نوعیت محض تفریحی نہیں افادی ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ پرانے سکوں کی جگہ نئے سکے ٹکسال سے باہر آ رہے ہیں۔ رومانیت، زوالیت، رجعت پسندی، رزمی پسندی وغیرہ۔ یہ مغرب کی تقلید کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے سماجی ارتقاء کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان پرانے اور نئے سکوں کے وقتی اور اتفاقی محل پہ جھگڑنے کی بجائے ان کی قطعی اور دائمی قیمتیں دریافت کرنے کی کوشش کریں۔

حکیم ارزقی

مولانا عبدالسلام ندوی کا خطبۂ صدارت متعلقہ اردو نثر

حسرت موہانی کے شہر کانپور کی انجمن جامعہ ادبیہ کے سالار جلسہ کا خطبہ صدارت جو لکھنے والا "شعرالہند" دو حصص کا مصنف ہو اور اس پر مدیر معارف[1] کا یہ نوٹ ہو کہ "اردو میں نثر پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اس خطبہ میں نثر کے متعلق بعض نئی اور مفید باتیں ہیں" —— تو پھر مجھ جیسے جاہل کے آدمی کو کس طرح جرأت ہوسکتی ہے کہ کوئی اعتراض وارد کرے۔ لیکن الامر فوق الادب، بلکہ الادب فوق الامر!

فاضل خطیب پہلے تو "نثر کو ادبی حیثیت سے نظم پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ نظم ضرورت شعری وزن قافیہ کے باعث تعقید کی ترکیب ہوتی ہے۔ غیر فصیح الفاظ استعمال میں لاتی ہے۔ نثر اس سے پاک ہے۔ اور اس کی تائید یوں کی ہے کہ نثر کو نظم کے قالب میں ڈھالا جائے تو غیر ضروری الفاظ بڑھانے پڑتے ہیں مگر جب نظم کو نثر کے قالب میں ڈھالا جائے تو غیر ضروری الفاظ چھٹ جاتے ہیں عبارت سڈول ہو جاتی ہے ایجاز و اختصار پیدا ہو جاتا ہے!

گو یا بسم اللہ ہی غلط کر دی —— نظم کی ماہیت کے متعلق منشیانہ بے خبری سے اعراض فرمایا —— وزن و قافیہ خارجی زنجیریں نہیں۔ جس ذہنی حالت کا اظہار نظم سے کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے (اس کے اظہار کے لیے) اصوات کی مخصوص ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس ذہنی حالت کا ابلاغ و اظہار نہیں ہوسکتا اسی لئے نظم کو نثر کرنے سے آپ کلام کو بہتر نہیں بناسکتے۔ خواہ العاطجوں کے تول رہیں! —— ہنزکیب، تمام معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ نہیں تو کلام حافظ کی جگہ مولانا عبدالسلام کا "نثری ترجمہ" زیادہ مقبول و رفیع ہو!

دوسرا نکتہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ نثر کو نظم پر "افادی" حیثیت سے بھی ترجیح حاصل ہے۔ اور اس افادی حیثیت کی تشریح یوں کی ہے کہ "نظم میں زیادہ تر ہجو بدگوئی چاپلوسی شراب . . وغیرہ کے مضامین ہوتے ہیں۔ جو اخلاقی و مذہبی اعتبار سے قابل اجتناب ہیں" فاضل نقاد نے اگر نظم میں ان مضامین کا مطالعہ زیادہ فرمایا ہے تو اس میں نظم کا قصور نہیں۔ اس قسم کے رجحانات والے لوگ کہتے ہیں کہ نثر میں ایسے مضامین کی کمی نہیں اور اگر چند اخبارات کی بات مان لی جائے تو یو۔پی کے چند "ترقی پسند" کہلانے والے افسانہ نگاروں کا ایک ایک قصہ شعراء کے دیوانوں پر بھاری ہے! —— مگر اس کا "افادیت" سے تعلق زیادہ واضح نہیں۔ اور اس دلیل کی یہ تائید کہ "یہی وجہ ہے کہ کوئی پیغمبر آج تک شاعر نہیں ہوا" کچھ ایسی بار ربط نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان اور داؤد شعر کہا کرتے تھے۔ اور کیا خود رسول پاک نے یہ صراحت نہیں فرمایا کہ شعر عام کلام کی طرح کہ اچھا اچھا اور برا برا ہے!

---

[1] معارف۔ جنوری ۱۹۴۲ء

اور کیا شعر پڑھا سنا اور پسند کرتا جو رسولِ پاک اور صحابہ کرام (حضرت علی اور حسان بن ثابت صاحبِ دیوان تھے، ما شہورہ) کسی طرح بھی شعر کہنے سے زیادہ اخلاقی عمل ہے! ـــ یوں بھی یہ زبان کی ادبی تنقید ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے "وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ" کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ "ہم نے محمد کو شعر کی تعلیم نہیں دی (کیونکہ وہ ان کی شانِ رسالت) کے لیے موزوں و سزاوار نہ تھی" ـــ جو غلط بھی ہے اور بے ربط بھی!

نظم و نثر کے متعلق تقسیم آنکہ بیان فرمایا گیا ہے کہ "عام طور پر کلام کی دو قسمیں ہیں نظم و نثر لیکن دقیق النظر لوگوں نے ایک ایسی قسم بتائی ہے جو نظم و نثر دونوں سے الگ ہے"! ـــ اور اس دعوے کی تائید میں قادری صاحب کی کسی کتاب سے دو شخصوں کا مکالمہ درج کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "یہ دیکھیں غالب ادیب ہونے کے ساتھ فلسفی ہے" حالانکہ نقل کردہ عبارت مشہور فرانسیسی ادیب مولیئر کے ایک ڈرامہ کے چند فقروں کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ بہرصورت اس عبارت سے کسی طرح بھی "معلوم" نہیں ہوتا کہ ہر غیر منظوم کلام نثر نہیں ـــ اس بحث کو مبارک کر کے فرمایا گیا ہے کہ "سلاست، روانی، تسلسل، صنائع و بدائع استعارہ" شاعری کے لازمی جزو ہیں! ـــ ورادیبانہ نثر میں بھی یہ باکثرت ہوتے ہیں۔ لازمی جزو کی بھی ایک ہی رہی۔ اگر صنائع بدائع نہ ہوں تو گویا شعر نہیں ہوتا اور روانی اور سلاست کے تو کیا کہنے!

اسی سلسلہ میں منطقی مغالطہ کی ایک اچھی مثال سرزد فرمائی ہے کہتے ہیں کہ بعض ادیب قرآن کو نہ نظم مانتے ہیں نہ نثر۔ جس طرح انگور نہ سیب ہے نہ انار ـــ سیب اور انار کے سوا ہر پھل کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ نہ سیب ہے نہ انار!

نظم و نثر کے نازک امتیازات کی بحث کو بڑھا کر آخری فیصلہ یوں فرمایا ہے کہ "نظم میں جو مضامین بیان کیے جاتے ہیں وہ اور ہیں اور نثر میں اور ہیں" اور اس موہومیت کو متعین یوں فرمایا ہے کہ غیر اخلاقی مضامین (رندی بوالہوسی) زیادہ تر نظم کے عنصری عنصر ہیں۔ برخلاف نثر میں جو مضامین بیان کیے جاتے ہیں زیادہ تر اخلاقی ہوتے ہیں!

اول تو مضامین کو "بار کرنا" ایک عجیب سی جبر ہے اور پھر اس اعتبار مضمون باری کو ڈرامہ ناول اور افسانہ کی بھی امتیازی خصوصیت قرار دینا (مولانا خود فرماتے ہیں "(ڈراما) افسانے سب سے زیادہ نثر کے لیے موزوں ہیں") اور اس طرح مسدس حالی، بال جبریل، بانگ درا کو "غیر اخلاقی" اور "نظم"، "گلستان" کے باب پنجم اور قاآنی کی "پریشان" کو "اخلاقی" اور "نثر" قرار دینا کچھ ایسا قابلِ تعریف تنقیدی کارنامہ نہیں اور اگر ان مثالوں کو مستثنیات گردانا جائے تو مولانا کا کلیہ سارے کا سارا بے کار ہو جاتا ہے۔

قرار نظم کے لیے الگ الگ مضمون متعین کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ "شعر کا ایک اہم موضوع تصوف و اخلاق ہے" تصوف و اخلاق کو ایک موضوع اور فقط ایک موضوع قرار دینا بجائے خود دلچسپ ہے۔ اس پر یہ دلیل کچھ کم نہیں کہ "کیونکہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین میں اکثر لطیف تشبیہات و استعارات قصص و حکایات اور امثال و روایات کے ضمن میں واضح اور شگفتہ الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اخلاقی کتابیں مثلاً انوارِ سہیلی اور اخلاقِ محسنی وغیرہ ادبی حیثیت سے فارسی کے قدیم نصابِ تعلیم میں داخل ہیں" ـــ مثلاً کے ساتھ وغیرہ کا استعمال ضروری ہے یا غیر ضروری مگر یہ امر یقیناً قابلِ توجہ ہے کہ اس دلیل کے جملہ اجزا تصوف کو نظم کا "موضوع" بنانے کے مانع نہیں۔ انوارِ سہیلی اور اخلاقِ محسنی اگر اخلاق کی کتب ہیں

تو مولانا روم اور عطار کی مثنویاں تصوف کی کتب ہیں اور ادبی حیثیت سے داخلِ نصاب رہی ہیں۔ ان میں بھی لطیف تشبیہات و استعارات بیان کئے جاتے ہیں؟ تو پھر نثر اور نظم کے الگ الگ مضمون متعین کرنے کا کیا فائدہ؟

یوں بھی اس خطبۂ صدارت میں کئی بے بنیاد اور غیر متوازن کلیے عام ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ "دنیا میں جس قدر بڑے بڑے سیاست داں پیدا ہوئے وہ صرف سیاسی آدمی نہ تھے بلکہ بہت بڑے ادیب اور انشاء پرداز بھی تھے" تو گویا اگر آپ ایک بڑا سیاست داں ایسا بتا دیں جو بہت بڑا ادیب (محض بڑا ادیب نہیں) اور انشاء پرداز نہ تھا تو مولانا کا کلیہ غلط ثابت ہوگیا۔ بسمارک بڑا سیاست داں تھا۔ مگر بہت بڑا ادیب نہ تھا۔ اسی سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں کہ "مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا شمار بہترین ادیبوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ لوگ اگرچہ جو کچھ لکھتے ہیں انگریزی میں لکھتے ہیں۔ تاہم اردو زبان میں ان کی تصنیفات یا مضامین کے جو ترجمے ہوتے ہیں وہ اردو علم ادب میں نثر کا بہترین نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔"

اس فقرہ پر غور کیجئے۔ کس قدر بے احتیاطی سے سوچا اور لکھا گیا ہے! —— مہاتما گاندھی کو ادیب مان لیا۔ مگر انہیں بہترین ادیبوں میں شمار کرنے کا فخر مولانا کو مبارک رہے۔ یہ کہنا کہ گاندھی جی جو کچھ لکھتے ہیں انگریزی میں لکھتے ہیں اگر واقعہ کے طور پر درست ہے اور "جو کچھ" کی عمومیت جائز ہے تو پھر گاندھی کا شمار انگریزی کے بہترین ادیبوں میں ہونا چاہئے۔ اس لئے مولانا کو اپنی رائے کے علاوہ انگریزی ادب کے چند اور مستند نقادوں کی رائے بھی پیش کرنی چاہئے۔ اور پھر مولانا کا یہ ارشاد کہاں تک بجا ہے کہ نہرو اور گاندھی کی انگریزی تحریروں کے ترجمے اردو ادب میں اردو نثر کے بہترین نمونے ہیں۔ خواہ ترجمہ کرنے والا اور اسکا ترجمہ کسی قسم کا ہو؟ -

ایک اور کلیہ ملاحظہ ہو کہ "شعر تو ہر شخص کہہ سکتا ہے۔ لیکن نثر علماء ہی لکھ سکتے ہیں۔" اور جب [illegible] ل افسانوں کو (ڈرامہ کو نجانے کس لئے بالکل نظر انداز فرما دیا) نثر کیلئے سب سے زیادہ موزوں قرار دے چکے ہیں۔ تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہمارے بہترین فسانہ نگار بڑے عالم لوگ ہیں۔ اور منشی پریم چند آنجہانی اور راجندر سنگھ بیدی ایجہانی کو آج سے مولانا کے خطاب سے یاد کرنا چاہئے!

اگر مدیرِ معارف کے نزدیک مذکورہ بالا ملفوظات "نئی اور مفید" باتوں پر مشتمل ہیں تو مدیرِ معارف کی یہ تنقید نئی ہو تو ہو ادبی اعتبار سے کسی طرح بھی "مفید" نہیں! —— •

اگر روزی بہ دانش برفزودے

زناداں تنگ تر روزی نبودے

(سعدی)

ڈاکٹر تاثیر

فرار

محاورہ مابین شاعر و ضمیرِ کائنات !ٓ

مجھے حاصل ہیں دنیا کے مراتب مال و دولت بھی
گوارا میری سیرت ہے گوارا میری صورت بھی
میسّر ہے خمارِ عشرت و کیفِ محبت بھی
تو پھر یہ مردنی کیوں چھا رہی ہے میری دنیا پر ؟

تجھے حاصل ہے سب کچھ پھر بھی غم بے حاصلی کا ہے
یہ غم تیرا بجا ہے یہ ترا احساس سچا ہے
کہ جیتا جاگتا ہے تو کہ تیرا قلب زندہ ہے
مگر اِک مردنی چھائی ہوئی ہے تیری دنیا پر !

میں گھل مل جاؤں گا یوں خاکساروں بے نواؤں میں
بدل ڈالوں گا سب احکام اپنے التجاؤں میں
میں اپنا مال و دولت بانٹ ڈالوں گا گداؤں میں
کرے گا طعن کوئی کس طرح پھر میری دنیا پر ؟

غریبوں کی غریبی کیا مٹے گی ان نوالوں سے
نپٹ سکتا نہیں تو اس طرح سرمائے والوں سے
الگ بالکل ہے تیرا مسئلہ ان سب سوالوں سے
کہ تیری اپنی دنیا طعنہ زن ہے تیری دنیا پر !

ٓ انگریز شاعر اوڈن کے جواب میں ۔

کروں گا اپنا گھر آباد میں اک اور دنیا میں
کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشت مصلےٰ میں
کسی آباد بستی میں کسی آزاد صحرا میں
نہ ہوگا پھر کسی کا بھی تسلط میری دنیا پر

جہاں بھی جائے گا تو تیری دنیا ساتھ جائے گی
نہ چھوڑے گی کبھی تجھ کو یہ تنہا ساتھ جائے گی
یہی حسرت یہی تیری تمنا ساتھ جائے گی
رہے گا تیری ذہنیت کا تسلط تیری دنیا پر

میں دنیا چھوڑ دوں گا میں خدا سے لو لگاؤں گا
صنم خانوں کے ایوانوں میں قندیلیں جلاؤں گا
کلیساؤں کے محرابوں میں اپنا سر جھکاؤں گا
خدا کے عرش کا سایہ رہے گا میری دنیا پر!

تو چاہے بھی تو پرچھائیں سے دل بہلا نہیں سکتا
خدا کا نور بھی آنکھیں تری چندھیا نہیں سکتا
جسے تو سچ سمجھتا ہے اسے جھٹلا نہیں سکتا
اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا ہے تیری دنیا پر

مری ظلمت کو چمکا دے گی طلعت مہ جبینوں کی
حصارِ عافیت بن جائیں گی باہیں حسینوں کی
غموں کو محو کر دے گی مسرت ہم نشینوں کی
خوشی کے پھول برسیں گے ہمیشہ میری دنیا پر

تمناؤں میں الجھاتا رہے گا دل کو تو کب تک
کھلونے دے کے بہلاتا رہے گا دل کو تو کب تک
خلافِ عقل منواتا رہے گا دل کو تو کب تک
ہوس کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں تیری دنیا پر

۱؎ حافظ سے مستفاد

نرالی ہے زمانے سے مرے افکار کی دنیا
حسینوں سے حسیں تر ہے مرے اشعار کی دنیا
شبِ مہتاب کی دنیا، مہِ رخسار کی دنیا
یہی انوارِ نکہت بار ہوں گے میری دنیا پر

چھپا رکھے گا خوابوں میں کہاں تک تو حقیقت کو
دبا رکھے گا لفظوں میں کہاں تک تو صداقت کو
یہ پردے اور بے پردہ کریں گے تیری فطرت کو
تری فطرت رہے گی سایہ افگن تیری دنیا پر

تو میں تیغ و کفن باندھے ہوئے کود وں گا میداں میں
حیاتِ جاوداں پنہاں ہے آبِ تیغِ براں میں
بہار آ جائے شاید اس طرح میرے گلستاں میں
خزاں چھائی ہوئی ہے مدتوں سے میری دنیا پر

بہار آئی نہ ہو جس باغ میں اس کی خزاں کیسی
ترا جینا بھی مرنا ہے حیاتِ جاوداں کیسی
یہ تلواریں کہاں کی ہیں، یہ ترکش کیا، کماں کیسی
ابد کی موت طاری ہو چکی ہے تیری دنیا پر

نہ جینے کی ہوس باقی نہ مرنے کا خطر دل میں
بھٹکتے پھرتے ہیں رہرو غبارِ راہِ منزل میں
ابھی لیلائے مستقبل چھپی بیٹھی ہے محمل میں
ابھی کچھ دیر تاریکی رہے گی ساری دنیا پر

لہ غالب سہ اقبال ؟

فصاحت جنگ جلیل

غزل

عجب رنگ کسی چشمِ نیم خواب میں ہے — ہزار میکدہ اک ساغرِ شراب میں ہے

بہک رہی ہے نظر بیخودی شباب میں ہے — کھلا نہ راز وہ بیدار ہے کہ خواب میں ہے

ادائیں مست نظر مست، چال میں مستی — جو میکدے میں ہے عالم وہی شباب میں ہے

کسی کے لب کبھی چومے تھے جام نے شاید — کہ بو گلاب کی ساقی تری شراب میں ہے

عجب حسینوں کا مجمع ہے غنچہ و گل سے — دمِ سحر کوئی بیدار کوئی خواب میں ہے

کسی کی حسرتِ نظارہ خون ہو ہو کر — کبھی ہے دل میں کبھی دیدۂ پُر آب میں ہے

ربودگی ہے محبت میں کس غضب کی جلیل
جو دیکھتا ہے سمجھتا ہے مجھ کو خواب میں ہے

جعفر علی خاں اثرؔ

غزل

وہ اِک نگاہِ محبت، شراب آلودہ
اور اُس پہ خندۂ رنگیں، حجاب آلودہ!

خدا ہی ہے جو محبت کی لاج رہ جائے
کہ انتظار ہوا اضطراب آلودہ

ہوس نشاط نہیں، ترکِ خامکاری کر
بہت ہوا دِلِ خانہ خراب آلودہ

یہ کس کی بزم میں تھا اذنِ باریابی آج
نسیم کا ہے گریباں گلاب آلودہ

یہ کون رند پشیماں ہوا ہے توبہ سے
دعائے نیم شبی ہے شراب آلودہ

نظر نواز ہے منظر جو تابِ دید رہے
وہ چشمِ مست ہو جس وقت خواب آلودہ

اثرؔ نثارِ تمنّائیں پوچھنے والے
بہت ہے ایک نگاہِ عتاب آلودہ

رُباعی

وہ رات کی دیوی کا سنورنا ہے ہے
کاکل کا وہ سر دوش بکھرنا ہے ہے
مخمور نگاہی کا سماں ایک طرف
ہر سانس میں سینے کا اُبھرنا ہے ہے

ن۔م۔راشد

زنجیر

گوشۂ زنجیر میں،
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی۔
سنگِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی
دشمنِ جاں دشمنِ جاں ہی سہی
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں،
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں ریشم نہیں!

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دُور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حُسن روز افزوں کی زینت کے لئے
سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تار ہائے سیم و زر
اُن کے مردوں کے لئے بھی آج اک سنگین جال

ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

شکر ہے دُنبالۂ زنجیر میں،
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگ زاروں سے ندا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سُو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آورد کو
حیلۂ شبخوں بناؤ!

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبی

حکیم آزاد انصاری

آیاتِ ادب

سرتاپا ادّعا بنے پھرتے ہیں
سرتاپا کبریا بنے پھرتے ہیں

یارب! ترے اہلِ مال و دولت بندے
ترے ہوتے خدا بنے پھرتے ہیں

میری قسمت مرے لئے کافی تھی
تھوڑی عزت مرے لئے کافی تھی

قدوسیت کو لے کے میں کیا کرتا
انسانیت مرے لئے کافی تھی

کوئی تو دوائے دردِ نادانی کر
کوئی علاجِ فرطِ حیرانی کر

تیرے عرفاں کا میں اگر اہل نہیں
میرا عرفاں ہی مجھ کو ارزانی کر

سرحلقۂ رنداں ہوں یہی کیا کم ہے
سرچشمۂ فیضاں ہوں یہی کیا کم ہے

پیغمبرِ تقوےٰ نہیں اس کا کیا غم

پیغمبرِ عصیاں ہوں یہی کیا کم ہے

جوش ملیح آبادی

ردِ عمل

میں اپنے دنوں کی تابش کو
جب اور نمایاں کرتا ہوں
تو ظلمت میری راتوں کی
کچھ اور بھی گہنا جاتی ہے
اور جب میں اپنی راتوں کی
ظلمت کو فروزاں کرتا ہوں
تو میرے دِنوں کی گل تابانی
کمھلا، کجلا جاتی ہے

جوش ملیح آبادی

حرفِ آخر کا اِک ورق

[حرفِ آخر کے عنوان سے جناب جوش ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں جس میں انہوں نے عقل اور ارتقا کی سطر کشی کی ہے۔ یہ اقتباس اُس وقت سے متعلق ہے جب حضرتِ آدم و حوا کی تخلیق سے پہلے اس مجلس کا ارتعاش اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں]

[صبح کاذب کا وقت ہے۔ آدم عالمِ سرشاری میں ایک پہاڑی پر ٹہل ٹہل کر جو سرسبز و شاداب اور چشموں کے زمزموں سے گونجی ہوئی ہے حیرت و حسرت کے ساتھ گنگنا رہا ہے]

واقعہ تھا کہ گماں تھا، مجھے معلوم نہیں
کل یہ کیا طرفہ سماں تھا، مجھے معلوم نہیں

پرتوِ صبح کے مانند زمیں کی جانب
کون شب کو نگراں تھا، مجھے معلوم نہیں

ذرّے ذرّے سے جوانی کی مہک آتی تھی
کس کا لب عطر فشاں تھا مجھے معلوم نہیں

ایک چشمے کی سی آواز تو آتی تھی ضرور
اور وہ چشمہ کہاں تھا، مجھے معلوم نہیں

جس کی رفتار سے تھی کاہکشاں جنبش میں
کون وہ سروِ رواں تھا، مجھے معلوم نہیں

چاند کا سینہ، ستاروں کا جگر، خاک کا دل
کس کی شوخی سے تپاں تھا، مجھے معلوم نہیں

بامِ گردوں پہ فسانوں نے علم کھولا تھا
یا حقیقت کا نشاں تھا، مجھے معلوم نہیں

آسمانوں سے برستے تھے خوشی کے گوہر
یا فلک اشک فشاں تھا، مجھے معلوم نہیں

جھٹپٹے کی شکن آمیز فضا کے پیچھے
دوست، یا دشمنِ جاں تھا، مجھے معلوم نہیں

سود مندی کی جھلک تھی کہ زیاں کاری کی
یا بہم سود و زیاں تھا، مجھے معلوم نہیں

شام کی جنبشِ مژگاں کی گہر تابی میں
کون یہ نیم عیاں تھا، مجھے معلوم نہیں

اسرار الحق مجاز

آہنگ

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہگذرِ کارواں سے ہم

کیا پوچھتے ہو جھومتے آئے کہاں سے ہم
پی کر اُٹھے ہیں خمکدۂ آسماں سے ہم

کیونکر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں
وہ رازِ دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم

ہمدم یہی ہے رہگذرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
اُلجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

ہر نرگسِ جمیل نے مخمور کر دیا
پی کر اُٹھے شراب ہر اک بوستاں سے ہم

ٹھکرا دیئے ہیں عقل و خرد کے صنمکدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے ہم

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق
لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

مخدوم محی الدین

زلفِ چلیپا

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام ۔ اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام
آندھیاں شعلہ بداماں، خون کی برسات ہیں ۔ اب تو بوئے آتش و باروت ہے ہر بات میں
موت محوِ شادمانی، غرقِ ماتم ہر حیات ۔ لٹ رہی ہے ساری خلقت، جل رہی ہے کائنات
جس زمیں سے ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے ۔ جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے
رام و لچھمن کی زمیں، کرشن کی گوتم کی زمیں ۔ وہ محمدؐ کی زمیں، وہ ابنِ مریم کی زمیں
اُس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے ۔ اُسکے دل میں موت ہے، اسکی نظر میں موت ہے
مندروں میں، معبدوں میں اور کلیساؤں میں موت ۔ خلوتوں میں موت ہے، شاہی شبستانوں میں موت
زرگری کا رقص ہے، سود و زیاں کا رقص ہے ۔ ہر گلی کوچے میں، مرگِ ناگہاں کا رقص ہے
اب کسی سینے میں روحِ شادماں گاتی نہیں ۔ زندگی کی اب کہیں ہل چل نظر آتی نہیں
برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی ۔ برہمی دیکھی تھی، ایسی برہمی دیکھی نہ تھی
پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کے سرمایہ کا نام ۔ موت کا لبریز ساغر، عصرِ حاضر کے غلام

عزمِ آزادی سلامت، زندگی پائندہ باد
سُرخ پرچم اور اونچا ہو، بغاوت زندہ باد

جگر مرادآبادی

رشحات

شاعر ہے محوِ فطرت، جذبات چھا رہے ہیں　　پیغام آ رہے ہیں، پیغام جا رہے ہیں

کافر جمال والے، کافر بنا رہے ہیں　　ایمان لانے والے، ایمان لا رہے ہیں

آئینہ رُوبرو ہے، کچھ گنگنا رہے ہیں　　زلفیں سنور چکی ہیں، قشقہ لگا رہے ہیں

جھونکے نفس نفس میں خوشبو کے آ رہے ہیں　　شاید وہ آج خود ہی تشریف لا رہے ہیں

ساون کی رین، اندھیری تنہایوں کا عالم　　بھولے ہوئے فسانے سب یاد آ رہے ہیں

دنیا بجائے خود ہے اک جنّت میسر

افسوس اہلِ دنیا دوزخ بنا رہے ہیں

زہے وہ شوق جو پابندِ این و آں نہ رہا　　خوشا وہ سجدہ جو محدودِ داستاں نہ رہا

نہیں کہ دل مرا وقفِ غمِ نہاں نہ رہا　　مگر وہ شیوۂ فرسودۂ بیاں نہ رہا

لطیف طبع کو لازم ہے سوزِ غم بھی لطیف　　- بلند آتشِ گل کا کبھی دھواں نہ رہا

فراقِ زیست کی شورش، وصال موت کی نیند　　کہاں کا لطف جو یہ لطفِ درمیاں نہ رہا

چمن تو برقِ حوادث سے ہوگیا محفوظ　　- مری بلا سے اگر میرا آشیاں نہ رہا

مطلبی فریدآبادی

تعطل کی حکمتِ[1] عملی

کیوں ہردے کی نیا ڈانواڈول

کب تک بورے گا میٹھے بول   کب کرے گا مول اور تول
سمے[1] ہے مورکھ آج امول[2]   اٹھ اور گھونگٹ کے پٹ کھول
کیوں ہردے کی نیا ڈانواڈول

مہ رت ہیں ساری رات   گھڑ گھڑ[3] کرے ساری رات
لہو برکھا ہے یہ برسات   اٹھ تو بھی اپنا سنکھ ٹٹول
کیوں ہردے کی نیا ڈانواڈول

تیرے لہو کے پیو گن[4] ہار   آپس میں ہیں چھری کٹار
اٹھ اور بیڑی اپنی اتار   اور پنجرے کی کھڑکی کھول
کیوں ہردے کی نیا ڈانواڈول

کھول کے باہر آجا پنچھی   پنکھ پون میں پھیلا پنچھی
ہر پنچھی سا بن جا پنچھی   پنجرے میں رہ کر پنکھ نہ تول
کیوں ہردے کی نیا ڈانواڈول

پون اگل رہی انگارے   دیکتے پھرتے ہیں ہتیارے[5]
نہیں سمے باتوں کی پیارے   مت بیٹھا کیچڑ کو گھنگول
کیوں ہردے کی نیا ڈانواڈول

ہو ڈانواڈول تو کال[6] بلاوے   پلک مارتے جھپٹ کر باوے
دیا[8] کرے نا الٹا کھاوے   مت دھڑدل[9] کے موتی رول
کیوں ہردے کی نیا ڈانواڈول

۱ وقت ۲ نادر ترین ۳ ہوائی جہاز کے شور کی آواز ۴ پینے والے ۵ ظلم کرنیوالے ۶ موت ۷ تباہی ۸ رحم، کرم ۹ دل

زبیدہ بھٹی

بھگوان

بیٹھا تھا آکاش پر تو آنکھوں سے دُور
من میں بسا ان نینوں تیری شُدھ دھیان ہے نُور
آنکھوں میں ہر کاریہ تھا تیرا
من میں تھا یہ گیان
کرم دھرم کو دیکھتا ہے یہ بھگوان

تو مندر میں آن براجا پہن کے ہیرے موتی
دوارو ہٹا کی اوٹ میں آگئی تیری جوتی
سیوک داس پجاری پردہت پنڈت اور ودوان
دینے لگے یہ گیان
ان کے چرنوں کے چھونے سے ملتے ہیں بھگوان

آرتی پوجا۔ رس لیلائیں دیودا سیاں گائیں
ہری ہری ہر ہری ہری ہر جے وشنو بھگوان
تو ہے ناتھ اناتھ کا اور نربل کے پران
جے تیری بھگوان!

راگ رنگ اور بھینٹ بھوگ کے موہ نے تجھ کو رجھایا
رس لیلا کے پھیر میں تجھ کو لے آیا انسان
ارے میرے بھگوان!
تو مندر میں بیٹھ رہا ہے پہن کے ہیرے موتی
میں حیران ہوں آتما تجھ کو الجھن یوں نہیں ہوتی
توڑ پھوڑ کر دوار دھن سب کر دے ایک سماں
من مندر میں بس رہے تو مست کہلا بھگوان!

چراغ حسن حسرت

تغزّل

یہ مایوسی کہیں وجہِ سکونِ دل نہ بن جائے
غمِ بے حاصلی ہی عشق کا حاصل نہ بن جائے

مدد اے جذبِ دل راہِ محبت سخت مشکل ہے
خیالِ دوریٔ منزل کہیں منزل نہ بن جائے

نہیں ہے دل تو کیا پہلو میں ہلکی سی خلش تو ہے
یہ ہلکی سی خلش ہی رفتہ رفتہ دل نہ بن جائے

ہجومِ شوق اور راہِ محبت کی بلاخیزی
کہیں پہلا قدم ہی آخری منزل نہ بن جائے

(بطرزِ شعرائے قدیم)

دشمن جوانیوں کی یہ آشنائیاں ہیں
ان آشنائیوں میں کیا کیا بُرائیاں ہیں

حسرت کہو کہ کس سے آنکھیں لڑائیاں ہیں
ہونٹوں پہ سرد آہیں مُنہ پہ ہوائیاں ہیں

یا دل ستانیاں تھیں اور مہربانیاں تھیں
یا کج ادائیاں ہیں یا بے وفائیاں ہیں

قسمت کی کیا شکایت تقدیر کا گلہ کیا
جتنی برائیاں ہیں دل کی برائیاں ہیں

فراق گورکھپوری

غزل

دیکھ محبت کا یہ عالم! ساز بھی کم کم سوز بھی کم کم
یہ شیرازۂ دل کا ہے عالم یک جا یک جا برہم برہم
حسن گلستاں شعلہ و شبنم سوزاں سوزاں پُرنم پُرنم
یاد ہے ان آنکھوں کا وہ عالم مستی کم کم وحشت کم کم
ساکت ساکت شورشِ عالم دل کی صدا بھی مدھم مدھم
عالم عالم عشق بھی تنہا، تنہا حسن بھی عالم عالم
یہ کیا کم ہے عشق کا حاصل کچھ مجھ کو غم، کچھ تم کو غم
غمکدۂ دل کا یہ دھندلکا روشنی کم کم تیرگی کم کم
سازِ محبت، نغمۂ جنت سوزِ محبت، نارِ جہنم
رنگ ہے کس کا، روپ ہے کس کا نکھرا نکھرا، مبہم مبہم
دل کی وہ دنیا ہے جو ہو گی برہم ہو کر اور منظم
دل کی جراحت، تیری محبت ایسا زخم، نہ ایسا مرہم
آتی بہاریں، جاتی بہاریں، دونوں کا حاصل دیدۂ پُرنم
عشق میں سچ ہی کا رونا ہے جھوٹے نہیں تم جھوٹے نہیں ہم

ہم نے بھی آج فراق کو دیکھا
سوزِ مکمل دردِ مجسم ——

حفیظ جالندھری

غزل

ان گیسوؤں میں شانۂ ارماں نہ کیجیے
مجموعۂ خیالِ پریشاں نہ کیجیے

کیا ناخدا بغیر کوئی ڈوبتا نہیں
مجھ کو مری خدا سے پشیماں نہ کیجیے

مر جائیے نہ کیجیے ذکرِ بہشت و حور
اس خواب کو بھی خوابِ پریشاں نہ کیجیے

ہے بتکدے میں بھی اسے ایمان کا خیال
کیوں اعتبارِ مردِ مسلماں نہ کیجیے

آئینہ دیکھیے مری صورت نہ دیکھیے
میں آئینہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجیے

بارِ نگاہِ لطف اُٹھایا نہ جائے گا -
احساں یہ کیجیے کہ یہ احساں نہ کیجیے

باقی ہو جو بھی حشر یہیں پر اُٹھائیے
مرنے کے بعد زیست کا ساماں نہ کیجیے

دوزخ کو دیجیے نہ پراگندگی مری
شیرازۂ بہشت پریشاں نہ کیجیے

تو ہی عزیزِ خاطرِ احباب ہے حفیظ
کیا کیجیے اگر تجھے قرباں نہ کیجیے

قیوم نظر

جنگ

اُداس لیٹی ہیں محرومِ نقشِ پا راہیں
فسردہ گھاس کے سینے سے دُور ہیں سائے
شکستہ گاؤں میں دہقاں نہ خستہ جاں گائے

شگفتہ شام کی سرخی سیاہ فام زبوں
گراں ہے خاطرِ گل پر لطیف موجۂ باد
ملول گوشۂ صحنِ چمن ہے بے فریاد

رہینِ شائبۂ موہوم رس بھرا پیغام
جگر فگار ہے مہجورِ آہِ نرم و گداز
شبِ دراز، ستارے، نہ ماہِ محرمِ راز

حسین خاک کے ذرّوں پہ بیوگی کا نشاں
برہنہ گرسنگی بارِ زندگی سے چور،
مہیب صبر کے دامن میں بے بسی مستور

عدوئے دوست نما اور فریبِ شانِ وطن
درِ رقیب پہ جلتے ہیں جسم و جانِ وطن

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

تصور میں بھی جلووں کی فراوانی نہیں جاتی
دلِ مہجور کی آئینہ سامانی نہیں جاتی

رقیبِ یک دگر ہیں دیدہ و دل تیری فرقت میں
کہ یہ آباد ہے اور اُس کی ویرانی نہیں جاتی

کسے معلوم تھا ترکِ محبت اس کو کہتے ہیں —
نظر کی بے کسی، دل کی پریشانی نہیں جاتی

ابھی ہر سانس پر دھوکا ہے عمرِ جاودانی کا
ابھی تیری کشش اے ہستیٔ فانی! نہیں جاتی

کوئی جاں تو نہیں جو وقت پر تن سے نکل جائے —
یہ اُن کی یاد ہے دل سے بہ آسانی نہیں جاتی

ابھی تو ہیں ذوقِ معصیت ہوتی ہے دنیا میں —
ابھی اپنے گناہوں پر پشیمانی نہیں جاتی

جیئے جاتے ہیں گو صورت نہیں ہے کوئی جینے کی —
تمہارے دردمندوں کی گراں جانی نہیں جاتی

یہی تسکینِ خاطر ہے تو کیا تسکینِ خاطر ہے
مرے جوشِ محبت کی فراوانی نہیں جاتی

ابھی آرائشِ گیتی میں باقی ہے کسر شاید
بشر کے خونِ ناحق کی جو ارزانی نہیں جاتی

ہزاروں کارواں گم ہو گئے دشتِ تمنا میں،
سبکسارانِ منزل کی تن آسانی نہیں جاتی

کہیں رنگِ شفق میں یہ، کہیں لالہ و گل میں
شہیدانِ وفا کی شکل پہچانی نہیں جاتی

محبت بھی کیے جاتے ہیں پچھتاتے بھی جاتے ہیں
زمانے بھر کے داناؤں کی نادانی نہیں جاتی

شبِ مہتاب میں جیسے کوئی سنسان بستی ہو
دلِ ویراں کی اب تک جلوہ سامانی نہیں جاتی

جبینِ زُہد کا سرمایہ ہے داغِ ریا جب تک —
متاعِ داغِ دل کی قدر پہچانی نہیں جاتی

نجانے کس گھڑی کوئی رہا کرنے کو آ پہنچے
قفس میں ہیں مگر مشقِ پَر افشانی نہیں جاتی

مری تقدیر اِسی کو دیکھ کر شاید بدل جائے
مری تدبیر کی سر در گریبانی نہیں جاتی

نئی راہیں نکالیں عشق نے عرضِ تمنا کی
بہ آہنگِ غزل میری گل افشانی نہیں جاتی

فیض احمد فیضؔ

شاہراہ

اک افسردہ شاہراہ ہے دراز
دُور اُفق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
سرمگیں حُسن کو بچھائے ہوئے
جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں پلنگ پہ محوِ خیال
وصلِ محبوب کے تصوّر میں،
مُو بہ مُو چُور، عُضو عُضو نڈھال،

یوسف ظفر

قیدی

کوئی زنجیرِ گراں قید نہیں کر سکتی
سنگ و آہن کی بنائی ہوئی کوئی دیوار
تجھ کو آغوش میں تا دیر نہیں رکھ سکتی ——
تیری فریاد ہے زنجیرِ گراں کی فریاد،
تیری دیوار میں پتھر کی نہیں سنگینی
تیرے دروازے میں لوہے کی سلاخیں ہیں کہاں
ایک آلودۂ اوہام طلسمِ جامد
تجھ کو پابند کیے دیتا ہے —— تو قید نہیں،
تو ہے آزاد —— کہ آزادِ شب و روز ہے تو ——

یوں تو پابند ہیں ہر حال میں اہلِ بینش،
آدمی کے لئے کیا قیدِ عناصر کم ہے ؟،
ایک ہی گردشِ ایام کے سب قیدی ہیں،
سانس بھی حلقۂ زنجیر سے کچھ کم تو نہیں !
زندگی دیدۂ بینا کو ہے اک حبسِ دوام ——
تو نے زنجیرِ تخیل کی سُنی ہے جھنکار،

تیری زنجیر کی آواز سے کچھ کم تو نہیں! ——
تیری تنہائی شب و روز کا پیمانہ ہے ——
آنکھیں سِل سکتی ہیں لب بند بھی ہو سکتے ہیں
پر تجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا!
تو ہے آزاد کہ آزادِ شب و روز ہے تو

مسکرا! جیل کی دیواروں میں رہنے والے
تو ہے آزاد —— ذرا سوچ کہ آزاد ہے تو
تیری دیوار تو پتھر کی ہے، سنگیں دیوار
جو مرے سامنے اِک سایۂ بے معنی ہے!
لیکن افکار کی دیوار ہے میری دیوار
جس کو میرے ہی تخیل نے بنایا ہے مگر
کوئی طاقت اُسے مسمار نہیں کر سکتی ——

مسعود پرویز

میں کون!

کبھی غبار کبھی خاکِ رہ میسر لئے
میں یادگار رہوں اپنے جنونِ پیہم کی
مرے جہاں میں فقط میری حسرتوں کے مزار
ترس گئی ہے نظر صورتِ شجر کے لئے
سراغِ منزل دشوار و راہ سے کوسوں دُور
رہِ نجات سے بھٹکا ہوا کوئی راہی
میرا خیال تجھے گر نہیں نہ ہو میں کون!

نثار ہیں ترے بستر پہ چاندنی لہریں
ردائے نکہتِ گل پردہ دار ہے تیری
مئے شباب سے تر ہونٹ اور نشے میں چور
وہ مست آنکھیں نہاں جن کی تہ میں شبنمی خواب
کبھی میانِ گل و نسترن کبھی لبِ جو
ہیں عشوہ ساز حسینوں میں محفلیں تیری
مرا خیال تجھے گر نہیں نہ ہو میں کون!

احمد ندیم قاسمی

ماحول کے مارے

افراد

اقبال۔ ایک جذباتی نوجوان
بشیر۔ ایک عیاش نوجوان
فرخندہ۔ ایک نوجوان طوائف جس سے احساس کی دولت ابھی چھینی نہیں گئی

منظر

شفقِ شام سے لبریز ہے پیمانۂ دہر
سرخ پردوں میں ہے لپٹا ہوا لاہور کا شہر
قمقمے جاگ اٹھے مست شبستانوں میں،
کیف انگڑائیاں لیتے ہیں صنم خانوں میں
حسن و دولت کے تصادم کی گھڑی آئی ہے
شام اک حشر سا دامن میں چھپا لائی ہے
ایک گھر پر مگر اب تک ہے خموشی طاری
کوئی لڑکی نظر آتی ہے وہاں بے چاری
پتہ ہلتا ہے تو گھبرا کے سمٹ جاتی ہے
جھانک کر ایک دریچے سے پلٹ آتی ہے

فرخندہ

کھائے جاتی ہے مرے دل کو لپکتی ہوئی رات
جھلسے دیتی ہے مجھے اُف یہ بھڑکتی ہوئی رات
وہ نہ آئیں گے نہ آئیں گے نہ آئیں گے یہاں
اک شہنشاہ کہاں۔ کلبۂ تاریک کہاں
لیٹ جاؤں مگر اب نیند کسے آئے گی،
رات بھر ایک خلش سی مجھے تڑپائے گی
تڑپے جاؤں گی ــــ تڑپنا ہے محبت کا نصیب
ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے مرے دل کے قریب
اب نہ آئے تو مرے پاس وہ کب آئیں گے
آنکھیں مُند جائیں گی جب میری وہ تب آئیں گے
وہ اب آئیں کہ جب آئیں مگر آئیں تو سہی
میری اجڑی ہوئی کٹیا کو بسائیں تو سہی
یوں تو اس میرے گھروندے میں سبھی آتے ہیں
بڑھ کے لے لیتے ہیں گھر بار لٹا جاتے ہیں

میرے گالوں پہ ہیں بنے ہوئے ہونٹوں کے نشاں		میرے سینے پہ سلگتے ہوئے پنجے ہیں رواں
میرے عارض کے شگوفے تو بہت سستے ہیں		پر مرے دل میں وہی ۔۔ صرف وہی بستے ہیں
آؤ بھی ۔۔ آؤ بھی آجان ۔۔ اب آ بھی جاؤ

(اچانک بشیر اندر داخل ہو کر کہتا ہے)

میری فرخندہ! مرے ہوتے نہ یوں گھبرا اُو

فرخندہ

کون؟

بشیر

ایک دو رس بھرے بوسوں کا خریدار بشیر

فرخندہ۔ (زیرلب)

پھیر دی تم نے مرے گیت پہ کالی سی لکیر

(بلند آواز میں)

جاؤ جاؤ بھی مری آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ

بشیر

اپنے ہونٹوں کی سلگتی ہوئی مے برساؤ
ہو چکے ناز ۔۔ اِدھر آؤ۔ گلے لگ جاؤ		ایک بوسے کے لئے لعل و جواہر پاؤ

فرخندہ

ہائے رے۔ جاؤ بھی چھوڑو بھی نگوڑی باہیں

بشیر

میری پیاری! یہ تجارت کی نہیں ہیں راہیں
نقد سودا ہے۔ یہ لو۔ ہونٹوں کا پانی دے دو!		ایک لمحے کے لے اپنی جوانی دے دو

فرخندہ

کاٹ کھاؤں گی ترے کان۔ اڑا دوں گی ناک

بشیر

کر دیا کس نے تجھے چار دنوں میں چالاک
میں جب آتا تھا تو تُو مجھ سے لپٹ جاتی تھی ، میرے آغوش میں گرتی تھی۔ سمٹ جاتی تھی
آج کیا بات ہے ؟

فرخندہ

جاؤ بھی مرے کان نہ کھاؤ ، اپنی سانسوں کا تعفن نہ یہاں پھیلاؤ

بشیر

خیر جاتا ہوں طبیعت ہے تمہاری ناساز ، میں سمجھتا ہوں حسینوں کی حقارت کے راز
دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے اکثر تالی ، شاید اس وقت تری جیب نہیں ہے خالی

(بشیر چلا جاتا ہے)

فرخندہ

کتنا منہ پھٹ ہے ، کھلونے کی طرح کھیلتا ہے ، روز آتا ہے مرے سامنے ڈنڑ پیلتا ہے
لیکن اب تک وہ نہیں آئے ۔ نہیں آئیں گے ، ہاں اگر آئیں گے حیلہ کوئی گھڑ لائیں گے
کتنے بے لوث ہیں معصوم ہیں۔ اور پیارے ہیں ، میرے تاریک مقدر کے حسیں تارے ہیں

(اقبال دروازے تک آکر کہتا ہے)

میری فرخندہ۔ مری جان۔ مری زیست کے راز

فرخندہ

مرے اقبال کی ہے شہد سے میٹھی آواز
آؤ پر فرش پہ نرگس تو بچھانے دو مجھے ، خاک کے ذروں میں خوشبو تو بسانے دو مجھے
ہائے رے میں نے بلائیں تو ابھی لی ہی نہیں ، کلیاں گیندے کی نچھاور تو ابھی کی ہی نہیں
میرے سینے کے کنول اور مرے ہونٹوں کی شراب ، یہ مری روح میں بجتا ہوا سانسوں کا رباب
مرے گیسو۔ مری آنکھیں ، مری باہیں ، مرے گال ، مری امید ، مرے خواب ، مرے مست خیال
الغرض مری سلگتی ہوئی ہستی کے خمار ، آپ کی مست و فسوں ساز محبت کے نثار

اقبال

ہائے فرخندہ، مرے قلب کو ترساؤ نہیں اُف مری دُکھی ہوئی روح کو بہلاؤ نہیں
زہر کا گھونٹ پلا دو۔ مجھے مرجانے دو اِس جہاں سے مجھے خاموش گذر جانے دو

فرخندہ

ہائے کیا بات ہے افسردہ و مغموم ہیں آپ آپ بے داغ ہیں۔ بے لوث ہیں معصوم ہیں آپ
ہائے وہ کون ہے جو آپ کو دُکھ دیتا ہے اُس کو دُکھ دیتا ہے جو ہر کو سُکھ دیتا ہے!

اقبال

وہ مرا باپ ہے جس نے مری بیستانہ سنی پھول تو پھول ہیں، ننھی سی کلی بھی نہ چُنی
جس نے پھونکا مری دوشیزہ تمنا کا چمن جس نے ڈالا مری نوخیز امیدوں پہ کفن
جس نے اخلاق پہ احساس کو قربان کیا، مری معصوم جوانی کو پریشان کیا،
جس نے۔

فرخندہ

اقبال۔ مرے دل کے سہارے اقبال مرے پیارے مرے پیارے۔ مرے پیارے اقبال
اے مری رُوح مری میت۔ مرے پروانے تری آنکھوں میں نظر آتے ہیں کیوں ویرانے
جی میں جو بات ہے وہ مجھ کو بتاؤ للہ! مجھ پہ اوہام کے نشتر نہ چلاؤ للہ!

اقبال

ہائے فرخندہ۔ مرے راز سے آگاہ نہ ہو، دل نہیں سنگ ہے، جس دل میں تری چاہ نہ ہو
میں تری چاہ کو دل سے نہ نکالوں گا کبھی بُت کی صورت میں اِس احساس کو ڈھالوں گا کبھی
چاندنی رات میں جب کوئلیں چلّائیں گی سرمئی روح کی خلوت سے نکل آئیں گی
عمت بنائے ہوئے جب آئینگی اس بُت کے قریب اک حسیں گیت الاپیں گی باندازِ عجیب
اور لے آئیں گی گلہائے حسیں چُن چُن کر اُس کے قدموں میں بچھا جائینگی سردھن دھن کر
زیست جب بت کی عبادت میں گزر جائے گی، عدم آباد کے غاروں میں اتر جائے گی
تم مری یاد میں رو رو کے نہ آہیں بھرنا بس یہی اپنی جوانی کی عبادت کرنا

میرے مرقد پہ نہ آنا۔ نہ بہانا آنسو — میرے ماتم میں پریشان نہ کرنا گیسو!

فرخندہ

بھولے اقبال،

اقبال

نہ گھبراؤ مری فرخندہ! — کہ ہے مجبور مقدر کا کھلونا بندہ،

فرخندہ

استعاروں میں چھپاتے ہو کہانی اپنی — کیوں زبوں حال بنا تے ہو جوانی اپنی،
میرے سینے کے خزانے ہیں تمہارے اقبال — میں تمہاری ہوں مری آنکھوں کے تارے اقبال
یہ ، ھکتے ہوئے ، جلتے ہوئے تپتے ہوئے لب — یہ لرزتے ہوئے لب ' اُف ' یہ تڑپتے ہوئے لب
آتشیں مَس کے لئے آج ترستے نہ رہیں — رات بھر میرے حسیں نین برستے نہ رہیں
تم تو جذبات کے دھارے میں بہے جاتے ہو — جی میں جو آتی ہے بے لاگ کہے جاتے ہو
چھیڑ دیتے ہو میرے قلب کے ناسوروں کو — اور مجبور بنا جاتے ہو مجبوروں کو،
درد و اندوہ کے پرہول بگولے روکو، — غم کے دوزخ میں لپکتے ہوئے جھونے روکو
آندھیاں آئیں تو چھا جاتے ہیں عالم پہ غبار — اور ہو جاتے ہیں پرانوار جہاں ' تیرہ و تار
انگلیوں سے مری زلفوں میں ذرا شانہ کرو — گدگدی کرکے ہنساؤ' مجھے دیوانہ کرو
ہائیں! پلکوں پہ تمہاری یہ ستارے کیسے — اُف یہ اشکوں کے اُبلتے ہوئے دھارے کیسے
آخر اتنا تو بتاؤ، یہ تماشا کیا ہے؟ — بھیگی آنکھوں میں تڑپتا ہوا لاشا کیا ہے؟

اقبال

یہ مرے عشق کی ہے لاش، مری فرخندہ، — یہ مرے قلب کی ہے قاش، مری فرخندہ،

فرخندہ

کچھ کہو بھی، مرے ارماں کو پریشاں نہ کرو، — مری ہنستی ہوئی امید کو حیراں نہ کرو،
میری گلنار جوانی کا حسیں خواب ہو تم — کونسی بات ہے جس کے لئے بیتاب ہو تم!

اقبال

میری فرخندہ یہ بدذوق یہ بے رحم سماج — کر دیا جس نے کئی بستے گھروں کو تاراج
میری اور تیری محبت کو سمجھتا ہے گناہ، میرے احساس کے فردوس کو کرتا ہے تباہ
وہ یہ کہتا ہے کہ تو شاہد بازاری ہے اور جوانی تری رستی ہوئی بیماری ہے
وہ یہ کہتا ہے، محبت ہے تمہاری پستی یعنی اخلاق کا پھوڑا ہے تمہاری ہستی
اور میں کہتا ہوں کہ فردوس کی اک حور ہو تم پرتوِ قدس ہو تم، طور ہو تم۔ نور ہو تم

فرخندہ

یعنی،

اقبال

ابّا نے مجھے پھر سے ستایا ہے بہت اور تمسخر مری حالت کا اڑایا ہے بہت
وہ یہ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوں نادان ہوں میں یعنی ناحق غمِ الفت میں پریشان ہوں میں
وہ تو اب ہیں مری شادی بھی رچانے والے ایک لڑکی ہیں مرے پہلو میں لانے والے
خوبصورت بھی ہے، پیاری بھی ہے معصوم بھی ہے اس کی پاکیزہ جوانی کی بہت دھوم بھی ہے
زر کا انبار بھی ہے، اور جوانی بھی ہے کھیت بھی فصل بھی ہے کھیت کا پانی بھی ہے
ساتھ ہی آبا نے یہ کہہ کے مجھے ڈانٹا ہے پھول کب ہے تری فرخندہ حسیں کانٹا ہے
"تو اگر پھر بھی گیا اس کے شبستانوں میں تجھے دھتکار کے چھوڑ آؤں گا ویرانوں میں"

فرخندہ

مرے اقبال - محبت کا مقدر ہے یہی، باوجود اس کے محبت تو پنپتی ہی رہی،
میرا تجھے کا فسانہ ہے سہارا اپنا، چھن گئیں شمعیں تو چمکائیں گے تارا اپنا
قلب گھٹتا ہے بہت شہر کے ہنگاموں میں روح مدت سے گرفتار ہے ان داموں میں
ہم بہت دور، بہت دور نکل جائیں گے ڈگمگاتے پاؤں کہیں جا کے سنبھل جائیں گے
ایک بے نام جزیرے کو کریں گے آباد معبدِ عشق کی رکھیں گے وہاں پر بنیاد

اتنے سجدے ترے قدموں میں کروں گی پیارے — قہقہے مار کے ناچیں گے افق پر تارے
اور چھا جائیں گی جب کالی گھٹائیں ہر سو — اور چھڑکیں گی جزیرے پہ حنا کی خوشبو
میں ترے پاؤں کو سہلاؤں گی اور گاؤں گی — اور سر رکھ کے تری باہوں پہ سو جاؤں گی

اقبال

میری پیاری۔ مری جذبات زدہ فرخندہ! — مری معصوم خیالات زدہ فرخندہ!

فرخندہ

یہ تری روح کا تنوّر، یہ بے رحم سماج — کر سکے گا نہ وہاں عشق کی دنیا تاراج

اقبال

لیکن اقبال تو مجبور ہے اے راحتِ جاں

فرخندہ

مرے اقبال محبت کے وہ پیماں ہیں کہاں

اقبال

گو تری چشمِ فسوں ساز کا بیمار رہوں میں، — تو کہے مجھ کو تو مرنے پہ بھی تیار رہوں میں
لیکن افسوس کہ مجبور رہوں لاچار رہوں میں — اپنے ماحول کے نرغے میں گرفتار رہوں میں،

فرخندہ

تیرا ماحول تری روح کا آئینہ ہے، — جھوٹ تو مرد کی اک عادتِ دیرینہ ہے،
سبز باغ آہ مجھے تو نے دکھائے کیا کیا، — شدتِ شوق کے افسانے سنائے کیا کیا
اُف مری راکھ میں جو ایک شرر زندہ تھا، — جس کی تابش سے مرا دل ابھی تابندہ تھا
تو نے اُس نور کو چٹکی میں مسل ڈالا ہے، — تو نے احساس کی کلیوں کو کچل ڈالا ہے
تو نے اِک شمع کو منہس ہنس کے بجھا ڈالا ہے — تو نے اِک لعل کو مٹی میں گنوا ڈالا ہے
تو نے عورت کے کلیجے کو چبا ڈالا ہے — دل کے ایوان کو بے نور بنا ڈالا ہے

اقبال

میں اسی طرح تری شمع کا پروانہ ہوں   میں اسی طرح ترے حُسن کا دیوانہ ہوں

فرخندہ

دیکھ اقبال بس اب جا۔ کہ ہے جی بے قابو   مرے مچلے ہوئے جذبات کا عفریت ہے تو!

(اقبال سرجھکائے چلا جاتا ہے)

فرخندہ

میں امیدوں کے جنازوں کو کہاں دفناؤں؟

(بشیر اچانک اندر آکر کہتا ہے)

مری فرخندہ۔ اجازت ہو تو میں آجاؤں،

(فرخندہ۔ زہرخند مسکراہٹ سے)

آمری جان۔ مری روح مرے پیارے بشیر   آج کس درجہ ہے فرخندہ تمہاری دلگیر
مجھے آغوش میں لے لو مجھے دل سے بھینچو   اپنے ہونٹوں سے یہ جلتی ہوئی کھیتی سینچو،
مجھ سے کھیلو مرے سینے سے لپٹ جاؤ تم،   ہر طرف بوسوں کی بوچھاڑ سی برساؤ تم،

(فرخندہ دیوانی سی ہوجاتی ہے۔ آنکھیں پھٹی
پڑتی ہیں۔ سانس آپس میں اُلجھ رہی ہیں)

یہ مرے بال ہیں۔ یہ گال ہیں۔ یہ سینہ ہے   تم سے روٹھوں تو یہ جینا بھی کوئی جینا ہے

(لڑکھڑا جاتی ہے)

میں تمہاری ہوں۔ تمہاری ہوں تمہاری ہوں بشیر

(مردہ سی بشیر کی آغوش میں گر پڑتی ہے)

بشیر

یہ تو اک نعش ہے! ہائے مری پھوٹی تقدیر!

غلام عباس

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زور شور پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور درد مند سمجھے جاتے تھے۔ نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔ ..... اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمائیے۔ کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے۔ جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے۔ بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگھار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُرمسرت گھر ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے ..... اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے۔ کہ ہمارے نونہالانِ قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اور جن کی آیندہ ترقی سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور قیاس چاہتا ہے۔ کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا انہی کے سر بندھے گا۔ انہیں بھی صبح شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کئے ہر راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سنان برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پُراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا ......!

اس موقع پر ایک رکن بلدیہ جو کسی زمانے میں مدرس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے۔ بول اٹھے،

"صاحبان واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبا کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رُکن نے جو رنگین چشمہ لگائے تھے۔ اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا: "حضرات ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اُٹھتی جارہی ہے۔ اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دَور دورہ ہوتا جارہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوکر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہوجاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے۔ اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے۔ اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقیماندہ عمر سستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں پھلتا پھولتا دیکھنے کے متمنی تھے۔ تقریر کرنے اُٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی۔ اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا۔ بولے: "صاحبان! رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عُشاق کی دھینگا مشتی۔ گالی گلوچ، شور و غل، ہا ہا ہا ہو ہو ہو سُن سُن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرّا گئی، اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکینِ بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اُس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکنِ بلدیہ نے جو پُرانی تہذیب کے علمبردار تھے۔ اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ تقریر کرتے ہوئے کہا: "حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب ہمارے اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گزرتے۔ اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدرِ بلدیہ تقریر کرنے اُٹھے۔ گو قد ٹھنگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے، مگر سر بڑا تھا۔ جس کی وجہ سے بُردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں صد درجہ متانت تھی۔ بولے: "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں۔ کہ اس طبقے کا وجود ہمارے شہر اور ہماری تہذیب و تمدن کے لئے باعثِ صد عار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا۔ کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے!"

ایک صاحب بول اُٹھے: "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی۔ تو صاحب صدر بولے: "حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے۔ کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں گھسنے نہ دیں گے۔ اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی"۔

اس پر ایک صاحب بولے "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں"۔

صدر نے کہا "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں"۔

یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا۔ اور بالآخر تمام اراکین کے اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیئے۔ اور انہیں رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دیدینا چاہیئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں۔ مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی۔ اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے۔ اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دیدی گئی۔ تاکہ اس عرصے میں وہ نئے مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا۔ وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی۔ اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کوئی بستی ہو گی۔ مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے۔ اور دن دہاڑے اُلّو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے۔ یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے۔ ورنہ عام طور پر اس شہرِ خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں۔ اور اپنے دولتمند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس

علاقے میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی۔ یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی اور یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے۔ اُن کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے۔ اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے بڑے عالیشان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے۔ اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا۔ اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایتیں دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔ مزدور ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور ایک ہنگامہ رہتا۔ اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے۔ اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا۔ جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اس کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا۔ اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی۔ دو ڈھائی سو راج مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے۔ اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی۔ اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگرٹ بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے۔ کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا۔ اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا

چبوترا بنا پیسے کے دو دو گھونٹ شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی۔ وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لایا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر "لے لو خربوزے! شہد سے میٹھے خربوزے!" کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچے میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے موجود ہوا اور اس بستی کے کاریگروں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزہ چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت معمار، بیلدار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا۔ اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں میں ایک ملا کے کان میں بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصبح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ کر آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا۔ اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا۔ تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھوس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈال جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر ادھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں۔ اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں۔ اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آ جاتے۔ اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے دور ہٹ کر ان کے گرد اگرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے۔ بے تکے قہقہے لگاتے۔ عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا۔ اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو وہاں اکیلے رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی۔ وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا۔ جو قرائن سے کسی بزرگ کی قبر معلوم ہوتی تھی۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن صبح کو بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے، چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا ہے اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا۔ اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اُسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا۔ تو کنوئیں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی و نیم فرزانگی کے عالم میں اُن سے کہنے لگا۔ "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا اُن کے مجاور رہتے [illegible] کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا۔ اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائینتی چراغ روشن کر دیئے گئے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے۔ کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی۔ جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگِ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے بنائے گئے تھے۔ اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے۔ جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لئے تھا۔ اس میں سنگِ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرشِ زمردیں پر پڑتے۔ تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگوں کے کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا۔ اور اُس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔ اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا۔ جسے اُس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیے لگا دیئے گئے۔ پاندان۔ پیکدان۔ حقے اور گلاب پاش رکھ دیئے گئے۔ اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا۔ جو اُن کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ اُن کے ساتھ بے شمار ملنے والے بھی آئے۔ جن کے لئے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا۔ اور اُن کے سامنے کے رخ

چھتیں ڈالی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندیل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے، عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے، ادھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھر رہے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پروں سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنینیں ٹھسکوں سے چلتیں، رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا۔ اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی۔ تو یہ بیسوائیں سازوسامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ جھاڑ فانوس، ظروف بلوری، قدِ آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہرے چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے۔ اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، وصلیاں لکھنے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور سہ پہر کو غسل خانوں میں نہانے جاتیں۔ جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگھار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلا۔ یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اُٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے۔ اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو بیل بوٹوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ اُن کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگھار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں۔ آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں ہنستیں کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں۔ تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی۔ تو ان کے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں۔ پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں سوار ہو کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود۔ ساز کے سُر۔ رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز، قلقلِ مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا۔ اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے۔ کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا۔ وہ وہی بڑھیا تھی۔ جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگریٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اُٹھا لائے۔ اور انہیں اوپر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگدار پانی بھر دیا گیا۔ تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں

پہنچا دیں۔ وہاں ملا جلا ۔ دو تین قسم کے سگرٹ کی تین تین چار چار ڈبیاں۔ بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیاسلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، چینے کے منبے، ناریل کی تین چار ٹکڑوں اور مرمری کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بیمار مسکین سا صورت اور نیم فرتوت جوگی سی قصائی۔ ماچیس میں کیا لی اور بیٹی میں ایک کبڑا آنے والے اس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا۔ اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ جو جب دکان خاصی چل نکلی۔ ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر جھولوں کے ہار۔ گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا۔ اور شام ہوتے ہی انہیں ٹوکری میں ڈال ایک ایک مکان پر جاتا۔ اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا۔ بلکہ ہر جگہ ایک آدھ گجرہ یا ہار کسی نہ کسی سے سب کی بابت لیتا۔ اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن ماس بیوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی میں کوٹھے پر چڑھ آتی۔ اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سارے بدن کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھٹنوں اُٹھنے کا نام نہ لیتا۔ سر دھنتا اور بیچے دولوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن بات زیادہ گزر جاتی۔ اور کوئی نازنین پیار سے اسے گلے میں ڈال لیتی۔ اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر اونچی آواز میں گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک میواکا مالک اور بھائی جوڑ کا کام جانتے تھے۔ بیچے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا۔ اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے لہریا دوپٹے [illegible] میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند [illegible] کہ اگلے [illegible] نے بس کی دکان سہر میں نہ چلتی تھی۔ بلکہ اُسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا [illegible] آباد ہوا [illegible] ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے پوڈر قسم قسم کے پوڈر ۔ ابن مکھیاں، بٹن سوئی دھاگے، ریبن، جھینے، خوشبودار تیل، رومال اور منجن کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے بسنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مہربانہ سلوک کی وجہ سے اس طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نجیہ ساز، کوئی نانبائی منڈے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرائے سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے۔ ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے مہرے اُٹھ آئے۔ اور اس بستی میں ایک دکان کرائے پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے چٹنی اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں سلیقے سے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کوٹھڑی کی اندرونی

جانب موڑ دی اور دن میں جو جگہ خالی تھی وہاں انہوں نے اپنے مخصوص الخاص مجربات کے اشتہار بڑیاہ وفتی سے جلی لکھوا کر دفتیوں پہ چپکا کر آویزاں کر دیئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے۔ اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور اسی ہی اور نسخہ جات مبحث و روح افزا شربت صندل، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں، اُن میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے۔ بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے، اور گھڑا اس پہ گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا، اُس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اسی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اُٹھ اُٹھ کر آ جاتے۔ اور دیر تک بت بنے بیٹھے سنا کرتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا ــ ــ ــ ــ ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اُسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی، سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا۔ اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے مُلا جی جب تک تو یہ بستی زیرِ تعمیر رہی، رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب چونکہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا باافراط پہنچنے لگا۔ تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد پڑھنے آنے لگے۔ جس سے مُلا جی کو روپے پیسے کی بھی آمدنی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجے کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے بڑھتے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رُخ کیا۔ اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلے پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیے۔ اس کے ایکٹر ایکٹری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پُرانے تھے، جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے، اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پُرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت مشقت کی کسر شور و غل، حرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے۔ بانسریاں اور الغوزے بجاتے۔ راہ چلتوں پہ آوازے کسے۔ گالی گلوچ بکتے۔ شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے۔ اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا، تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز

حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ کوئی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی۔ اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے۔ منہ سے ہارن بجاتے۔ اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا۔ تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا۔ اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبا ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پر اسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوئی تھیں۔ اب اس کی دن دوگنی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بے وقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمین خرید ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرائے پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں۔ اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اسی بستی کے وہ دکاندار آ بسے۔ جو عیال دار تھے۔ اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی۔ جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکخانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچہ میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا۔ جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا۔ کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیئے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی۔ اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا۔ کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک نیا سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی۔ کہ اس نے جھٹ ایک موقعہ کی جگہ چن کر خرید لی۔ اور جلد جلد تعمیر کا

کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا۔ تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں۔ تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ اس کے ساتھ بستی کے لوگ یونہی سستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آکر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیرگاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سستے کٹورا بجاتے اس باغیچہ میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے۔ کاندھے پر میلا کچیلا تولیا ڈالے، دل پسند دل بہار مالش کی صدا لگاتے، درد سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان، اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا۔ جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، دو نیواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دوا خانے کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں ملال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹوگرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا۔ اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے لے کر آ پہنچے اور ناپ ماپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالے لگے۔ اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج دو ہائی اسکول ایک لڑکوں کے لئے ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری سکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں۔ اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم سالے چھ یتیم خانے۔ پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں سے ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی یعنی بجائے "حسن آباد" کے "حسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حُسن اور حَسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد

اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اُجڑنے سے پہلے موسوم کی جاتی تھی۔ اور وہ نام ہے "آنندی"!

یوں تو سارا شہر بھرا پڑا صاف ستھرا اور خوش نما ہے مگر سب سے خوبصورت سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں ۔

آنندی کی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح اللسان مقرر تقریر کر رہے ہیں: "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی . . ."

اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا۔ وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

کرشن چندر

پرانے خدا

متھرا کے ایک طرف جمنا ہے، اور تین طرف مندر۔ اس حدود اربعے میں نائی، حلوائی، پانڈے، پجاری اور ہوٹل والے بستے ہیں۔ جمنا اپنا رُخ بدلتی رہتی ہے، نئے نئے عالیشان مندر بھی تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن متھرا کا حدود اربعہ وہی رہتا ہے، اس کی آبادی کی تشکیل اور نوعیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے پاتی سوائے ان دنوں کے جب جنم اشٹمی کا میلہ معلوم ہوتا ہے، اور کرشن جی کے بھگت اپنے بھگوان کا جنم دن منانے کے لئے ہندوستان کے چاروں کونوں سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان دنوں کرشن جی کے بھگت متھرا پر یلغار بول دیتے ہیں، مدراس سے، کراچی سے، رنگون سے، پشاور سے، ہر سمت سے ریل گاڑیاں آتی ہیں۔ اور متھرا کے اسٹیشن پر ہزاروں جاتری اُگل دیتی ہیں، جاتری سمندر کی لہروں کی طرح بڑھے چلے آتے ہیں اور مندروں، گھاٹوں، ہوٹلوں اور دھرم سالاؤں میں سما جاتے ہیں، متھرا میں کرشن بھگتوں کے استقبال کے لئے بیسیوں دن پہلے ہی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں، مندروں میں صفائی شروع ہوتی ہے۔ فرش دھلائے جاتے ہیں۔ کلسوں پر دھات پالش چڑھایا جاتا ہے، ہار، گجرے اور پھول سجائے جاتے ہیں دیواروں پر قلعی اور رنگ ہوتا ہے، دروازوں پر گل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ دکانیں رادھا کرشن جی کی مورتیوں سے سجائی جاتی ہیں، حلوائی پوری کچوری کے لئے بناسپتی گھی کے ٹین اکٹھے کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے کرائے دگنے بلکہ سہ گنے ہو جاتے ہیں، دھرم سالائیں چونکہ خیراتی ہوتی ہیں اس لئے ان کے منیجر ایک کمرے کے لئے صرف ایک روپیہ کرایہ وصول کرتے ہیں۔ کسان لوگ جو ان پرانی دھرم سالاؤں میں ٹھہرنے کی توفیق نہیں رکھتے، عموماً جمنا کے کسی گھاٹ پر ہی سو رہتے ہیں۔ گھاٹ چونکہ پختہ اینٹوں کے بنے ہوتے ہیں۔ اس لئے گھاٹ کے منتظم سونے والے جاتریوں سے ایک آنہ فی کس وصول کر لیتے ہیں، اور اس گھاٹ پر سونے کے لئے ایک آنے کا تاوان بہت کم ہے کنارِ جمنا، سر پر کدم کی چھتیاں، جمنا کی لہروں کی میٹھی میٹھی لوریاں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، تاروں بھرا آسمان اور مندروں کے چمکتے ہوئے کلس، جب جی چاہا سو رہے، جب جی چاہا اٹھ کر جمنا میں ڈبکیاں لگانے لگے، ایک آنے میں دو مزے، اس پر بھی بہت سے کسان لوگ گھاٹ کے غریب منتظموں کو ایک آنہ کرایہ بھی ادا کرنا نہیں چاہتے۔ اور گھاٹ پر سو کر، جمنا میں نہانے کے مزے مفت میں لوٹنا چاہتے ہیں، انسان کی فطری کمینگی . . . !

جنم اشٹمی سے دو روز پہلے میں متھرا میں آ پہنچا، متھرا کے بازار، گلیاں اور سڑکیں جاتریوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، لوگ مٹھائیاں کھا رہے تھے، پانڈے دکشنا لے رہے تھے، اور جاتریوں کے ریوڑوں کو مختلف مندروں میں داخل کر رہے تھے، ان جاتریوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا، کہ متھرا میں ہندوستان بھر کی بوڑھی عورتیں جمع ہو گئی ہیں، بوڑھی عورتیں مالا پھیرتی ہوئیں، اور ہاتھی

ٹیک کر چلتے ہوئے بوڑھے مرد۔ کھانستی ہوئی، گٹھیا کی ماری ہوئی، رعشہ براندام مخلوق جو یہاں اپنے گناہ بخشوانے کی امیدیں آتی تھی۔ جیتی بدصورتی یہاں میں نے ایک گھنٹے کے عرصے میں دیکھ لی، اتنی شاید میں اپنی ساری عمر میں بھی نہ دیکھ سکتا، متھرا کا یہ احسان میں قیامت تک نہیں بھول سکتا۔

متھرا پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے اپنے رہنے کے لئے جگہ تلاش کی، ہوٹل والوں نے بالکونیاں تک کرائے پر دے رکھی ہیں۔ اور ان کی کھڑکیوں، دروازوں اور بالکونیوں پر جا بجا جاتریوں کی گیلی دھوتیاں ہوا میں لہراتی دکھائی دیتی تھیں، دھرم شالائیں جاتریوں سے بھڑ کے چھتوں کی طرح بھری ہوئی تھیں، کوئی مندر بنگالیوں کے لئے وقف تھا، تو کوئی مدراسیوں کے لئے، کسی دھرم شالہ میں صرف بھودری برہمنوں کے لئے جگہ تھی تو کسی میں صرف کائستھ ٹھہر سکتے تھے، اس سرائے میں اگروالوں کو ترجیح دی جاتی تھی تو دوسری سرائے میں صرف اوتار کے ایسے لوگ ٹھہر سکتے تھے۔ ایک دھرم شالہ میں ایک کمرہ خالی بھی تھا، میں نے ہاتھ جوڑ کر پانڈے جی سے کہا "میں ہندو ہوں، دیکھئے ہاتھ پر میرا نام گُدا ہوا ہے، اگر آپ انگریزی نہیں پڑھ سکتے، تو چلئے بازار میں کسی سے پڑھوا لیجئے، غریب جاتری ہوں، اپنی دھرم شالہ میں جگہ دے دیجئے، آپ کا بڑا احسان ہوگا۔"

پانڈے جی کی آنکھیں غلافی تھیں اور رعونت سے سرخ، جنیو کا مقدس دھاگہ پیٹ پر لہرا رہا تھا۔ کمر میں رام نام کی دھوتی تھی، چند لمحوں تک بے جواب کھڑے مجھے گھورتے رہے، پھر گھگھیاتی ہوئی آواز میں جس میں پان کے چونے اور کتھے کے بلبلے سے اٹھتے معلوم ہوتے تھے، بولے "آپ کون ہو؟"

میں نے جھلا کر کہا "میں انسان ہوں، ہندو ہوں، کالا نادگا کر سے آیا ہوں۔"

"ہاں ہاں،" پانڈے جی نے اپنا بایاں ہاتھ گوتم بدھ کی طرح اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "ہم پوچھت ہیں آپ کون گوت ہو؟"

"گوت؟" میں نے رک کر کہا۔ "مجھے اپنی گوت تو یاد نہیں، بہرحال کوئی نہ کوئی گوت ضرور ہوگی، آپ مجھے فی الحال اسی دھرم شالہ میں رہنے کے لئے جگہ دیدیں میں گھر تار دے کر اپنی گوت منگوائے لیتا ہوں۔"

"نا بابا،" پانڈے جی نے پان کی پیک زور سے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا "ہم ایسو مانس کیسو راکھیں، نہ گوت نہ جات!"

یہ متھرا کے بازار [illegible] میں کچوریوں کی [illegible] کے [illegible] اور [illegible] کی گندگی [illegible] تمام ہوئی تھی، متھرا کی خاک جاتریوں کے قدموں میں تھی، ان کے کپڑوں میں تھی، ان کے سر کے بالوں میں، ناک کے نتھنوں میں [illegible] میرا دم گھٹا جا رہا تھا اور جاتری [illegible] کے [illegible] لگا رہے تھے، میرا سر گھوم رہا تھا، مجھے رہنے کے لئے ابھی تک کہیں جگہ نہ ملی تھی، ایک تمولی کی دکان پر میں نے ایک خوش پوش خوش شکل نوجوان کو دیکھا [illegible] پان کلّے میں دبائے [illegible]

آنکھوں سے اور چہرے سے ذہانت کے آثار نمایاں ہیں، میں نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔

"مسٹر! میں نے اُسے نہایت تلخ لہجے میں مخاطب ہو کر کہا: "کیا آپ مجھے جبل پور کے سوا یہاں کوئی اور ایسی جگہ بتا سکتے ہیں جہاں ایک الف اے ان، جو سندھی ہو، پنجابی ہو، کالا شاہ کاکو سے آیا ہو، اور جسے اپنی گرت کا بھی علم نہ ہو، میلے کے دنوں میں اپنا سر چھپا سکے؟"

نوجوان نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا، چند لمحوں کے لئے مجھے گھورتا رہا، پھر مسکرا کر کہنے لگا: "آپ پنجابی ہیں نا! اسی لئے آپ یہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں　　دراصل بات یہ ہے کہ ——— معاف کیجئے گا .　. پنجابی بڑے بدمعاش ہوتے ہیں، یہاں سے لڑکیاں اغوا کر کے لیجاتے ہیں!"

"اور ان لڑکیوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو اس طرح اغوا ہو جاتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ایک دُبلا پتلا آدمی جس کا قد بانس کی طرح لمبا تھا اور زنجیر جیسا گلا، گندم رنگ نوجوان کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ "بابو صاحب! آپ مہربانی ات کیوں کرنے میں ہچکچاتے ہیں، یہ تو پوتر نگری ہے، میں تو بمبئی تک گھوم آیا ہوں، وہاں بھی جا چکا ہوں، سرِ عام محفل میں کوئی گھسے؟" ایسے دو چار لوگ　ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے، میں نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا: "کیا آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟"

"جی ہاں!" گندم رنگ نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پنجاب سب سے آخر میں انگریزوں کی عملداری میں آیا۔ اور چھوٹی بچیوں کو جان سے مار ڈالنے کی رسم جو ہندوستان کے اور صوبوں میں بھی رائج تھی۔ پنجاب ہی میں سب سے آخر میں خلافِ قانون قرار دی گئی، انگریزوں کے آنے سے پہلے تو یہ لوگ اکثر لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔"

"اس سے کیا ہوا؟"

"ہوا یہ کہ یہاں مردوں اور عورتوں کا تناسب ۵ : ۱ ہو گیا، یعنی پانچ مرد اور ایک عورت، اب جناب یہاں چار پانچ جاہل جب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر عورت ایک دم چار پانچ خاوند کرلے جیسا کہ تبت میں ہوتا ہے، کیا آپ اس بات کی اجازت دیتے ہیں؟"

نوجوان ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "پنجاب میں لڑکیاں کم ہیں، پنجابیوں نے دوسرے صوبوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا، بنگال میں لڑکیاں زیادہ ہیں، وہاں لوگ ایک بیوی رکھتے ہیں۔ اور ایک داشتہ جو عموماً بیوہ ہوتی ہے، سندھی اور گجراتی مرد سمندر پار تجارت کے لئے جاتے ہیں اور اکثر گھروں سے کئی سال غائب رہتے ہیں، اسی لئے سندھ میں "اوم منڈلیاں" بنی ہیں اور گجرات میں "بکری کے دودھ اور برہمچریہ" کا پرچار ہوتا ہے، امر ایک ہے، نوعیت وہی ہے، اب آپ ہی بتایئے کہ شریف کون ہے اور بدمعاش کون؟ جو حقیقت ہے اس کا آپ سامنا نہیں کرنا چاہتے، اُلٹا پنجابیوں کو کوستے ہیں!"

نوجوان بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسا، پان گلے سے موری میں جا گرا، وہ میرے بازو میں بازو ڈال کر کہنے لگا: "آیئے، صاحب! میں آپ کو

اپنے گھر لئے چلتا ہوں!

تھوڑے ہی عرصے میں ہم ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن گئے، وہ ایک نوجوان وکیل تھا۔ ایک کامیاب وکیل، اُس کا ذہین چہرہ، فراخ ماتھا، اور مضبوط ٹھوڑی اُس کے عزم راسخ کی دلیل تھے، وہ مدراسی برہمن تھا۔ متھرا میں سب سے پہلے اُس کا دادا آیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے دادا کے کسی رشتے دار نے جو مدراس میں ایک مندر کا پجاری تھا کسی آدمی کو قتل کر دیا، ٹھاکر جی کو ایک پجاری کے گناہ کے بارے سے بچانے کے لئے میرے دوست کے دادے ایک رات کو مندر سے ٹھاکر جی کی مورتی کو اٹھا لیا۔ اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر مدراس چل دیا۔ سفر کرتے کرتے وہ متھرا آن پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس کی آتما کو سکون اصیب ہوا اور اس نے ٹھاکر جی کو ایک مندر میں استھاپت کر دیا۔ آج اُسی دادا کا پوتا میرے سامنے مندر کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اور میں اس کے گٹھے ہوئے جسم اور چہرے کے تیکھے نقوش میں اس بوڑھے برہمن کے عزم اور اعتقاد کی جھلک دیکھ رہا تھا جس کی تصویر اس کی بیٹھک میں آویزاں تھی۔

نہا دھو کر اور کھانے سے فارغ ہو کر ہم میلے کی سیر کو نکلے، جو گلی بازار سے وشرام گھاٹ کی طرف جاتی ہے، اس میں سینکڑوں نائی بیٹھے استروں سے جاتریوں کے سر مونڈھ رہے تھے، گول گول چکنے ہوئے مُنڈے ہوئے سر اُن سپید چھتریوں کی طرح دکھائی دیتے تھے جو برسات کے دنوں میں جو دکو دزمین پر اُگ آتی ہیں، جی چاہتا تھا کہ ان سپید سپید چھتریوں پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرا جائے! اتنے میں ایک نائی نے میری آنکھوں کے سامنے ایک چمکدار استرا لہرایا، اور مسکرا کر بولا "بابو جی سر منڈا لو، بڑا پُن ہو گا" میں نے اپنے دوست سے پوچھا "یہ جاتری لوگ سر کیوں منڈاتے ہیں" کہنے لگا۔ "دان پُن کرنے کی خاطر، یہ لوگ اپنے مرے ہوئے عزیزوں کی روحوں کے لئے دان پُن کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے سر منڈانا بہت ضروری ہے اور یہاں ایسا کون شخص ہو گا جس کا اب تک کوئی عزیز یا رشتے دار نہ مرا ہو" میں نے جواب دیا "میری چندیا پہلے ہی تھوڑے سے بال ہیں۔ بس انہیں حجام کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بال جو چندیا پر ہے اُن بالوں سے کہیں بہتر ہے جو حجام کی مٹھی میں ہوں۔ ہم لوگ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے وشرام گھاٹ پہنچ گئے، گھاٹ پر بہت سی کشتیاں کھڑی تھیں اور لوگ ان میں بیٹھ کر جمنا جی کی سیر کے لئے جا رہے تھے، ہم نے بھی ایک کشتی لی اور تین گھنٹے تک جمنا میں گھومتے رہے، جمنا کے کنارے پختہ گھاٹ بنے ہوئے تھے، کہیں کہیں مندروں اور دھرم شالاؤں کی چوٹیاں اور کدم کے درخت نظر آ جاتے۔ ایک جگہ دریا کے کنارے ایک پرانے شکستہ محل کے بلند کنگرے نظر آئے۔ استفسار پر میرے دوست نے بتایا کہ اسے کنس محل کہتے ہیں۔ میں نے کہا "تین چار سو سال سے زیادہ پرانا معلوم نہیں ہوتا" کہنے لگا، ہاں اسے کسی مرہٹہ سردار نے بنوایا تھا، اب ضعیف الاعتقاد لوگوں کو خوش کرنے کے لئے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اُسی کنس کا محل ہے جس کے ظلموں کا خاتمہ کرنے کے لئے بھگوان نے جنم لیا تھا، میں نے پوچھا "کس زمانے میں ظلم نہیں ہوتے؟" وہ ہنس کر بولا۔ اگر یہی پوچھنا تھا تو متھرا کیوں آئے۔ . وہ دیکھو ریل کا پُل! . متھرا میں سب سے زیادہ خوبصورت شے شاید یہی ریل کا پل ہے، مضبوط، جسیم، بلند۔ ریل گاڑی نہایت پُرشکوہ انداز میں جمنا کے سینے کے اوپر دندنا

ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ کرشن جی کے جنم دن کو جمنا فرطِ محبت سے اُمڈی چلی آئی تھی۔ اور جب تک اُس نے کرشن جی کے قدم نہ چھو لیے اُس کی لہروں کا طوفان ختم نہ ہوا۔ جمنا میں اب بھی طوفان آتے ہیں لیکن اُس کی لہروں کی بیتابی اس ریل گاڑی کے قدموں کو بھی نہیں چھو سکتی جو اس کی چھاتی پر دندناتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ جمنا کی سربلندی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے!

جب ہم واپس آئے تو سورج غروب ہو رہا تھا اور وشرام گھاٹ پر آرتی اُتاری جا رہی تھی، عورتیں، رادھے شیام، رادھے شیام گاتی ہوئی جمنا میں نہا رہی تھیں۔ سنکھ اور گھڑیال زور زور سے بج رہے تھے، جاترن چڑھاوا چڑھا رہے تھے۔ اور جمنا میں پھل اور پھول پھینک رہے تھے، پانڈے دکشنا سمیٹتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ آرتی اُتارتے جا رہے تھے۔ ایک پانڈے نے ایک غریب کسان کو گردن سے پکڑ کر گھاٹ سے باہر نکال دیا۔ کیونکہ کسان کے پاس دکشنا کے پیسے نہ تھے۔ شاید کسان سمجھتا تھا کہ بھگوان کی آرتی پیسوں کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ . . . وشرام گھاٹ کی پچھلی سیڑھیوں تک جمنا بہتی تھی، لیکن یہاں پانی کم تھا اور کیچڑ زیادہ تھا اور اس کیچڑ میں سیکڑوں چھوٹے موٹے کچھوے کلبلا رہے تھے اور مٹھائیاں اور پھل کھا رہے تھے، اُن کے ملائم مٹیالے جسم اُن جاتریوں کی ننگی کھوپڑیوں کی طرح نظر آتے تھے جن کے بال نائیوں نے مونڈ کر صاف کر دیئے تھے۔ رادھے کرشن، رادھے کرشن، جاتری چلا رہے تھے، تو ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے کسینوں میں بیٹھے ہوئے مٹی کے دیئے روشن کر کے اُنہیں جمنا کے سینے پر بہا رہے تھے۔ جمنا کے سینے پر ان گنت قسم کے سینکڑوں دیئے روشن ہو اُٹھے تھے ... ہم ساتھ تھوڑے مسرت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے، ہمارے بالکل قریب ہی ایک نوجوان لڑکی نے پیتل کے دو دیئے روشن کئے، اور انہیں جمنا کے حوالے کر دیا۔ دیر تک وہ وہاں کھڑی اپنے ہاتھ اپنے سینے سے لگائے اُن دیوں کی طرف دیکھتی رہی اور ہم اُس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں کی طرف دیکھتے رہے، اُس لڑکی کے ساتھ اُس کا خاوند نہ تھا، نہ وہ بیاہتا معلوم ہوتی تھی، پھر ان جھلملاتے ہوئے دیوں کی لَو کو کیوں اُس نے اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ یہ لرزتی ہوئی شمعِ محبت، لڑکی نے یکایک میرے دوست کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چلی گئی۔ میرے دوست کے لب بھینچے ہوئے تھے، رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، کیا جمنا میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ محبت کے دو کانپتے ہوئے شعلوں کو ہم آغوش ہو جانے دے، یہ دیواریں، یہ پانی کی دیواریں پیسے کی دیواریں، سماج، ذات پات اور گوت کی دیواریں ... ! میرا دل غیر معمولی طور پر اُداس ہو گیا۔ اور میں نے سوچا کہ میں کل متھرا سے ضرور کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ برندابن میں، یا شاید گوکل میں، جہاں کی سادہ اور پاک و صاف فضا میں میرے دل کو اطمینان نصیب ہوگا۔

برندابن میں بن کم تھا اور پکی گلیاں اور پکی سڑکیں زیادہ تھیں، برندابن کے عالیشان مندروں کی وسعت اور عظمت پر محلوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ راجہ مان سنگھ کا مندر، گوبند جی کا مندر، بسرا کا مندر یا ہر عمارت میں کرشن جی کی مورتی موجود تھی، ہر جگہ پانڈے موجود تھے، لیکن ایک بات میں برندابن متھرا سے بڑھا ہوا تھا، برندابن میں گائیڈ بھی موجود تھے! انگریزی بولنے والے پڑھے لکھے گائیڈ، پہلے لوگ مندروں میں بے کھٹکے چلے جایا کرتے تھے، اب جگہ جگہ ان نے گائیڈ روک لیتے تھے، خدا ہی بُرا کرے یعنی لیکن جدید تہذیب کے سارے لوازمات سے بہرہ ور، آخر نئی تہذیب بھی تو انہی کی بنائی ہوئی تھی۔

برندابن کے ایک مندر میں میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں سات آٹھ سو سادھو اور بیوائیں کھڑتالیں لئے ایک ساتھ گا رہے ہیں۔
ہرا دھے شیام رادھے شیام نفت رنث الفت انث۔۔ ناخواندگی، جہالت، اندھا اعتقاد، تہذیب اور طاقت کے ہزاروں برس اس رقت انگیز
نظارے میں مسحور رہتے، ہم ریسپشن ڈرائیور دن بھر اس مندر میں آتے تھے، اور بے شمار پڑھا جاتا تھا۔ سنا ہے کہ ان اندھے سادھوؤں
کو صبح شام دونوں وقت کھانا مل جاتا تھا اور ایک پیسہ دکشنا کا۔ مانی جوش پیدا ہوتا ہے ایک قسم کی ہمدردی پانے کی بجائے ... جاتا۔ ایک اور مندر میں بھی میں
نے ایسا ہی نظارہ دیکھا، فرق یہ تھا کہ یہاں اندھے سادھوؤں کے بجائے سینکڑوں بیوائیں عورتیں کرشن بھگوان کی استتی کر رہی تھیں۔ دن بھر
استتی کرنے کے بعد انہیں بھی وہی راس ملتا تھا جو اندھے سادھوؤں کے حصے میں آتا تھا یعنی دو وقت کا کھانا اور ایک پیسہ دکشنا کا۔ ان اندھے
سادھوؤں اور عورتوں کے سر منڈے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر مجھے ونسرام گھاٹ کے جاتری اور تماشے یکجا میں کھلا ملے ہوئے کچھ سے یاد آگئے۔ مذہب
نے مندروں میں بیٹریاں کھول رکھی تھیں اور بھگوان کو لوہے سے بھی زیادہ مضبوط سلاخوں کے اندر بند کر دیا تھا۔ ہر مندر میں ہر ایک جاتری کو ضرور
کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ بعض دفعہ تو ایک ہی مندر میں مختلف جگہوں پر دکشنا کا ریٹ مختلف تھا۔ سیڑھیوں کو چھونے کے لئے ایک آنہ، مندر کی چوکھٹ
تک آنے کے لئے دو آنے، مندر کا کواڑ اگر بند ہے تو ادا کر کے ایک روپیہ دے کر جاتری بند دروازے کو کھلوا کر بھگوان کے درشن کر سکتا تھا
لیکن ایک مندر ایسا بھی تھا جو سال میں صرف ایک بار کھلتا ہے اور کوئی بڑا سیٹھ ہی ان کا پوجن کر سکتا تھا۔ جب سو روپیہ ادا کر کے مندر کے
کواڑ کھول سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ... اس بات کا احساس مجھے ایسے مندروں ہی کو دیکھ کر ہوا۔

گوکل میں جب ... رست پڑ گئی تھی۔ ... مارواڑ سے کرشن بھگوان کے درشن کرنے کو آئی تھیں۔ ریلوں میں ان کی
بھینٹ ایک سادھو بابا سے ہو گئی۔ انہوں نے اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسا لیا اور گوبردھن کی یاترا کرتے کرتے انہیں مختلف مندروں میں لیے پھرے
اور جب یہ مارواڑنیں گوکل میں ماکھن چور کرشن کا گھر دیکھنے آئیں تو یہ مہاتما بھی ان کے ہمراہ ہو لیے۔ عورتیں جب یہ اشنان کر رہی تھیں اور
سادھو کنارے پر ان کے زیور، نقدی اور کپڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ جب عورتیں نہا دھو کر گھاٹ سے باہر نکلیں تو مہاتما جی غائب تھے۔ عورتیں سر
پیٹنے لگیں۔ کرشن جی اگر ماکھن چرا سکتے تھے تو سادھو مہاتما نے ان کے زیور چرا لئے تو کون سا برا کام کیا۔ لیکن مہاتما کی یہ تکنیک ان بے وقوف
عورتوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور وہ جمنا کے کنارے بیٹھی دہائی دے رہی تھیں۔ بہت سے لوگ ان کے آس پاس کھڑے تھے اور
طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

"جی بڑا ظلم ہوا ہے ان غریب عورتوں کے ساتھ"
"بھلا یہ گھر سے زیور پہن کر ہی کیوں آئیں؟"
"اپنی امارت دکھانا چاہتی تھیں۔ اب رونا کس بات کا ہے"

ابھی صاحب شکر کیجیے ان کی جان بچ گئی۔ اب کل ہی متھرا میں ایک حادثہ ہوا ہے، ایک جوان اور اس کی بیوی کو اپنے گھر لے جا کر قتل کر دیا۔ جوان کا نیا نیا بیاہ ہوا تھا۔ بیوی کے پاس ساٹھ ستر ہزار کا زیور تھا کسی مدراسی جاگیردار کا لڑکا تھا، لڑکی مالدار کی تھی .. اُس کے باپ کو پولیس نے مار دیا ہے، خیال تو کیجیے کیسا اندھیر مچ رہا ہے۔ اس پورے نگری میں
متھرا میں لوگ سے نیادی!

بہت رات گئے میں اور میرا دوست جمنا کے اُس پار کھیتوں میں گھومتے رہے، جنم اشٹمی کی رات تھی۔ پھوس کے جھونپڑوں میں جہاں غریب مرد اور کسان رہتے تھے، مٹی کے دیئے روشن تھے، اور جمنا کے دوسرے کنارے مکانوں پر بجلی کے قمقمے روشن تھے اور برہمنوں کے بھجنوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ جھونپڑوں کے باہر مریل سی فاقہ زدہ گائیں بندھی تھیں۔ اور نیم برہنہ لڑکے خاک میں کھیل رہے تھے۔ کنوئیں کی جگت پر ایک بڑھیا عورت آہستہ آہستہ ڈول کھینچ رہی تھی۔ دو بڑی بڑی گاگریں اس کے پاس پڑی تھیں۔ کنوئیں سے آگے آم کے درختوں کی قطار تھی جو بہت دور تک پھیلی ہوئی چلی گئی تھی۔ آم کے درخت اور آملے کے پیڑ اور کھرنی کے درخت چپ چاپ کھڑے رہے، یہاں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا میں ایک ہلکی اداس سی خوشبو تھی اور ستاروں کی روشنی اتنی ... سپیدی کے جیسے ... دھلی ہوئی تھی۔ جیسے یہ روشنی کھل کر پھیلنا چاہتی ہے۔ لیکن شام کی اُداسی ... کر رہ جاتی ہے۔

میرے دوست نے آہستہ سے کہا۔ میں اور وہ کئی بار اس کھرنی کے درختوں کے سایوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے گھومتے رہے ہیں۔ کتنی ہی جنم اشٹمیاں اس طرح گزر گئیں۔ اور آج .. !"

میں خاموش رہا۔

"چند دن ہوئے" میرا دوست کہہ رہا تھا "مجھے قتل کے ایک مقدمے میں پیش ہونا پڑا۔ قاتل کو مقتول کی بیوی سے محبت تھی۔ اور جب اُسے پھانسی کا حکم سنایا گیا تو قاتل کسان نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا، اُن نگاہوں کی وارفتگی اور کشش ابھی تک میرے دل میں تیر کی طرح چبھی جاتی ہے۔

وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے، سالہا سال ایک دوسرے سے پیار کرتے رہے، پھر لڑکی کے ماں باپ نے اُس کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی یہ جاہل لوگ محبت کے رشتے کس لئے جلاتے ہیں؟ یہ جو کراب ہی عشق اور محبت کے گلے پر کس طرح چھری چلاتے ہیں۔ وہ کسان عورت ... جانتے ہیں تم!"

میں نے کہا "تم بھی ... وہ تو کرشن سے عشق تھا لیکن رادھا اور کرشن کے درمیان بادشاہت کی دیوار آ گئی"

اس نے کہا "شاید تم ٹھیک کہتے ہو ... تھا اور کرشن کی محبت کا انجام معلوم نہیں ہے"

نہیں، وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر آہستہ سے کہنے لگا ۔ ۔

۔ ۔ ۔ کرشن جی نے برندابن کی گوپیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک بار پھر برندابن میں آئیں گے، اور ہر ایک گوپی کے گھر کا دروازہ تین بار کھٹکھٹائیں گے جس گھر میں روشنی ہوگی۔ اور جو گوپی دروازہ کھٹکھٹانے پر اُن کا خیر مقدم کرے گی وہ اُسی کے حق کو سچا جانیں گے ــــ اس بات کو کئی برس گزر گئے۔
ایک اندھیاری طوفانی رات میں جب بجلی کڑک رہی تھی اور بارش موسلا دھار برس رہی تھی کسی نے برندابن کے دوار کھٹکھٹانے شروع کئے۔ سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا اجنبی ہر ایک مکان پر تین بار دستک دیتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ ۔ ۔ لیکن سب مکانوں میں اندھیرا تھا سب لوگ سوئے پڑے تھے۔ کسی نے اُٹھ کر دروازہ نہ کھولا۔
اجنبی نا اُمید ہو کر واپس جانے والا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ دور ـــــ ایک جھونپڑے میں مٹی کا دیا جھلملا رہا ہے، وہ اُس جھونپڑے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھا لیکن اُسے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی۔ کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ جھونپڑے کے اندر دیئے کی روشنی کے سامنے رادھا بیٹھی تھی۔ اپنے محبوب کے انتظار میں، رادھا کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر لاتعداد جھریاں ۔ ۔ ۔
کرشن جی نے گھمبیر آواز میں کہا: رادھا، میں آگیا ہوں۔
لیکن رادھا خاموش بیٹھی رہی دیئے کی لو کی طرف تکتی ہوئی
رادھا میں آگیا ہوں۔ کرشن جی نے چلّا کر کہا۔
لیکن رادھا نے نہ کچھ دیکھا۔ نہ سنا۔ اپنے محبوب کی راہ تکتے تکتے اُس کی آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں اور کان بہرے
زندگی سے پرے، موت سے پرے، الفاظ سے پرے ۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرا دوست اپنی باہوں میں سر چھپا کر سسکیاں لینے لگا، جیسے کسی نے اُس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہو، جیسے پاگل عورت محبت کرنے کے جرم میں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دی گئی ہو ۔ ۔ ۔ وہ زرد لڑکی وشرام گھاٹ پر حسرت بھری نگاہوں سے متھرا کے مندروں کی طرف تک رہی تھی، اُس کی حیران پتلیاں میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگیں رادھے سادھو سر منڈاتے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے اور کٹورا ہاتھ میں کھاتے ہوئے گا رہے تھے۔ رادھے شیام رادھے شیام رادھے شیام لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ۔ ۔ ۔ پر اے خدا ابھی تک مندروں، بینکوں، فیکٹریوں اور کھیتوں پر قبضہ کئے بیٹھے تھے، وہ اپنے جونک سے لمبے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے، اُن کی ننگی توندوں پر جنیو لہرا رہے تھے اور وہ نہایت دھیمی سے اُن لاکھوں آوازوں کو سن رہے تھے جو فضا میں چاروں طرف شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں ۔

”۔ ۔ رادھے شیام ، رادھے شیام ۔ ۔ ۔“

رشید جہاں

نئی مصیبتیں

"مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ اون کیا بھاؤ ملا تھا؟" اماں نے بھابھی صغرا سے پوچھا جو میری چچا زاد بھاوج تھیں اور دو سال ہوئے بیوہ ہو گئی تھیں۔

"شاید بارہ روپیہ پاؤنڈ تھا۔ کیوں نہ اماں جان؟" وہ سر کے لئے اون کھول کھول کر گولے بنا رہی تھیں۔

"اُف اون اس سال کتنے مہنگے ہو گئے ہیں" صغرا کی جٹھانی عطیہ بولیں "بچوں کے سب سویٹر اُدھڑے ہوئے ہیں۔ اب مسز رائٹ کو اون لا کر دیا ہے کہ اُن کے سویٹر بُن دے۔ بڑی مشکل ہے"

"آپ کو کیا مشکل؟ بُننے گی تو بیچاری نرس ——" مجھ میں اور بھابھی عطیہ میں بالکل نند بھاوجوں کے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کو خوب سمجھتے تھے اور موقع پر بغیر چوٹ کے نہ رہتے تھے۔ بھابھی عطیہ کی زندگی میں علاوہ تین بچہ پیدا کرنے کے ایک کام اور بھی تھا کہ وہ سال میں دو تین جمپر اُدھیڑ اور بُن لیں اور پھر اُن کا پتہ [illegible]

"کیوں کیا میں نہیں بُنتی؟" بھابھی عطیہ نے چیخ کر کہا۔ میں جواب دینے کو تھی ہی کہ اماں نے میری طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے باتیں کرنے لگیں۔ تاکہ مجھ کو جواب کا موقع ہی نہ ملے اور حسب معمول صغرا کے میری اور بھابھی عطیہ کی [illegible] اماں کی صغرا نے بھی مدد دی اور کہنے لگیں "یہ تو ہے اون بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ اور مہنگی ہو [illegible] اماں جان بہت سا لے آؤں گی۔"

میری چچی اماں یعنی صغرا کی ساس آہستہ [illegible] کے ساتھ [illegible] سفید بال [illegible] رہی تھیں۔

"[illegible] چچی اماں [illegible] کس طرح صغرا کی بات سن کر اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے بولیں [illegible] کہاں ہے [illegible] ہیں اون رہا ہی کہاں ہے جو لے آؤ گی۔"

"کیوں ابھی [illegible] تو آپ دو دکان سے لے کر آئی ہیں۔ اور اب کیا [illegible] خالی ہو گئیں۔" چچا جان [illegible] کی ماں کو [illegible] تو کسے نہ جانے [illegible] تھے۔

چچی اماں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ میں نے کب کہا تھا؟ دکانیں خالی ہو گئیں!"

"تو پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" چچا جان نے کان پکڑ کر کہا۔ یہ کوئی نیا قصہ نہ تھا۔

جب صغرا بیاہی گئی تھیں تب بھی ساس سسر کی دست نگر تھیں اور اب تو اور بھی زیادہ۔ اُن کے اوپر روپیہ کا خرچ ہونا چچی اماں کو ہمیشہ سے ناگوار گذرتا تھا۔ اور صغرا چچا جان کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد تو وہ اُن کو بالکل ہاتھوں پر رکھتے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ اُون کیا اب کوئی خریدنے کی چیز رہ گئی ہے؟"

"تو پھر آپ نے کیوں خریدا؟ صغرا کل چلنا میرے ساتھ اور جو پسند آئے لے آنا۔ . ."

"ارے ہے بابا جان۔ ہنستے بھی دیکھئے میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اماں جان ٹھیک تو کہہ رہی ہیں کہ لڑائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔"

"بیچارہ بڑبڑاتے ہوئے کھانے کے لئے تیار ہونے چلے گئے۔ بس آنا مجھ میں آیا: خیر تم مت لینا۔ لیکن مجھ کو تو اُون چاہیئے۔ میں ضرور خریدوں گا۔ . ."

"میری تو ہر بات کو آپ یوں اُلٹا دیتے ہیں۔ . . لو میں نے کیا غلط کہا تھا کہ اُون اب ناپید ہو گیا ہے" چچی اماں نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا۔ کہ سننے والے کو ترس آ جائے۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ آج ہی صبح میں بھابھی عطیہ۔ اماں جان، چچی اماں سب مل کر سو روپیہ سے زیادہ کا اُون لے کر آئے تھے۔

"اُون ہی پر کیا ہے۔ ہر چیز اسی طرح اُجڑ گئی ہے۔" میری اماں نے بات کو رفع دفع کرنے کو کہا۔

"جی ہاں چچی جان ٹھیک ہے۔ اب جورجیٹ کے دام ہی دیکھ لیجئے۔ پچھلے سال میں نے ساڑھے تین روپیہ گز بہت اچھی جارجیٹ لی تھی۔ وہ اب پانچ روپیہ گز بھی نصیب نہیں۔ اب اس دفعہ میں نے اتنے تھوڑے کپڑے مسوری میں بنائے پہننے تک کو بھی نہیں ہیں۔"

"کم از کم آٹھ ساڑیاں تو تم نے ہمارے ہی سامنے خریدی ہوں گی۔ اور وہ کوٹ . . . . ." میں بیچ میں بولی۔

"علاوہ بھی کوئی ساڑیاں تھیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو ملاحظہ فرماؤ۔"

"نوکروں کی وردیاں ہر سال سو سوا سو میں بن جاتی تھیں۔ ان کو تو عادت ہے اندھا دھند اُٹھانے کی۔ نوکروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سال رہنے دو ابھی تو اچھی خاصی ہیں تو بگڑ گئے۔ کہیں نوکروں کو گندا نہیں رکھ سکتا۔ کبھی جو کوئی بات سن لیں" چچی اماں نے میٹھی شکایت کی۔

— تب یہ لوگ سب [illegible] صفائی کے [illegible] اس طرح [illegible]" اماں نے کہا۔

"ہاں بھلا بی اماں یہ جو [illegible] ہاں چل سکتے ہیں۔ اب گھر میں ایک آدمی [illegible] سب لوگ ایسے ہو جائیں تو۔" حرث بیچاری صغرا پر

سامنے کی ہماری چچی بس اپنے اوپر روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی خیال کرتی تھیں ساٹھ برس کی عمر ہونے پر بھی بہت شوقین تھیں اور باوجود بے شمار ساڑھیوں کے صبح ہی دو نئی ساڑھیاں خریدی تھیں۔ مجھ سے چھپ چھپ کے بیرہ رہ گیا ہیں سے کہا۔

"چچی اماں۔ آپ جو نئی ساڑھیاں لائی ہیں۔ وہ کتنے کی ہیں؟"

چچی اماں جن کو ابھی تک چچا جان پر غصہ آ رہا ہے کچھ نہ سمجھیں اور بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں "کیا بتاؤں بٹو کریپ ڈلشین کی قیمت تو گز روپیہ زیادہ ہو گئی۔ ۲۲ روپیہ میں وہ ساڑھی ملی۔ لو بھلا اب کوئی کیا کپڑا پہن سکتا ہے سارے دوسری تو خیر شدلشی ملک تھا۔ ۱۷ روپیہ میں سستی ہی مل گئی ہیں۔ کہتی ہوں کہ آج کل وہ برا زمانہ آ گیا ہے کہ نہ کھانے کا ٹھیک رہا ہے اور نہ پہننے کا۔ بڑے مصیبت کے دن ہیں اور ابھی تو دیکھو کیا کیا ہونے والا ہے . . .

"آپ سچ کہتی ہیں اماں جان" بھابی عطیہ نے ٹھنڈا سانس لیکر دکھ بھری آواز میں کہا "یہ موئی لڑائی نہ معلوم کیسی ہے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ میرا تو سارا آرام چین اس کمبخت کی نذر ہو گیا ہے۔"

صغرا میری طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"کسی چیز کا بھی ٹھیک ہو . . . پٹرول کے دام ہیں کہ بڑھا کئے موا اور پھر بھی نایاب وہ تو کہو کہ تمہارے بھائی جان کے اس ٹوٹی پھوٹی پرانی سرکار کی موٹر پڑی تھی۔ اس چھکڑے کی پچاس روپیہ دے کر رجسٹر کروا لیا تو کہیں جاکر دو موٹروں کا تیل چوبیس گیلن نصیب ہوا۔ سچ مچ اس لڑائی میں تو پچھلی لڑائی سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت ہے!" چچی اماں قریب قریب رو دیں۔

"ہم نے تو اپنی موٹر بند ہی کر دی ہے۔ مجھ کو تو روز صبح سیر کرنے کی عادت برسوں سے ہے۔ میری صحت تو جب سے موٹروں کی قلت ہوئی ہے تب سے ہی ہو گئی" میری اماں نے صاد کی۔

"ہاں بہن تو میں بھی کہتی ہوں کہ یہ پیٹرول پر پابندی سرکار نے کیوں لگا دی اب دام دو روپیہ چار آنے گیلن تھے۔ چلو تین روپیہ کر دیتی۔ لیکن یہ بارہ اور چودہ گیلن کی قید نہ لگتی جس کے پاس دام ہوتے وہ خریدتا جس کے پاس نہ ہوتا وہ نہ خریدتا" بھابی عطیہ نے اس طرح جل کر کہا کہ جیسے گورنمنٹ کو خاص اُن سے دشمنی ہے۔

"پٹرول پر ہی کیا ہے اس لڑائی کی وجہ سے تو ہر چیز پر آفت آئی ہوئی ہے۔ لو بھلا سیب پونے دو روپیہ سیر ہیں۔ کیا سیب بھی یہ نگوڑے سپاہی کھا جاتے ہیں؟" میری اماں نے بہت ہی جلی بھنی آواز میں پوچھا۔

"اور بادام لے لو" چچی اماں نے کہا "۱۲ آنے درجن تو ہو گئے اور مرغی وہ بھی اب دو روپیہ تک ہو گئی۔ کوئی کھائے تو کیا کھائے۔ اور تو اور آج تمہارے سامنے ساری دکانیں دیکھ لیں۔ پرونس (Prunes) کہیں سے ہی نہیں ملا۔ پچھلے مہینے بیس روپیہ میں سات سیر کا ٹین مل تو گیا تھا۔ اب وہ بھی نہیں . . . فروٹ سیلیڈ بغیر پرونس کے بچے تو چکھتے بھی نہیں . . . . . ."

"جی ہاں گھر والوں کی بڑی مصیبت ہے!" عطیہ نے ساس کے ساتھ ہمدردی کی۔ "راشد تو برابر یہی کہتا آیا ہے کہ دادی اماں کا خانساماں بہت ہی اچھے چیز اسٹیکس (Cheese flakes) بناتا ہے۔ ہمارے خانساماں سے بھی اچھے ..."

"اب لاؤ میں کیا کروں مجھے بھی کوکنگ چیز (Cooking Cheese) تو ایسا غائب ہوا ہے کہ اب دکھائی ہی نہیں دیتا میں اس قسم کی دکان پر خود گئی۔ اور پتہ ہے کہ ہمیں سو سے ہی کے مول دام بتا دیں۔ ہمارے بچے کا دل بہت چاہ رہا ہے۔ لیکن وہ کہیں ہو تو ملے۔"

"ایک تکلیف ہو تو ذکر کیا جائے۔" ... میں ہاں ملائی۔

"ہائے ہائے۔ ہماری آگ ایک دم کہاں غائب ہو گئی۔" بھابی عطیہ نے شوں شوں کر کے ایک دم سے کہا۔

"ارے سچ ... اس کمبخت ... لکڑی پوری ڈالی اور ... ذرا اس کھڑکی کا بٹن تو دبانا ... چار چار تو ہیٹر ہیں اور پھر بھی بیٹھے سردی ... آج کل کوئلہ ... دو روپیہ من ہو گیا۔ بجلی ہی ... رہتی ہے۔ لے اور وہ تو کوئی خواب ہی ہو گیا۔"

"صغریٰ سے کہا ... ہم جانا دیکھو یہ سب کہاں غائب ہو گئے۔ ہماری جٹھانی کو سردی لگ رہی ہے۔" صغریٰ اون کو چھوڑ کر جلدی سے اٹھی ... میں بھی بھابی کے ساتھ ... آئی ہوں کہ ... ان کے پیچھے بھاگی۔

... میرے کان بج رہے تھے کہ میں اور بھابی برآمدے میں ہو کر باہر آ گئے ... معلوم ہوتا تھا کہ ... بھابی نے باہر نکل کر "واجد! واجد!" کہہ کر آواز دی اور ... سردی کے مارے ... گھس گیا ہوگا۔ جانا ہے کہ کھانے میں بھی آدھا گھنٹہ ہے۔ وہ شاگرد پیشہ کی طرف ... درخت کے نیچے ایک الاؤ نظر آیا۔ اور ہم شاگرد پیشہ میں جب داخل ہوئے تو وہاں پنچایت جڑی ہوئی تھی۔ ... اپنے بیوی بچوں کے ... اپنی ... کے جمی ہوئی تھی۔ واجد اور دوسرے خدمتگار بھی وہاں موجود تھے۔ مہتر بھی ایک ... میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی ... "اے چھوٹی دلہن ذرا ادھر آنا۔"

چھوٹی دلہن ذرا جھک کر آگ تاپنے لگیں۔ سب مرد اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"کیوں کیا ہے؟" صغریٰ نے پوچھا۔

"اے دلہن یہ لڑائی کب تک چلے گی؟"

"بہت دن۔" "کیوں؟"

"ہے رام ... سچی؟"

"ہاں ہاں سچ ہے۔ ابھی بہت دن چلے گی۔" صغریٰ نے لاپرواہی سے کہا۔

"تو ہم لوگ کیسے جئیں گے؟"

"پرسوں تک تو آٹا سات سیر کا تھا۔ آج چھ سیر کا ہے . . ."

"چھ سیر کا تو گیہوں ہے" ایک مزدور نوکر نے اطلاع دی۔

"ارے بیٹا سچ بتاؤ یہ مہنگائی کب ختم ہوگی؟ ہمارا اور ہمارے بچوں کا پیٹ کیسے بھر پائے گا" مالن میری طرف مخاطب ہوئی۔

"چنا بھی تو آٹھ سیر کا ہے"

"نا دلہن۔ تم تو ہر بات میں مذاق کر لیتی ہو۔ یہی بتاؤ اخبار میں کیا لکھا ہے؟" دھوبن نے بھابی کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا
"ارے کچھ کہہ تو رہی ہوں۔ مگر یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔" سب نے امید بھری نظر میری طرف پھیری جب میں چپ رہی

تو دھوبن بولی۔

"دلہن۔ سنا ہے کہ نوکروں میں چھٹنی ہوگی۔ کیا ٹھیک ہے؟"

"مجھے کیا معلوم"

وہ سب پیٹ اگانے چلا گیا۔ میں اور بھابی وہیں الاؤ پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم گھر کی طرف چلے راستہ میں بھابی نے دیکھا کہ ہم کچھ گرم نہیں پہنے ہیں۔ بولیں "ادئی ارے بند تم بھی خدا کی قسم ایک چلتی پھرتی آفت ہو بیمار پڑ گئیں تو ایک اور نئی مصیبت آ جائے گی"

میں ابھی تک نوکروں کے پریشان چہروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے "اور" پر زور دے کر بولی "یہ اور کیا آپ نے خوب کہی۔"

"بھابی منہیں۔ اور نہیں تو کیا۔ بھابی عطیہ کی جائیداد مہنگی ہوئی یہ کم مصیبت ہے۔ تمہاری اماں کی موٹر کی ہو خوری ہی۔ یہ کچھ کم مصیبت ہے۔ اور ہماری ساس کی بیماری کی دوائیں کا سامان ہی نہیں۔ نہ کوکنگ چیزیں ملتی ہیں۔ نہ ... بس . . . اور اس پر اگر تمہیں مونیا ہو گیا۔"

راجندر سنگھ بیدی

اغوا

"آلی .... آلی " دلاور سنگھ نے زور سے پکارا۔

آلی ــــ علی جُو، ہمارے ٹھیکے کا کشمیری مزدور تھا۔ منشی دلاور سنگھ کی آواز سُن کر علی جُو ایک پل کے لئے رُکا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ابھی تک لیموں کی طرح ترش تھیں اور علی جُو کی سُرخ، رگوں سے بھری ہوئی آنکھوں نے انہیں چکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ منشی جی کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر علی جُو نے نل کا رسہ تھام کر بقیہ چرخی کو گھومنے سے روک دیا۔ اور رجوا"با بلند آواز سے بولا" ہو سردار!

سردار خاموش اور کم گو آدمی تھا۔ آج اس کا خلاف معمول اونچی، پر جوش آواز سے پکارنے کا مطلب یہ تھا کہ کنسو اپنے آبائی گاؤں جنڈیالہ گورو سے واپس آگئی ہے۔ دراصل ٹھیکے پر کام بُدھ اور جمعرات کو اس لئے بھی سُست رہا کہ کنسو رائے صاحب، اپنے باپ کے ساتھ شہر سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد بنگلے کی فضا ایک ساکن اور گدلے پانی والے جوہڑ کی طرح ہو گئی تھی لیکن اب کنسو کے آتے ہی ہمیشہ کی طرح ٹھیکہ بٹ گیا ــــ دو حصوں میں ــــ کام کرنے والوں میں اور گھورنے والوں میں کام کرنے والے اس کی موجودگی میں زیادہ مستعدی سے کام کرتے تھے۔ اور نکموں کی کسر پوری کر دیتے تھے۔ مزدوروں کے سربراہ منشی جی تھے۔ ان کے چھوٹے سے دستے میں علی جُو، رحمان جُو، گنی دغنی، اور علیا وغیرہ شامل تھے اور یا پھر حتیٰ سا حتیٰ سا ــــ ال لے گا! حتیٰ سا کی رٹ لگانے والے بھتّن ــــ پُوربیّن! ان لوگوں کے جسم میں کنسو کو دیکھتے ہی بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ دوسری طرف گھورنے والوں میں مزدوروں اور کاریگروں کے علاوہ بابو قسم کے لوگ تھے جھوٹ کیوں کہوں۔ ان میں میں بھی شامل تھا اور ان دنوں ٹھیکے کی چھوٹی موٹی بک کیپنگ، کیا کرتا تھا۔ میرے ساتھ دلّال تھے، مختار تھے اور شیخ جی تھے۔

یہ شیخ جی ساٹھ کے تھے۔ لیکن تھے بڑے کائیاں۔ انہیں زلف پہ شب دیجور کی پھبتی سوجھا کرتی تھی۔ زندگی کو تو شیخ جی نے بس پی لیا تھا۔ لیکن بقول دلاور سنگھ ابھی "ٹھوٹھا" ہاتھ میں تھا۔ یعنی تھے کاسہ بدست۔ کئی مکمل اور نامکمل رومان اُنکے ذھن کی انتڑیوں میں تب محرقہ پیدا کر رہے تھے۔ شیخ جی عموماً بات یوں شروع کرتے" جب ہم جوان تھے .... "
اس کے بعد شیخ جی کی کوئی شنوائی نہ ہوتی۔ ہر ایک اپنی جوانی میں بدمست تھا۔ کم و بیش ہر ایک کی جوانی شیخ جی

کی رجعت پسند جوانی سے زیادہ رنگیں تھی۔ اور اُسے اُس پر بجا یا بیجا طور پر ناز تھا۔ چنانچہ جب ہم جوان تھے .. "کے ساتھ ہی ایک حلقۂ سا بچ جاتا۔

کبھی شیخ جی بھی جوان تھے ؟

پرانی ہو گئی اب شیخ جی کی جوانی ..

او بلے، بکتا کیوں اے . . لے چپ رہو بے ایمان گتّی !

. اور جب آوے گدھی پہ جوانی ..

قہ قہ قہ !!!

کنسو کو بھی شیخ جی سے بے حد عقیدت تھی۔ دراصل کنسو کو ٹھیکے کے ہر آدمی سے انس تھا۔ وُہ ایک پھرکی کی طرح گھومتی ہوئی آتی اور کاریگروں، مزدوروں کے اس حلقے میں گھومتی پھرتی، فقرے چست کرتی نکل جاتی۔ بڑی ہی جان تھی اس پھرکی میں، اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی بہت ہی طاقتور ہاتھ کی چٹکی نے اُسے گھما کر وقت اور مقام کی وسعتوں میں ہمیشہ ہمیشہ آوارہ رہنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اور یہ پھرکی اسی گت سے رہتی دنیا تک گھومتی رہے گی اور کبھی دم نہ لے گی ... آپ ابھی کنسو سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور مارے شرم کے اپنی علی جُو آنکھیں کنسو کے چہرے پر نہیں گاڑ سکتے۔ آپ برمے کمانچے سے ساگوان یا دیو دار میں سوراخ کئے جاتے ہیں اور پھونکیں مار مار کر برادے کو پرے اڑاتے رہتے ہیں۔ اسکے بعد آپ کا جی چاہتا ہے کہ ایک پل، ایک چھن اپنے حسین مخاطب کو دیکھ لیں۔ آپ ذرا گردن پھیرتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ کنسو غائب ہے۔ غائب! ہمارے ہاں ایک پہیلی ہے۔ یہ تھی، وُہ گئی۔ اس کا حل ہے نگاہ اور ظاہر ہے نگاہ کتنی تیز اور دُور رس ہوتی ہے جو دل وجود کو بھی چیر جاتی ہے اور جس سے آپ اپنا آپ بھی نہیں چھپا سکتے۔ ابھی وُہ یہاں برمے کمانچے اور ساگوانی برادے میں اُلجھی ہوئی ہے اور اگلے ہی لمحے وُہ اس جگہ پہنچ جاتی ہے۔ جہاں زمین اور آسمان ملتے دکھائی دیتے ہیں اور جہاں درختوں کے زمرّدیں طاؤس اس ملاپ کی خوشی میں پائل ڈالے، اپنے بھدے اور کریہہ پاؤں زمین کی گولائیوں میں چھپائے ناچتے نظر آتے ہیں۔ جہاں آپ کا جسم بھی جانا چاہتا ہے لیکن جا نہیں سکتا۔ کیونکہ جہاں سلطان خلوت کرتا ہے وہاں چشم نامحرم ہوتا ہے۔ جس جگہ جان پہنچتی ہے وہاں تن باریاب نہیں ہوتا۔ کاریگروں کی سہیلی کنسو بھی ایک پہیلی تھی۔ پلک جھپکنے میں وُہ اپنے خلوت خانوں میں گم ہو جاتی اور گنتی، وتی، علیا، علی جُو، اور صمئی سا، صمئی سا کا لاڈلشکر مُنہ اٹھا کر دیکھتا رہ جاتا۔ اگرچہ رائے صاحب نے اُسے بہت آزادی دے رکھی تھی پھر بھی، وُہ اپنی اس لاڈلی یہ تھی وُہ گئی، سے بہت، بہت نالاں تھے۔

اِن دنوں ماڈل ٹاؤن نیا نیا آباد ہوا تھا۔ قطعے بک چکے تھے لیکن تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہر خریدار
میں پہلے تم کو دو کا جذبہ تھا اور رائے صاحب نے پہل کی تھی۔ زیرِ تعمیر بنگلے کے ساتھ اس بلاک میں صرف ایک چھوٹی
سی کوٹھی تھی جس میں رائے صاحب شہر سے اُٹھ آئے تھے۔ کھلی آب و ہوا میں رہنے کا خیال آتے ہی رائے صاحب
کا شہر میں تعفن سے دم گھٹنے لگا۔ رائے صاحب اس کوٹھی میں بدھار کر بڑی بے صبری سے بنگلے میں پرویش کا
انتظار کر رہے تھے۔ جنگ کے لیے شہر کے رؤسا کی ایک لمبی چوڑی فہرست میں ہر روز ترامیم ہوتی تھیں۔ اِن دنوں کوبے
جاپان میں بھونچال آیا تھا اور رائے صاحب اس کی خبریں پڑھنے سے بہت گھبراتے تھے .... بس اسی کوٹھی
کے سوا دور تک کوئی مکان نہ تھا۔ کبھی ایک ایکڑ زمین میں تو بک لمبی ڈوب اُگ رہی تھی۔ مجھ سے ازلی مجرّد ٹھیکے پر ہی سو
جاتے تھے۔ شیخ جی بھی وہاں سویا کرتے۔ اِن کی بیوی وفات پا گئی تھیں شیخ اور شیخانی کی زندگی بھر نہیں بنی۔ کیونکہ شیخ جی
ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ شیخانی میری گردن کے نیچے بازو رکھ کر سویا کرتی تھی اور میں نے اس کی گردن کے نیچے کبھی بازو نہیں
رکھا تھا۔ پھر کنسو کو شیخانی کی وفاداری کے قصے سنایا کرتے تھے۔ کنسو ہر ایک کی دُکھتی رگ سے واقف تھی۔ شیخ جی سے
باتیں کرتی تو بیچاری شیخانی کے متعلق مجھ سے بات کرتی تو میری شادی کی ناممکن ممکنات پر اور میری ہوائی بیوی
کی شکل کے متعلق — جسے وہ بھابی کہہ کر میرے دل میں ہمیشہ ایک گدگدی پیدا کر دیا کرتی۔ اور علی جُو سے بات کرتی تو
کشمیر کے رومانی مناظر اور فردوں کی تجارت کے متعلق — علی جُو در حقیقت مزدور نہیں تھا۔ لیکن نامساعد حالات اور فردوں
کی تجارت کی تباہی نے اُسے اس کام کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ اب بھی جب کبھی بارش کے بعد فضا کے خاکی ذرات دھل جاتے
تو اُسے ماڈل ٹاؤن میں پہاڑ دکھائی دینے لگتے ..... اور کنسو جانتی تھی کہ ہر ایک کا چور دروازہ ہوتا ہے۔ اور وہ
اس چور دروازے سے بلا کسی آہٹ کے داخل ہو جاتی اور اندر سے سب کچھ لُوٹ کھسوٹ کر لے آتی۔ ہم تین چار
لوگوں کے سوا ڈیرے میں تین چار پوربیئے بھیّئے تھے۔ جو اپنی لگائیوں کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ انہوں نے عارضی
طور پر اینٹوں کی کئی بے ترتیب کوٹھڑیاں بنا ڈالی تھیں۔ اور ماڈل ٹاؤن کے اندر ایک اور ماڈل ٹاؤن آباد کر دیا
تھا۔ بلا کی عورتیں تھیں اُن کی لگائیں۔ کڑاکے کی سردی میں صرف ایک انگیا یا ایک معمولی سی صدری پہن لیتی تھیں۔
اور چالیس چالیس مکعب فٹ روڑی کوٹ ڈالتیں۔ اِن کا دُودھ بچے پیتے تھے، لہو ٹھیکیدار پیتا تھا اور ہڈیاں
خاوند چچوڑتے تھے۔

بھلا ہو ٹھیکیدار کا جس نے ہمیں ساگوانی برادہ تک جلانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اگرچہ آگ اِن دنوں
نیم کے بھاؤ بکتی تھی۔ بسنو سنگھ سردار نگھیلا رائے جی، پالا پوس نہ پالا ماگھ، پالا ٹھنڈی والے جی — یہ

کہاوت بھی شیخ جی سنایا کرتے تھے جس کا مطلب تھا کہ ٹھنڈک صرف ہوا سے پیدا ہوتی ہے کہیں دور چھٹانک چھٹانک کے اولے پڑے تھے۔ شیخ جی نے حجامت کے لئے شہر جانا ملتوی کر دیا اور لگے ابر آلود آسمان کی طرف تکنے اور سر پر ہاتھ پھیر کر، اللہ خیر کا وظیفہ پڑھنے۔ کوٹھی میں رائے صاحب کی بوری بسیس نے ناند کے ساتھ جسم رگڑ رگڑ کر جھول گرا دی تھی۔ شیخ جی جھول کو اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ ہمارے پاس آ لئے۔ آج انہوں نے ایک نئی چیز دریافت کر لی تھی اور وہ یہ کہ لاہور میں رہنے والے لوگ لاہور ہی میں لوگوں کو چٹھیاں ڈالتے ہیں۔ کتنا بڑا شہر ہے لاہور . . . .

شیخ جی کی اس دریافت پر مجھے بہت ہنسی آئی۔ لیکن میں بدستور حساب کتاب میں منہمک رہا اور شیخ جی کی ہستی کے متعلق سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد شیخ جی ڈھکتے ہوئے بڑا دے کے قریب آ گئے اور کچھوے کی طرح جھول میں سے گردن نکال کر بولے

"کنسو بہت ہی جوان ہو گئی ہے۔"

اب یہ بات بھی لاہور کے ایک بڑا شہر ہونے کی طرح ایک دریافت تھی لیکن کنسو کا نام سنتے ہی علی جُو رحمان جُو اور گنی وتی کے کان کھڑے ہو گئے۔ دراصل لاہور والی تمہید اسی بم کے گولے کے لئے تھی۔ لیکن تمہید اور حرف مطلب میں اتنی بے تعلقی تھی کہ لاہور کی چٹھیوں کے بعد بیوقوف طبقہ کے سب آدمی اِسے ضمنی بات سمجھ سکتے تھے۔

تین چار آدمیوں کو اکٹھے ہوتے دیکھ کر کاریگر بھی اڈے پر رک گئے اور اِدھر چلے آئے۔ دلاور سنگھ نے پھر نل پر بلانے کے لئے دُور سے پکارا ــ "آ لی . . . آ لی رحمے" اور اس کے بعد خشت درجہ اول کی تمام پرچیاں اٹھائے شیخ جی کو طنزیہ سلام جتانے خود بھی اِدھر چلا آیا۔ جمعدار رام آسرے نے بھی زندگی بھر نہ ٹوٹنے والے بیکانیری جوتے سرکائے اور قریب آ گیا۔ علی جُو نے اپنے کشادہ ہاتھ پاؤں پھیلا کر گدھ کی طرح ایک لمبی اور بے ڈھنگی سی قلانچ بھری اور گنی کو اپنے پروں کی لپیٹ میں لے لیا۔ گنی بولا پرے ہٹ ہاتو۔ علی جُو لفظ ہاتو سے بہت جلتا تھا کیونکہ ٹھیٹ پنجابی اصطلاح میں ہاتو بوجھ اٹھانے والے کشمیری کو کہا جاتا ہے۔ اور علی جُو کوئی لدّو جانور تھوڑے ہی تھا۔ علی جُو نہ تو مزدور تھا اور نہ ہی مالک۔ وُہ تو خوبصورت لفظوں میں لکھا ہوا ایک المیہ ڈراما تھا۔ جو فردوں کی تباہی پر ختم ہوتا تھا۔ علی جُو کا جسم ترکستانیوں کیطرح سڈول اور تنومند تھا۔ اِدھر پنجاب میں مختلف کام کر کے اس نے اچھے پیسے جمع کر لئے تھے! اور اب وُہ بارہ مولہ پہنچکر اپنی زندگی کا سفید حبشہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علی جُو نے گنی کو چٹخنی دی۔ مارنے والے نے مارا۔ سہنے والے نے سہہ لیا۔ بات جاری رہی جو مارنے اور سہنے سے زیادہ دلچسپ تھی۔ دلاور سنگھ بولا۔

"بدمعاش ہے سالی۔"

علیا بولا "جب ندا کا اتہ پتہ کسی کو بھی کوئی نہیں۔ کئی دفعہ تو بڑی ہی دیر سے گھر آتی ہے جب ہم شام کو گھر جاتے ہیں۔ تو اس کا تانگہ ہمیں ہر روز ملتا ہے۔"

"خبر نہیں کتنے یار رکھے ہوئے ہیں۔ اس چھوکری نے۔"

"مجھے تو بھاگتی دکھے۔"

"کس کے ساتھ دکھے بھاگتی؟"

"جو بھی کوئی لے جائے — بڑی آفت یہ آئی وی ہے۔"

اور سب نے مشترکہ طور پر فیصلہ کر لیا۔ کہ کنسو بھاگ جانا چاہتی ہے۔ سب اپنا اپنا تصوّر چمکانے لگے۔ شیخ نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور بولے "تم سب غلط کہتے ہو۔ وہ نہیں بھاگے گی۔ کم سے کم میرا تو سو بِسوے یہی خیال ہے۔"

کنسو کے طور اطوار سے تو مجھے بھی یہی شک ہوتا تھا۔ کہ وہ چلن کی اچھی نہیں اور اُسے کوئی بھی بھگا کر لے جا سکتا ہے۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو شیخ؟" میں نے مثا سوال کیا۔

"کم سے کم اِن دنوں تو اس کی باتوں سے مجھے کوئی شک نہیں ہوتا۔"

"کیسے؟"

"جانتا ہوں — بس کہہ جو دیا۔" شیخ نے سر ہلاتے ہوئے ایک بے معنی سا جواب دیا سُورج کی شعاعوں میں اس وقت تک شکنجبین کی سی مٹھاس پیدا ہو گئی تھی۔ اور علی جُو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیخ جی کے منہ کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ اور سوچ سکتا تھا۔ اتنی سی کیا ڈھنڈ ٹنگ رہی ہے شیخ کو سالا عنبس کی سی جھول پیٹ چلا آیا۔ گنتی اس وقت کچھووں کا شکاری معلوم ہوتا تھا شاید اس کا جی چاہتا تھا کہ جھول میں سے نکلی ہوئی گردن کو پکڑ کر مروڑ ڈالے کنسو سچ مچ تھوڑے ہی بھاگ چلی تھی۔ ذرا ایسی باتوں سے مزا ہی لے لیتے شیخ جی کی اس بے دلیل قطعیت — "بس کہہ جو دیا" پر مجھے بھی غصہ آ رہا تھا۔ ... کائیں، کائیں، کائیں آسمان کے آخری کوّے چھانگے مانگے کے جنگل کی طرف جا رہے تھے اور اپنے پیچھے آواز کی غیر مرئی لکیریں چھوڑتے جاتے تھے۔

"لے بُوبا" جمعدار رام آسرے کی بیوی رام دئی نے آواز دی۔ اور جب رام آسرے نہ ہلا تو اس نے ٹوکری کو ٹبّوں میں رکھ کر سر کے اِتو کو اس میں پھینک دیا۔ اور آپ کُولھے مٹکاتی ہوئی اپنے ماڈل ٹاؤن کی طرف چلی گئی۔ لاور سنگھ خشت درجہ اول کی پرچیوں کو میرے تختِ پوش کے صندوقچہ میں بند کر کے تالا لگاتے ہوئے بولا "آج شیخ جی نے

بھری تریاں دبعنگ، پی لی ہیں۔"

"ہنکا ہے ہے بڈھا تو" پوربیا بولا۔

عجب بات تھی۔ سب کنسو کا بھاگ جانا پسند کرتے تھے میں نے مزدوروں کی وکالت کرتے ہوئے کہا "بابا! ماں باوا کی اتنی بے پروائی رنگ تو لائے گی ہی۔ یہ جتنی کھُل کھیلنے والی چھوکریاں ہوتی ہیں۔ یہ سب بدماش ہوتی ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر میں شیخ جی کے تجربے کا قائل تھا۔ عموماً بڈھے لوگ لڑکیوں کو آزاد دیکھ کر اس قسم کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بڈھا اس کے برعکس باتیں کر رہا تھا۔ اور پھر اس نے اتنی قطعیت سے اعلان کیا۔ آخر جب ہم لوگوں نے مجبور کیا تو شیخ شروع ہوا۔ "دیکھو سردار، جب ہم جوان . . . ؛

کائیں کائیں۔ کائیں ۔۔ زمین کے آخری کوؤں نے شور مچا دیا اور گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے سندر سنگھ ترکھان نے اوزار بوری میں ڈالے اور ہوہو کہتا رام آسرے پر گر پڑا۔ رام آسرے کی بچاس گز لمبی پگڑی کھُل کر گلے میں جا پڑی۔ اس نے ترکھان کی پگڑی اچھال دی۔ سردار کا جُونڈا کھُل کر ہوا میں لہرانے لگا۔ . جلو گھر چلیں، شیخ پھر سے جوان ہو رہا ہے۔ راستہ چھوڑ دو ورنہ زخمی ہو جاؤ گے . آلی . . . آلی . . . علی خُوکی بے آواز ہنسی سے صرف ہنی . . . ہنی کی آوازیں آئیں اوے نہیں پڑیں گے شیخ جی بنا سِک حجامت بنوالیں۔ کوئی بولا اور سب اپنے اپنے چھانگے مانگے کو بدھ رہے۔

اس وقت اندھیرا میدان اور لومک بوٹی پر رینگ رہا تھا۔ دور ایروڈرام میں ایک ہوائی جہاز اترتا دکھائی دیا۔ اس کی دُم کا چمکتا ہوا نقطہ ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح تیزی سے زمین کی طرف آرہا تھا اس ٹوٹتے ہوئے ستارے کو دیکھ کر اندرونی ماڈل ٹاؤن سے رام دئی یا اُس کی کوئی بہن بولی . . . . . رام رام . . . . رام رام . . . . میں سوچنے لگا۔ آج مجھے شب بھر نیند نہیں آئے گی۔ آج باتوں باتوں میں ان سالوں نے کیا پٹاخہ چھوڑ دیا۔ کیا کنسو کی شکل اس کی ہوائی بھابی کی شکل سے تو نہیں ملتی؟ اور میری رگوں میں خون کا دورہ تیز ہو گیا۔ میں نے کہا۔ اب میں متواتر دُودھ نہیں پیا کروں گا۔ اس سے میرے جسم میں بہت ہی تندی آجاتی ہے۔ پھر مجھے ہنسی آنے لگی ہی ہی ہی . . . . . .

صبح اُٹھ کر میں نے پاجامہ بدلا۔ بہت گندہ ہو چکا تھا پاجامہ اور قمیص بھی میلی ہو رہی تھی۔ ابھی بمشکل دس ہی بجے ہونگے کہ کنسو پھر گھومتی پھرتی آئی اور شیخ جی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی پاکیزگی کی طرح سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ لیکن میں نے سوچا کہ اِن کپڑوں کے اندر سفیدی کی بجائے سُرخی ہے۔ گرم گرم لہو کی سُرخی کنسو کے بالوں اور دوپٹے کی متوازی لکیریں اپنی چمکتی ہوئی سیاہیوں اور سفیدیوں کے ساتھ بے پروایانہ انداز سے پشت کی پگ ڈنڈیوں اور شاہراہوں پر رواں دواں تھیں شیخ جی نے پُوچھا "جنڈیالے سے کب آئیں تھیں تم، بیٹی؟"

"کل ہی تو آئی تھی بابا ... " کنسو بولی "چند سال پہلے میں میرا چچا مر گیا تھا بابا بات سناؤں تمہیں اس چچا کی؟ بیچارہ اسٹیشن ماسٹر تھا"

شیخ جی نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میرا داماد سٹیشن ماسٹر ہے"

کنسو نے میری طرف دیکھا شیخ جی کے خلاف میری اور کنسو کی سازش تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا سونے کی گھڑی کا ڈبیا بہتر روپے آٹھ آنے ... ۔

کنسو نے کہا "میری بات تو سنو بابا"

بابا سننے لگا۔ ۔ "ساری عمر لاہور میں رہا بیچارہ وہیں کالجوں اسکولوں میں لڑکے پڑھتے تھے دو برس ہوئے چچی مر گئیں شیخانی کی طرح لیکن وہ بچوں کے ساتھ دل بہلا لیتے تھے۔ اس کے بعد تبدیلی ہو گئی۔ ستورکوٹ روڈ وہاں کوارٹر ملا تو اتنا بڑا کہ چار کنبے رہ جائیں رات کو مکان بھائیں بھائیں کرتا اس میں چاچا اکیلے ٹانگیں پسارے پڑے رہتے۔ لیکن وہ زندگی بھر اکیلے نہ رہے تھے۔ بڑے لڑکے کی شادی کے بعد بہو کو رونق کے لئے لے گئے۔ بھائی کو ستورکوٹ والوں نے سر پر اٹھا لیا۔ بڑے بابو کی بہو، بڑے بابو کی بہو۔ بہو کو آئے مہینہ بھی نہ ہو پایا تھا کہ بیٹے صاحب آ دھمکے ۔ اب ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی لہذا پھر تم جانتے ہو، روٹی کی کتنی تکلیف ہو جاتی ہے۔ بہو بھی اتاولی سی تھی ٹرنک وغیرہ اٹھوا چلی گئی چچا بہت روئے، بہت لڑے، خط میں لکھتے ہیں بیٹے کو ۔ بہو کے آجانے سے مجھے تمہاری ماں کے دن معلوم ہونے لگے تھے۔ وہی رونق وہی ..... لیکن؛ لیکن تمہارے ہاں تو کوئی بیٹا بھی نہیں ہے جس کی بہو تم لے آؤ"

شیخ جی بولے "بیٹا ۔ میں بھی زندگی بھر اکیلا نہیں رہا اب یہاں پلنگ پر ٹانگیں پسار کر سوتا ہوں تو ساری دنیا بھائیں بھائیں کرتی نظر آتی ہے شیخانی کے دم سے بڑی رونق تھی۔ وہ یوں غریب تھی لیکن نیت کی بہت امیر تھی شیخانی۔ یہ کون ہے؟ یہ داماد آرہا ہے۔ یہ کون ہے؟ اس کے چچیرے بھائی کی بی بی ہے یہ کون ہے؟ چالی کی بیوہ ہے ... ابھی چائے بن رہی ہے۔ ابھی اخروٹ منگوائے جا رہے ہیں۔ ابھی دھنئے نے چار لحاف تیار کر دئے ہیں۔ اور میں کماتا اور کھپتا مرجاتا اب میں کس کے لئے کماتا ہوں؟ کس کے لئے کھپتا ہوں؟ اب میرا کون ہے؟ ۔ ۔

اور شیخ جی کا گلا رندھ گیا میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا جو دکھ بھرے دل سے یہ کہے کہ اس سنسار میں میرا کون ہے اور پھر اس سے آگے کچھ کہہ پائے۔ اتنا بدنصیب کم ہی ہوتا ہے کوئی اگر ستورکوٹ میں اس کا کوئی نہ ہو تو لاہور میں ہوتا ہے۔ لاہور میں نہ ہو تو ماڈل ٹاؤن میں ...... لیکن شیخ جی کا تو چھلنگے مانگنے میں بھی کوئی نہ تھا۔

کنسو شیخ جی کو رلا کر ٹل گئی۔ اور میرے قریب آکر بولی "دراصل بات یہ ہے۔ میرا کوئی چچا وچا نہیں ہے"

دوماڈے کے پاس ابھی تک شیخ اپنی پگڑی کے شملے سے آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ میں نے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹ دیا اس کے بعد کنسو بولی۔ میں نے جنڈیالے میں بھابی پسند کر لی ہے میں نے کنسو کے تل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہاں! اس کے بائیں گال پر تل ہے سو وہ رات کو خواب میں میرا سب مال متاع لوٹ کر لے گئی۔ کنسو نے مجھ پر برادہ اچھال دیا۔ کوٹھی سے آواز آئی۔ کنسو! یہ کنسو کی نانی کی آواز تھی وہ ہمیشہ کنسو سے بے سود التجا کیا کرتی کہ کنسو اپنے دوپٹے سے سر ڈھانپے۔

اس کے بعد کنسو علی جُو کی طرف مخاطب ہوئی علی جُو اس وقت نل کے رسے کو چھوڑ رہا تھا۔ "ہو سردار!" اس نے منشی جی کو بلاتے ہوئے شکستہ پنجابی میں کہا۔ "اب کتنا چلا گیا اندر؟"

نل پندرہ فٹ کے قریب زمین میں جا چکا تھا۔ ۔۔لالہ بولا "ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ۔ زمین کچھ پتھریلی ہے۔ کڑا بہت محنت سے ٹوٹے گا۔"

زمین کے اندر سے بہت سے چھوٹے چھوٹے سفید پتھر باہر آ رہے تھے۔ علی جُو رسے کو کھینچتا تو اس کے پٹھے تن جاتے تھے کنسو بہت دلچسپی سے اُس کی باتیں سنتی رہی اور علی جُو کے تنومند جسم کو دیکھتی رہی۔ علی جُو اس وقت سورج کی پہلی کرنوں میں تمتما رہا تھا۔ نوزائیدہ بچے کی طرح وہ سر سے پاؤں تک خون کا ایک ننھا سا قطرہ دکھائی دیتا تھا۔ ٹوپی کے باہر اس کے بالوں کی سُرخ، گھنگھریالی اُون کے کنارے سنہری ہو رہے تھے۔ چھاتی پر اٹے ہوئے چیتھڑوں میں سے اس کا نصف تنا ہوا سینہ دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ کنسو نے بغلوں میں ہاتھ دے لئے اور دیکھتی رہی، دیکھتی رہی پھر علی جُو سے بولی

"رے ہاتو! ابارہ مولے کب جا رہے ہو؟"

"جد پیسے ہو جاندیس (جب پیسے ہو جائیں)"

"تو پیسے میں دے دیندیس (اور جو پیسے میں دے دوں تو)؟"

"ابھی ہوے چلا جاندیس (ابھی اسی وقت چلا جاؤں گا)"

علی جُو نے تو لفظ کا برا نہیں منایا۔ کنسو چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح آتی اور ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی ٹھیکہ ٹھٹا رہا۔ ہم بھی شیخ جی کے نقطۂ نگاہ کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے کنسو بہت آزاد لڑکی ہے۔ وہ یونہی ہر ایک سے ہنس کھیل لیتی ہے۔

اس وقت عمارت کھڑکیوں کی کارنس تک پہنچ چلی تھی۔ ہمارا عملہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ کارنسوں سے دو ردّے اوپر اٹھنے پر ایک خوش پوش نوجوان کسی الیکٹریشن کا بورڈ لے آیا۔ اور اُسے بلاک کے سامنے والی سڑک کے کنارے شیشم کی چھاؤں اور ارنڈ کے سامنے گاڑ دیا۔ اس پر لکھا تھا۔ "الیکٹرک انسٹالیشن بائی راج اینڈ کمپنی"۔ اس کے بعد تاروں کے گرر کھ دھندے، گٹھیاں اور سفید سفید کٹ آؤٹ آنے لگے۔

ایک دن پھر شیخ جی میرے پاس آئے۔ آج پھر انہوں نے سبینس کی جھول لپیٹ رکھی تھی۔ جب وُہ کبھی بہت رازدارانہ لہجے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ تو وُہ سبینس کی جھول لپیٹ لیتے تھے۔ میرے پاس آتے ہی بولے۔

"اب کنسو بھاگ جائے گی۔"

میں نے کہا "ہیں؟"

"تم نے کچھ تبدیلی دیکھی ہے؟"

میں سوچنے لگا میں نے کیا تبدیلی دیکھی ہے..... کیا تبدیلی؟

"کیا تبدیلی؟" میں نے شیخ سے پوچھا۔

"بس اب دیکھنا"

"بتاؤ تو"

"بس کہہ جو دیا لو دیکھنا"

"پھر بھی"

"بس کہہ جو دیا میں نے"

میں نے سٹپٹا کر زیادہ کرید نہ کی۔ دوپہر کو جب کنسو باہر نکلی تو وہ قدرے سہمی، شرمائی ہوئی تھی۔ یوں تو اس نے ہر ایک کے ساتھ باتیں کیں۔ لیکن آج ان میں اکھڑا پن سا تھا۔ ولاور سنگھ، شیخ جی، سندر سنگھ، علیا، گنّی، بجلی کے مستری سبھی کے ساتھ وُہ بولی۔ لیکن علی جُو کے پاس سے گذر گئی

شیخ نے کہا "تم نے دیکھا؟"

میں نے کہا "ہاں شیخ، میں نے دیکھا"

اس کے بعد ہم شام تک گھبرائے ہوئے اِدھر اُدھر پھرتے رہے شیخ جی اور میں آج کا دن مبارک تھا۔ آج علی جُو نے زمین کا پتھریلا کڑ توڑ ڈالا تھا اور نل زمین میں پانی تک چلا گیا تھا ملکے کے مستری نے کڑ ٹوٹنے کی خوشی میں بتاشے تقسیم کروائے .. علی جُو فارغ ہو چکا تھا۔ اور آج رات وُہ چلا جانا چاہتا تھا

شام کے قریب جب زمین کے کوے گھر جانے لگے تو ہمیں رائے صاحب کی تلاش ہوئی اسوقت اڈوں کی آڑ میں سے شیخ جی نے مجھے کچھ دکھلایا۔ "وُہ دیکھو .. " سامنے علی جُو کھڑا تھا۔ کوٹھی کا ایک دروازہ بالکل معمولی طور پر کھلا ہوا تھا اور کنسو علی جُو کیطرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی!

احمد علی

مارچ کی ایک رات

دل کی ویرانی بصیر کو کھائے جاتی تھی مکدّر ہو کے اس نے جگدیش سے کہا

"چلو کہیں چلیں۔"

گھر سے نکل کر دونوں محبت کی دکان دکان پھرنے لگے۔ بصیر اپنے دل کی ویرانی کرائے کی عورتوں کے آنچل میں چھپا رہا تھا اور اس کا دوست جگدیش ان بوسوں کے مزے لوٹ رہا تھا۔ جو سینکڑوں لبوں کے جھوٹے کئے ہوئے گالوں پر دیئے جاتے ہیں۔ جن کا بوسہ لینے کے بعد دیر تک محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہونٹ کسی بے جان شے سے مَس ہو گئے ہیں۔

لیکن دل کی ویرانی یہ کوفت کہ دنیا میں کوئی ایسی آنکھ نہیں ہے جو میرے انتظار میں ٹکٹکی باندھے کواڑوں کو تک رہی ہو۔ کبھی اس بات سے دور نہیں ہوتی اس میں شک نہیں کہ یہ زرخرید خوشی کی چند گھڑیاں دل کی ویرانی کو بھلا ضرور دیتی ہیں۔ مگر اس کو مٹا نہیں سکتیں وہ دل میں ایک میٹھے میٹھے درد کی طرح قائم رہتی ہے ایک ڈگڈگی کی طرح مسلسل۔

جب وُہ شہر کی اندھیری گلیوں میں جن کی ہر چیز پُر راز نظر آتی تھی۔ پہنچا تو کچھ دیر کے لئے اپنے دل کی چبھن کو بھول گیا۔ دنیا پر تاریکی کا غبار چھا چکا تھا۔ صرف ٹمٹماتے ستاروں کی مدھم روشنی نیند میں کھوئی ہوئی دنیا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُن تنگ اور گندی گلیوں میں جہاں نالیوں اور کوڑے کے ڈھیروں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ ان دونوں کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وُہ کوئی بڑا گناہ کر رہے تھے یا سماجی جرم۔ لیکن جب وُہ ایک چوڑی گلی میں داخل ہوئے تو حسن حنا کی مست کر دینے والی خوشبو سارے میں پھیل گئی۔ ابھی یہ دونوں اس سے لطف اندوز بھی نہ ہونے پائے تھے۔ کہ دلّال نے کہا۔

"حضور، اس طرف۔"

یہ لوگ ایک ٹوٹے ہوئے زینہ پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے ایک کھنڈر نما گھر میں داخل ہوئے جس کی چھتوں اور دیواروں سے مٹی جھڑ رہی تھی اندر گوبر اور سیل کی بُو سارے میں بسی ہوئی تھی ایک نیچے سے تنگ دالان میں ایک اندھی لالٹین جل رہی تھی جس کی مَری ہوئی روشنی میں وہاں کی تاریکی اور بھی پُر اسرار معلوم ہوتی تھی۔ آسمان پر مدھم تارے ٹمٹما رہے تھے اور افق پر درخت سیاہ سایوں کی طرح کھڑے تھے۔ اور یہ تمیز کرنی مشکل تھی۔ کہ کہاں درخت ختم ہوتے ہیں۔ اور کہاں آسمان شروع ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ اندر ایک ایسی بُو بسی ہوئی تھی۔ جو اُن ویران کھنڈروں میں ملتی ہے۔ جہاں انسانوں نے رہنا چھوڑ دیا ہو۔ اور اب

صرف گدھ اور بھوت بھٹکے جانور رات کو پناہ لیتے ہوں۔

وہاں کسی انسان کا پتہ نشان نہ تھا کہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی تاریک کونے سے بھوت پریت نکل کر اپنی سخت سخت انگلیوں سے گلا گھونٹ دیں گے مگر کھونٹی پر ایک کپڑا ٹنگا ہوا تھا جس کی سفیدی اور صفائی حیرت انگیز معلوم ہوتی تھی۔ شاید گھر بھر میں وہی ایک چیز صاف ستھری تھی۔ ورنہ وہاں کی دنیا ایسی بھیانک تھی جس کی راہ سے قدرت اپنی پرانی دھرانی چیزوں کو تباہی کے غار میں پھینک دیتی ہے۔

سر جھکا کے وہ ایک نیچے دروازہ سے کمرے میں گھسے یہاں بھی وہی گور اور ویرانی کی بو پھوٹ رہی تھی ایک لالٹین ایک کونے میں ٹمٹما رہی تھی۔ کمرے کے تاریک کونے میں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو شاید کسی اور کمرہ میں جاتا تھا کمرے کے روشن کونے میں ایک چارپائی پر تین انسانی صورتیں دفعتًا نظر آئیں چڑیلوں کی طرح آنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں شاید امید کی بھی کچھ جھلک تھی اس بات کی کہ آنے والوں میں سے کسی کے ہاتھ سے چاندی کا سکہ مل جائے لیکن ان میں سب سے زیادہ خوف کا اظہار تھا ایک ایسے خوف کا جو بکری کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتا ہے جب قصائی چھری لے کر اس کی طرف بڑھتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں ہیں بلکہ فکروں اور پریشانیوں نے انسانی روپ بدل لیا ہے۔ یا پھر وہ تباہ شدہ پرانے تمدن کی روحیں معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کے میلے چہرے سہمی ہوئی آنکھوں سے اُن کو تک رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے۔ ذرا ہماری طرف دیکھو کبھی ہم بھی انسان تھے کو اب نہیں رہے ہم بھی انسان کی گود میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے لیکن انسانوں ہی نے ہم سے انسانیت چھین لی۔ اب کیا پوچھتے ہو۔ ہم لاشوں سے بھی بدتر ہیں "

یہ منظر کچھ ایسا وحشت ناک اور تکلیف دہ تھا۔ کہ دونوں لوٹ پڑے اور چلنے کا ارادہ کیا۔ عورتیں فورًا سمجھ گئیں۔ کہ ہم پسند نہیں آئیں۔ ایک عورت بولی۔

"ذرا بیٹھئے تو کچھ دیر تو بیٹھ جائیے"

اُس کی آواز میں تلخی اور آنکھوں میں نفرت تھی۔ اور سب کے چہرے یہ کہتے معلوم ہوتے تھے۔

"ہم جانتے ہیں کہ ہم بدصورت ہیں۔ لیکن ذرا دیر کے لئے بیٹھ تو جاؤ۔ ہم بھی اکیلے ہیں۔ ہم بھی دل کی وحشت کے مارے ہوئے ہیں۔ ہم بھی کچھ تسلی کچھ محبت اور ترس کے بھوکے ہیں۔ ان چیزوں کی ہمیں تمہارے روپوں سے زیادہ ضرورت ہے۔ تم کو نفسانی خواہشات یہاں لائی ہیں لیکن اب کہ تم آ گئے ہو تو ہماری بدنصیبی کو جانے بغیر نہ جا سکو گے۔ تم اپنی خوشی کا سودا تو کہیں نہ کہیں سے کر ہی لو گے۔ لیکن ہم بھی تمہارے خیالوں اور خوابوں میں منڈلاتے رہیں گے ..."

اُن کے بیجان سُتے ہوئے چہرے کچھ ایسے مانوس معلوم ہوئے کہ ان دونوں کو یہ خیال گذرنے لگا۔ کہ وُہ ان کو پہلے بھی کبھی دیکھ چکے ہیں۔ ان سے مل چکے ہیں۔ وہاں بھی اسی درد و حسرت سے ان کو تک رہے تھے کہ کہیں یہ لوگ اور ان کے ساتھ کل کی روٹی کی امید بھی چلی نہ جائے۔ ...... ان میں سے ایک گدرائے بدن کی سانولی اور بھیک رُو تھی۔ لیکن اس کی سفید آنکھیں اس طرح جنبش کر رہی تھیں۔ جیسے اندھیری رات میں دریا میں بہتی ہوئی لاش۔ دوسری چھوٹی سی زرد اور بیمار شکل تھی۔۔ تیسری کا بس زیادہ تھا۔ اور خون کی کمی نے ساری رونق چوس لی تھی پہلی کی آنکھوں میں خوف اور حیرت تھی۔ دوسری ایسے طرز سے دیکھ رہی تھی۔ جو غربت اور بھوک سے پیدا ہوتا ہے تیسری کی آنکھوں میں تلخی تھی ایسی تلخی جو سانپ کے زہر سے بھی زیادہ تھی سوہن مصیبت اور گندگی کی فضا اُن کو لپیٹے ہوئے تھی اور اُن کی انسانیت کہیں اور بہت دور سینکڑوں پردوں کے اُس پار چھپی پڑی تھی

ہندوستان میں تو ایسی لاکھوں ہستیاں ہیں کسی تنگ اور اندھیری گلی میں چلے جاؤ۔ وہاں یہ اپنی زندگی کا مجسم نوحہ بنی نظر آئیں گی۔ زندگی کی غلاظت اور گندگی میں بیٹھتی ہوتی، کام کاج کرتی، اپنا دل بہلاتی اور دوسروں کی محبت کے مزے اٹھاتی دکھائی دیتی ہیں۔ مرد ان کے پاس آتے ہیں اُن کے جسموں کو کرائے پر لیتے ہیں اور اُن کی دکھ بھری اور تھکی ہاری بھاری گوپیوں کو اپنے سینوں سے پیوست کر کے اپنا غم غلط کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور وُہ ذرا بھی فریاد نہیں کرتیں بلکہ یہی ظاہر کرتی ہیں کہ وُہ خود بھی لطف اٹھا رہی ہیں

بصیر ان عورتوں کو دیکھ کر شرم اور سماجی جرم کے احساس میں ڈوبا جا رہا تھا۔ اُن کے چہرے اُن کے دلوں کا پتہ بتا رہے تھے جن میں درد اور دکھ کی لامتناہی داستانیں چھپی ہوئی تھیں وُہ یاد کر رہا تھا۔ کہ کبھی کبھی ان میں سے کسی کسی نے کیسی مجبوری اور تھکن کا اظہار کیا تھا اور اپنے دل کے غموں اور دکھوں کے وسیع سمندر کی جھلک دکھائی تھی۔ لیکن انسان جس کے خمیر میں خود غرضی پڑی ہوئی ہے۔ ان باتوں کو کیسے پسند کر سکتا ہے۔ وُہ تو عورت کو لونڈی بنا کر اپنی نفسانی خواہشوں کی آگ کو اس کے جسم سے بے دریغ بجھانا چاہتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ روپیہ جو انسان کو درندہ بنا سکتا ہے ان عورتوں کو ان کا بچھڑا ہوا انسانی نیکی پر عقیدہ پھر واپس دلا سکتا۔ لیکن بصیر نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے دوست سے نہ کیا اور ان عورتوں کے دکھوں کو اپنے ہی دل میں محسوس کرتا رہا۔

باہر گلی میں پہنچ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن حسن حنا کی خوشبو اب گوبر اور ویرانی کی بُو میں، جو ان کے ماحول میں بسی ہوئی تھی گھل مل گئی تھی۔ اور تارے مدھم اور پھیکے پڑ گئے تھے۔ جیسے کتا دم دبا کر بھاگتا ہے یہ دونوں گلی سے اپنی کار کی طرف بڑھے۔ اور کتوں ہی کی طرح اپنی خفّت چھپانے کو انہوں نے دلال سے کہا۔

کبھی تم بھی کہاں سے ۔ کوئی اور جگہ ہے تو

اور پھر وہی تلاش، پھر وہی ویرانی کا کیف ان … لوں میں

اَب کے ایک ناک نقشہ کی اچھی عورت ملی، اور گو اس کا سن زیادہ تھا لیکن پھر بھی اچھی تھی اسکا چہرہ بتا رہا تھا۔ کہ کبھی حسین رہی ہوگی اور بہت لوگوں نے اُسے اپنے دلوں میں جگہ دی ہوگی۔

وُہ کچھ نشے میں تھی۔ ایک پولیس کا افسر ابھی ابھی اس کے پاس سے گیا تھا۔ اور اب رات کے بارہ بجے وُہ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مرد بیٹھا ہوا تھا۔ جو یا تو شاید اس کا آشنا رہا ہو یا ممکن ہے شوہر جس کی گذر اوقات اب صرف اس پر رہ گئی تھی کہ اپنی بیوی کا جسم ان مردوں کے ہاتھ بیچتا ہے جن کی جیبوں میں روپیہ لا جادو کھنکتا ہے۔ بصیر اور اس کا دوست بیٹھ گئے۔ مرد جواں تھا۔ اور حیرت یہ تھی۔ کہ تعلیم یافتہ تھا اور انگریزی بولتا تھا۔ وُہ بھڑوا نہیں بلکہ دفتر کا کلرک معلوم ہوتا تھا۔ ایک بستر پر ہارمونیم اور ایک کونے میں ستار رکھا ہوا تھا۔ اسے دونوں بجانے آتے تھے۔ مگر اس وقت وُہ بھی نشہ میں چُور تھا اور اس کے سامنے رم کا بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔

عورت نے کھانا ختم کر کے چھوکرے سے پانی مانگا اور پھر بیٹھ کر مرچوں کی وجہ سے سی سی کرنے لگی۔ پھر ایک خانگی قصہ کھڑا ہو گیا عورت نے پان مانگا نوکر نے کہا چھالیہ نہیں ہے۔ مرد گرجا۔

"کیوں نہیں ہے ابے اُلّو کے پٹھے"

"بنیا اُدھار نہیں دیتا"

"اور جو رقم میں نے دی تھی اس کا کیا ہوا"

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مرد نے ماں کی گالی دے کر کہا۔

"سنتا نہیں ہے بے"

لڑکے نے کہا کہ سب پیسے ختم ہو گئے۔ پھر مرد نے گالی دے کر کہا۔

"اس بنئے کے پاس کیوں گیا جس سے ہم سودا نہیں خریدتے"

پھر اور گالیاں دے کر کہنے لگا

"اس سالے بنئے سے کہہ دے کہ تین دن کے اندر اندر اپنی دکان یہاں سے ہٹالے جائے۔ ورنہ پھر اس کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔ سنتا ہے بے او بنئے کے لونڈے۔ اس سے کہہ دے کہ اگر وُہ نہیں مانتا ہے تو پھر اس کی دکان میں چوری کا مال پا کو کین رکھوا کر پکڑوا دونگا"

ساتھ ساتھ عورت بھی لڑکے کی شکایت کر رہی تھی۔ کہ اس نے میرا پندرہ آنے کا خریدا ہوا آئینہ توڑ ڈالا بیچ بیچ میں ایک آدھ بُری گالی بھی دیتی جاتی تھی۔ مرد برابر ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا۔ اور لڑکے کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے اس کو کھا ہی جائیگا

بصیر نے عورت سے پوچھا

"آپ یہاں کب سے ہیں؟"

"کوئی دو مہینہ سے۔"

عورت نشہ کی وجہ سے ہکلا رہی تھی۔

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

"حیدر آباد سے۔ لیکن کئی برس سے میں بریلی میں تھی۔"

اس کا لہجہ بھونڈا تھا۔ اور اس کی نشہ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔

"آپ نے حیدر آباد اور بریلی کو کیوں چھوڑا؟"

عورت نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرہ پر ایک عجیب سی کیفیت جھلک اٹھی جس میں مجبوری اور افسوس دونوں صاف نمایاں تھے۔ پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کے بولی۔

"پیٹ کے کارن۔"

مرد ابھی تک نشے کے زور میں لڑکے پر بگڑتا چلا جا رہا تھا۔ پھر مڑ کر ان دونوں سے کہنے لگا۔

اس حرامزادے کو کبھی کچھ نہیں آئیگا جب اس گھر میں، جہاں سینکڑوں قسم کے آدمی آتے جاتے ہیں۔ کچھ نہ سیکھ سکا تو دوسری جگہ کیا سیکھ سکیگا کل اس نے میرا قیمتی آئینہ توڑ ڈالا جس نے بھی اس کا چوکھٹا دیکھا افسوس کیا۔"

عورت بولی۔

"اس حرامی نے تو ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے۔"

پھر لڑکے سے کہنے لگی۔

او حرامی کے پلّے کھڑا کیا کر رہا ہے چل۔ پاندان لا۔"

مرد چلّا کر بولا۔

"مگر چھالیا کہاں ہے؟

"لیکن میں پان تو کھاؤں گی ضرور"
پھر وُہ اپنے دونوں گاہکوں کی طرف مڑ کر کہنے لگی۔
"معاف کیجیے گا۔ ڈلی نہیں ہے۔ یہ تو کاٹھا۔۔"

دونوں نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں ہے"

عورت بولی۔

"کل کی بات ہے۔ ایک پرانے کرم فرما آئے۔ ان کو پان کا بڑا شوق ہے مگر یہاں گھر میں ڈلی بھی نہیں نکلی۔ میں نے اس سُوَر کو بھیجا کہ جا بازار سے لے آ۔ مگر یہ آ کر کہنے لگا۔ کہ نہیں ملتی۔ وُہ صاحب کہنے لگے کیا دام نہیں ہیں؟ اور انہوں نے اپنا ٹھونکا میں نے کہا۔ یہ بات نہیں ہے۔ پھر میں نے اس لڑکے کو بھیجا۔ اس نے پھر آ کر وہی جواب دیا۔۔ وُہ بیچارے بلا پان کھائے چلے گئے ...... ایسا ہے یہ سالہ .. .. گدھے کا بچہ"

کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ سگرٹ کا دھواں، رم کی بو، تیل، کھانے اور بہت سی نامعلوم چیزوں کی باس سارے میں بھری ہوئی تھی اس پر یہ جانگی جھگڑا اس فضا میں دم گھٹنے لگا۔ بصیر کو وحشت ہونے لگی۔ اور اس نے اپنے دوست سے کہا کہ عورت کو لے چلو۔ اس پر جگدیس نے عورت سے پوچھا۔

"اگر آپ تیار ہیں تو چلیے۔ ذرا موٹر پر ہوا کھا آئیں"

"میں تیار ہوں، لیکن پہلے دام دے دیجئے"

آدمی بولا۔

"ہاں پہلے دام دے دیجئے۔ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔ کہ ساتھ بھیجوں گا۔ میں بات کا پابند ہوں۔ مگر پہلے دام"

"اچھا۔ کتنے؟"

"میں ایک بات کہہ دوں ---- یا۔ ۔؟"

ہاں، ایسے دام کہہ دو کہ ہم یہاں پھر دوبارہ بھی آ سکیں"

مرد نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔

"بیس روپیہ"

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور چپ ہو رہے آدمی دونوں کا مطلب بھانپ گیا۔

"آپ سچ جانئے یہ بہت کم ہے جو میں نے کہا۔ آپ اپنے کسی دوست کو بھیجکر دریافت کرا لیجئے۔ اور آدمیوں کا کیا کہنا، اتنے دام میں تو اس حرامی کے پلّے پولیس انسپکٹر سے بھی لئے ہیں"۔

اور اس نے اپنی جیب سے پندرہ روپیہ نکال کر دکھائے، پھر بولا،

"اگر میں نے ایک پیسہ بھی زیادہ کہا ہو تو مجھے حرامی سمجھئے گا"

عورت بے رُخی سے کرسی پر پاؤں پہ پاؤں رکھے بیٹھی تھی اور اس کا سر نشہ کی حالت میں ایک طرف جھکا ہوا تھا عورت کے سامنے داموں پر جھگڑنا مناسب نہ سمجھ کر وہ برابر کے کمرے میں جو باورچی خانہ، غسل خانہ، اور کباڑ خانہ سب ہی کا کام دیتا تھا۔ آئے یہاں پہنچکر مرد کہنے لگا۔

"میں بدمعاش اور شریفوں کو خوب پہچانتا ہوں ایک ماہ ایک آدمی نشہ میں مدہوش آیا اور لگا بگھارنے کہ میں شریف ہوں مگر میں دلّال کو الگ لے گیا اور اس سے کہا کہ اس حرامی کے پاس روپیہ چاہے جتنا ہو۔ مگر یہ ہے بدمعاش۔ پھر میں نے عورت سے کہا۔ کہ یہ نشہ باز ہے، مگر سالے میں دم درود کچھ نہیں . وہ نشہ باز سہی۔ مگر میرا ایسا نشہ کا ظرف نہیں رکھتا لیکن میں وعدہ کر چکا تھا۔ اس لئے عورت کو ساتھ کر دیا۔ مگر میں نے راجہ صاحب سے جو برابر ہی رہتے ہیں کار مانگی، اور اس کا پیچھا کیا۔ اور اسکے گھر پہنچکر سیدھا اندر چلا گیا۔ اور اس کے دوستوں سے پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں انہوں نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا جو ہاتھ میں ایک چاقو لئے مدہوش پڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا "کیوں بے کتّے کے پلّے تیری حالت تو یہ ہے تو عورت کا کیا کرے گا۔ تجھ میں کسی بات کے حواس تو ہیں نہیں!" اور اس کے چوتڑوں میں ایک لات مار میں عورت کو لئے چلا آیا...... یہ میں جانتا ہوں کہ میں بُرا کام کر رہا ہوں، لیکن میں شرط بدھتا ہوں کہ کوئی اس کام کو مجھ سے اچھی طرح نہیں کر سکتا"۔

جگدیش نے کہا

"لیکن اسے ہمارے ساتھ بھیجنے کے لئے کیا کہتے ہو؟"

"میں وعدہ کر چکا ہوں۔ عورت موجود ہے۔ لیکن بیس سے کم نہیں لوں گا"

تب تو ہم رات بھر رکھیں گے"۔

"نا۔ عورت مجھ سے الگ رات نہیں گذار سکتی۔ نو برس سے وہ مجھ سے الگ نہیں سوئی ہے ...... مجھ پر اب کچھ ایسی پڑ گئی ہے۔ جو میں یہ کام کرتا ہوں لیکن پہلے میں اس قدر ذلیل نہ تھا۔ ..."

اور اس کی آنکھوں میں تکلیف جھلکنے لگی، ایک پچھتاوے کی کیفیت۔
"میں کبھی ملازم تھا۔ . . . لیکن اس عورت کے کارن میں نے سب کچھ چھوڑ دیا"
بصیر بولا۔
"پھر اس عورت سے پیشہ کیوں کراتے ہو؟"
جذبات کی رو جو اس پر آگئی تھی، دور ہوگئی، اور پھر وُہ اکڑ کر کہنے لگا۔
"کرنا پڑا۔ لیکن مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں محنت مزدوری جو بن پڑتا کرتا۔ اور خود کھاتا اور اُسے کھلاتا"
لیکن وُہ ایسا انسان نہیں معلوم ہوتا تھا۔ جو محنت مزدوری کر کے ایمانداری کی روٹی کھاتے ہیں وُہ تو صرف عورت کی محبت اور اس کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔ جگدیش نے کہا۔
"تو بیس سے کم نہ ہوگا"
"نہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ کم نہیں ہو سکتا"
دونوں یہ کہہ کر کہ وہ بیس کے قابل نہیں چل پڑے۔ باہر نکلتے وقت اس کی نگاہ عورت پر پڑی جو کمرے میں کنڈلی منڈلی مارے، نشہ میں دھت، پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔
باہر ستاروں کی چھاؤں میں امن اور سکوت تھا۔ مارچ کی خنکی بھری رات اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس سے دل کی ویرانی اور بھڑک اٹھتی تھی۔ درخت جوش و خروش سے اپنے سر دھن رہے تھے۔ اور ہوا کے راگ میں درد بھرے خوابوں کا نغمہ سنائی دیتا تھا۔
بصیر اتنا اکتا گیا تھا۔ کہ اس میں اب کہیں جانے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ لیکن جگدیش قسمت آزمائی پر تلا ہوا تھا جب موٹر چلی اور تاریکی کی لہروں سے جادو بھری ہوا کے جھونکے آ آ کر چہرے پر لگنے لگے۔ تو بصیر کو دل کی ویرانی کے ساتھ ساتھ افسوس اور ترس نے بھی گھیر لیا۔ لیکن جگدیش نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ عورت کی دستیابی کے لئے ایک اور کوشش کی جائے۔ اتنی رات گئے اگر کہیں ملنے کی امید ہو سکتی تھی تو چوک میں۔ اور اب انہوں نے ادھر کا رُخ کیا۔
سڑکیں سنسان تھیں، اور کتے بھی سو چکے تھے۔ دن بھر کی تھکی ہاری دنیا آرام کی نیند لے رہی تھی۔ صرف سڑک کے کنارے روشنی کے کھمبے نیند بھرے چوکیداروں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ اور بجلی کی مردہ اور بے جان روشنی میں سڑک پر لکڑی کے ٹکڑے، مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن اور کوڑوں کے ڈھیر مدھم سی اور اُلجھن پیدا کر رہے تھے۔ جب وُہ مختلف محلوں سے گذر رہے

تھے تو ہر جگہ سے اس کی خاص بُو نکل کر دماغ میں گھس جاتی۔ پھر جب دوسرا محلہ آتا تو اس کی بو جگہ لے لیتی۔

جب وُہ دونوں بدصورت محرابی دروازے سے گذر کر اسی سڑک پر آئے جس کے کوٹھوں سے مردوں کے تھکے ماندے دلوں کو کچھ سکون ملتا ہے۔ جہاں خوبصورت اور تندرست انسانوں کی ایک جماعت اپنے جسم کا سودا کرتی ہے، لیکن جہاں اب صرف بھیروں ناچ رہا تھا، تو دُور کسی گھڑیال نے ایک بجایا۔

وُہ جگہ جہاں شام کو چہل پہل رہتی ہے، طبلوں کی تھاپ اور سارنگیوں کی آواز دکانداروں اور گاہکوں کے شور اور خونچے والوں کی صداؤں میں مل جاتی ہے۔ جہاں نالیوں کی بُو اڑ اڑ کر عطر اور ہاروں کی مہک میں مل کر بوجھل ہوا میں پھیلتی رہتی ہے، اس وقت ویران اور خاموش تھی۔ صرف دو ایک چوکیدار خالی دکانوں میں بیٹھے باتیں کر کے نیند بھلا رہے تھے، اور ایک سپاہی نیند میں جھومتا ہُوا، تھکے ہاتھوں سے دکان بڑھا رہا تھا۔

سڑک کے بیچ میں پہنچ کر انہوں نے اس اونچی زمین کے پاس جہاں پارک بن گیا ہے۔ کار روک لی اس پارک میں نہ جانے کتنے ناکام عاشق آئے ہیں۔ اور رنڈیوں کے پژمردہ اور تھکے ہوئے چہروں کو گھور گھور کے اپنی قسمت سے بدلا لیتے ہیں یا پھر شاعر اپنی معشوقہ کی روایتی سرد مہری اور کج ادائی سے بدلا لینے کو کسی رنڈی کا جسم چند گھنٹوں کے لئے کرایہ پر لیتے ہیں اور پھر کلیجہ تھامے اور سرد آہیں بھرتے چلے جاتے ہیں۔

پارک کے سامنے کے دو ایک کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس لیئے ان لوگوں نے کسی آدمی کو بلانے کے لئے کئی مرتبہ ہارن بجایا۔ لیکن آتا کون؟ سب کساد بازاری کا رونا روتے ہوئے سونے چلے گئے تھے آخر بھیر نے کہا۔

"انتظار فضول ہے اب گھر چلو۔"

"نہیں جی۔ کسی نہ کسی دلال کو ڈھونڈھ نکالیں گے"

"مگر اتنی دیر انتظار کرنے کے بعد تو کوئی آیا نہیں اب کوئی نہیں آئے گا۔"

"جب آئے ہیں تو کسی کو لے چلنا ضروری ہے؟"

"کیسے؟"

"چلو خود چلیں۔ شاید کوئی ساتھ آنے پر تیار ہو جائے۔"

"تم جا کر دیکھ لو۔ میں یہاں انتظار کر رہا ہوں"

"بزدل نہ بنو۔ چلو دونوں چلیں گے۔"

وہ دونوں کوٹھے پر پہنچے۔ لیکن رنڈی نے بے رُخی سے کہا۔

"ہم سونے جا رہے ہیں۔"

دونوں اپنا سا منہ لے کر لوٹ آئے۔ جگدیش نے خفت مٹانے کو کہا!

"یہ تو بیسوا والی معلوم ہوتی ہیں۔"

اب کوئی چارہ نہ تھا۔ اسلئے وہ گھر کی طرف چلے۔ کار منڈلاتی ہوئی سڑک پر گذرنے لگی۔ دونوں طرف اونچے اونچے تاریک اور بدقطع مکانات بنے ہوئے تھے۔ اور ان کے تنگ برآمدے باہر کو نکلے ہوئے جانے والوں کے سروں پر محراب بنا رہے تھے جب وہ ایک پتلے بازار سے پہنچے تو دیکھا کہ اتنی رات گئے بھی ایک کار کھڑی ہوئی ہے یا تو کوئی پرانا شوقین تھا یا کوئی بھوک کا مارا عورت کی تلاش میں پیچھے پھر رہا تھا کار بتا رہی تھی کہ آنے والا دولت مند تھا جو یا تو غم کھونے یا لطف اٹھانے کی فکر میں آیا تھا۔ یا کسی کرایہ کی تھکی ماندی عورت کی آغوش میں جو پیٹ کی خاطر اُسے خوش کرنے پر مجبور تھی اپنا غم غلط کر رہا تھا۔

امیر بولا۔

"تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے۔ کہ اس کوچے میں ننگے جسم ایک دوسرے سے رگڑتے ہیں، روحیں بکتی اور خریدی جاتی ہیں اور سونے کی قربان گاہ پر اخلاق کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ مرد یہاں اپنے اصلی روپ میں نظر آتے ہیں یا تو درندے یا پھر دلال یہاں عورتیں عورتیں نہیں۔ بلکہ مال ہوتی ہیں جسے خریدار پسند کرتا ہے تو خرید لیتا ہے۔ ورنہ دُور پھینک دیتا ہے۔"

جگدیش نے جواب دیا

"میاں ملامت سو یہ کہاں کی مولویانہ باتیں نکالی ہیں میں تو یہ جانتا ہوں کہ ابھی عورت مل جائے تو ابھی مزے لوٹنے لگو ابھی تک چونکہ عورت ملی نہیں ہے اس لئے یہ باتیں کر رہے ہو۔"

یہ لوگ اب تنگ راستے کے نکڑ پر پہنچ چکے تھے، اور موڑ سے گذرتے ہی تازہ ہوا سے پیدا ہونے والے تندرست جذبات کی دنیا میں داخل ہو جاتے لیکن اسی وقت انہوں نے دیکھا۔ کہ ایک آدمی تھکے قدموں سے لڑکھڑاتا اور نیند میں جھومتا ہوا اُن کی طرف آ رہا ہے انہوں نے کار روک لی اور پوچھا۔

"کیوں بھئی کچھ مال وال ہے ؟"

"ہاں صاحب ہمارے ساتھ آئیے۔"

"تمہارے پاس جو بہترین چیز ہو وہ دکھانا۔ مگر ہم اس کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

دونوں کار سے اتر کر آدمی کے ساتھ تنگ اور تاریک گلیوں میں چلنے لگے۔ ان کے پاؤں کی چاپ دیواروں سے ٹکرا کر فضا میں گونج رہی تھی۔ اور مارچ کی رات کا حسن ان گلیوں میں جہاں نالیوں کی سڑاند سے دماغ پھٹا جاتا تھا، پہنچنے سے پہلے

ہی ختم ہوجاتا تھا۔ ان کے راز بھرے سیاہ پردوں میں تلخ رقابتیں اوراس سے زیادہ تلخ محبتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ورایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں جو کچھ نہ ہوجائے تھوڑا ہے۔ اگر رات کو کسی کا قتل بھی ہوجائے تو پتہ نہ چلے۔ مگر دونوں اُس آدمی کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اور سوچتے رہے کہ کسی جال میں تو نہیں پھنس جائینگے۔

ایک گلی کے موڑ پر وُہ ایک دومنزلہ عمارت کے پاس رُک گیا اُن لوگوں کے داہنے ہاتھ پر مکان کے سامنے ایک مسجد بنی ہوئی تھی جس کے اونچے سفید مینار فضا میں اس طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے وُہ تازہ ہوا سے پاک غذا تلاش کررہے ہوں لیکن وُہ بوسیدہ نظر آتے تھے۔ ور یہ خیال ہوتا تھا کہ اس کو سانس لینے کو بھی صاف ہوا میسر نہ آتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے اور وُہ قدرت، انسان اور اپنے تقدس کی اصلیت کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔

دلّال نے کسی کو آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے پھر پکارا۔ کئی بار پکارنے کے بعد کسی نے جواب دیا۔

"کون ہے؟"

"دروازہ کھولو۔"

اس نیند بھری آواز نے کہا۔ "سب سوگئی ہیں۔"

"کھولو تو۔ وُہ اٹھ پڑیں گی۔"

"مگر یہاں روشنی ہی نہیں ہے۔"

"تو لالٹین جلا لو نا۔"

پھر ایک گہرا سنّاٹا چھا گیا۔ دلّال نیند سے جھومتا ہوا دروازے کو تک رہا تھا۔ دونوں دوست بدصورت مسجد کو دیکھ رہے تھے جو اندھیری رات میں دھندلی سفید چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ اتنے میں زمین پر کوئی چیز بھد سے گری دونوں اچھل پڑے اور کود کر ایک طرف ہو گئے۔ پھر جگدیش نے کہا۔

"ملّا نے بھی فراغت کا کون سا وقت نکالا ہے۔" اس پر دونوں ہنس پڑے۔ لیکن اس ہنسی کے پیچھے ڈر کا احساس چھپا ہوا تھا۔ اگر وُہ اس وقت ہنستے نہیں تو شاید خوف کے احساس کو دُور کرنے کے لئے کوئی اور حرکت کرتے

"مگر اس نے رہنے کی اچھی جگہ نکالی ہے۔ اس کا وقت تو خوب کٹتا ہوگا۔ دن بھر عبادت سے اپنے ضمیر کو سکون دیتا ہوگا اور رات کو رنڈیوں کا مزا لوٹتا ہوگا۔" بصیر بولا۔

"میاں آہستہ آہستہ بولو۔ کہیں ملّا نہ سُن لے ایسا نہ ہو کہ ہندو مسلم فساد ہوجائے۔"

دروازہ ابھی تک نہ کھلا تھا۔ اور دلّال پھر چلانے لگا۔ اندر سے جواب ملا

"دیا سلائی نہیں مل رہی ——— ارے یہ رہی"

دونوں انتظار کرتے رہے کہ اب کوئی آدمی آکر دروازہ کھولے۔ اتنے میں مسجد کے نیچے سے پھر ایک عجیب سی آواز آئی جیسے کوئی بھاری قدم زمین پر پٹک رہا ہو۔ پھر ہنہنانے کی آواز آئی۔

"یہ ملا نہیں ہے میاں گدھا ہے" اور دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔

دروازہ کھلا اور دونوں اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوئے زینہ پر چڑھنے لگے۔ برآمدے میں ایک پلنگ پر کوئی سکڑا ہوا رضائی تانے پڑا تھا۔ برابر کے پلنگ سے کوئی ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا۔ اور وہ خالی تھا۔ اتنے میں ایک عورت نے ان کو سلام کیا۔ جوان تھی۔ خوبصورت تو نہیں لیکن پاؤڈر اور سرخی سے رنگی ہوئی غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ پھر وہ ایک کوٹھڑی میں داخل ہوئے جس میں کوئی فرش نہ تھا۔ صرف ایک کونے میں پلنگ پڑا ہوا تھا۔ اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور ایک طاق میں دو جاپانی چار کی پیالیاں۔ اور دو ایک ٹوٹی ہوئی بوتلیں اور ڈبیاں رکھی تھیں عورت مسکرائی۔ اُسکے خوبصورت چمکدار دانت نظر آئے ناس نے ادا سے ایک چکر لگایا۔ اور پھر پلنگ پر بصیر کے پاس آبیٹھی بصیر نے پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"مجھے گوہر جان کہتے ہیں۔ اور آپ کا اسم شریف؟"

بصیر نے ذرا سوچا اور پھر کہا۔

"مجنوں"۔

"بتا دیجئے مذاق نہ کیجئے"

"واقعی۔ یہی میرا نام ہے"

"تو پھر آپ کی لیلیٰ کہاں ہیں؟"

"لیلیٰ تو آپ ہیں"

"آپ شاعر تو نہیں ہیں؟"

"ہوں تو ——— اور یہی میرا تخلص ہے"

"اچھا تو اپنی کوئی غزل سنائیے"

"میں اپنی غزلیں رنڈیوں کو نہیں سناتا"

"کیوں؟ وہ تو انہیں خوب گا سکتی ہیں"

"لیکن میں اُنہیں رنڈیوں کے مُنہ سے سننا نہیں چاہتا"

"آپ مذاق کر رہے ہیں سچ سچ بتا دیجئے"

"نہیں، مذاق نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔ میں آج رات کو تمہیں ایک عملی غزل سناؤں گا"

بصیر نے اپنا ہاتھ اُس کی بغل میں ڈال دیا اور اُس کی سڈول چھاتی کو چھُوا۔ عورت نے جواب میں اس کی طرف ترستی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

جگدیش جو ایک اور عورت سے دام طے کر رہا تھا۔ اندر آیا اور انگریزی میں بولا۔

"کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ——— چھاتیاں خوب ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چنچل ہے"

عورت ان کے منہ تک رہی تھی، کیونکہ یہ دونوں انگریزی میں باتیں کر رہے تھے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ پھر اُس نے سگرٹ مانگا۔ بصیر نے ایک سگرٹ نکال کر دے دیا اُس نے ایک اور اپنی "باجی" کے لئے مانگا۔ بصیر نے ایک اور دے دیا۔ بصیر نے جگدیش سے پوچھا۔

"وُہ کیا مانگتی ہے؟"

"پندرہ"

"بہت ہیں۔ دس کہو۔ اس سے زیادہ نہیں"

معاملہ دس پر طے ہو گیا اور جگدیش بھی کوٹھڑی میں بیٹھ گیا۔ عورت نے چپکے سے کہا

"اس سے نہ بتانا۔ میں تم دونوں کے پاس رہ لوں گی"

جگدیش نے بصیر سے کہا۔

"یہ تو بڑی شوخ معلوم ہوتی ہے"

"ہاں۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا"

"لیکن ساتھ والی کو کہاں رکھیں کے جو اُسکو پتہ نہ چل سکے"؟ جگدیش نے کہا۔

یہ بات اردو میں کہی گئی تھی۔ اسلئے عورت بھی اس قصہ میں شریک ہو گئی، اور بولی۔

"اُسے دوسرے کمرے میں رکھنا۔ پھر تم دونوں میرے پاس آ سکو گے"

اس نے ساتھ والی کے خلاف ایک سازش کھڑی کر دی جس کی سرغنہ وُہ خود بن گئی، اور ان دونوں کو رازدار بنا کر

آپس میں اس طرح سے ملا دیا۔ کہ ایک دوسرے سے رقابت نہ کر سکیں اور ساتھ ساتھ مزے لوٹیں اگر وہاں کوئی تیسرا بھی ہوتا۔ تو وُہ اُسے بھی سازش میں شریک کر لیتی لیکن یہ دونوں اس کی عیّاری کو ذرا نہ سمجھے۔ اور جوش سے ساتھ والی کو الگ کمرے میں رکھنے کی تجویزیں بتانے لگے

"باجی" چاہتی تھی کہ دلّال بھی ساتھ چلے اب دیر بہت ہو چکی تھی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے جھگڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اور راضی ہو گئے باجی نے چلنے سے پہلے رقم وصول کر لی۔ پھر انہیں وحشتناک گلیوں میں ہوتے ہوئے کار تک پہنچے اور پھر ویران سڑکوں کو طے کرتے ہوئے گھر۔

دلّال کو تو انہوں نے کار میں سونے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور باجی کو ڈرائنگ روم میں رکھا۔ گوہر جان سنگار میز کی چیزوں اور فرنیچر کا جائزہ لینے لگی۔ بصیر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے بستر کی طرف گھسیٹا، اور دونوں ایک دوسرے پر گر پڑے۔ عورت بصیر کی دونوں ٹانگوں میں دبی اس کے بالوں سے کھیلنے لگی۔ اتنے میں اس کی نگاہ بصیر کی انگوٹھی پر پڑی اور اُسے اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ بصیر نے پوچھا۔

"کیا تم کو پسند ہے؟"

"ہاں"

"صرف رنڈیاں ہی نہیں بلکہ سب عورتیں انگوٹھیوں پر کیوں جان دیتی ہیں"

"اچھی لگتی ہیں"

اور عورتوں کی طرح اسے بھی خوبصورت چیزوں خاص کر زیوروں اور آرام اور راحت کی زندگی کی تمنا تھی۔ وُہ بولی۔

"یہ انگوٹھی ہم کو دے دو۔"

یہ کہہ کر وُہ انگوٹھی اتارنے لگی۔ بصیر نے ٹالنا چاہا مگر وُہ نہ مانی۔ اور جب تک کہ انگوٹھی اس کی انگلی میں نہ پہنچ گئی اس کو چین نہ آیا پھر ذرا اترا کر کہنے لگی۔

"اچھا مجھے کچھ بخشش دو۔ مگر باجی سے نہ کہنا"

"کیوں؟ کیا وُہ تمہارے ساتھ بُرا برتاؤ کرتی ہے؟"

ایک عجیب سی کیفیت اس کے چہرہ پر آ گئی اور وُہ بہت تلخی سے بولی۔

"وُہ بڑی حرامزادی ہے"

جگدیش نے اتنی دیر میں برابر والے کمرے میں باجی کو اپنے ساتھ سونے کے لئے صرف ایک روپیہ پر راضی کر لیا تھا۔ گوہر جان

یہ خبر سنکر بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی۔

"ذرا مجھے جھانک لینے دینا . . . ایک دفعہ میں ایک رئیس کے ہاں پندرہ روپیہ پر گئی۔ لیکن وُہ صرف تین روپیہ میں اس کے نوکر کے ساتھ رہ گئی۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسی کے مارے لوٹنے لگی پھر کھڑی ہونے لگی لیکن بصیر نے اُسے گھسیٹ لیا۔ وُہ قلابازی کھا کر پلنگ پر گر پڑی بصیر کود کر لیٹ گیا۔ اور مضبوطی سے اس کو پکڑ لیا اور جگدیش سے کہا کہ باہر چلے جاؤ۔

جب وُہ کپڑے اتار رہے تھے۔ تو وُہ بولی۔

"تم بڑے عیاش ہو۔"

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

"میں جانتی ہوں۔"

"بتاؤ تو کیسے؟"

"بس یونہی، میں جانتی ہوں۔"

دونوں بستر میں گھس گئے۔ اور کمبل اوڑھ لیا۔ بصیر نے پوچھا۔

"تم نے یہ پیشہ کیسے اختیار کیا؟"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی، پھر بولی۔

"میری ساس بڑی ظالم تھی۔ بھوکا مارتی تھی اور پیٹتی تھی۔ مجھ سے کھیتی باڑی کا کام لیتی میرا شوہر اپنی جوانی گنواتا پھرتا تھا، اور وُہ مجھے کام میں اُلجھائے رکھتی آخر کو میں بھاگ گئی اور ایک تانگہ والا یہاں لے آیا۔"

وہی مقررسی کہانی ممکن ہے سچ کہہ رہی ہو۔ ممکن ہے جھوٹ ایسی عورتیں شاذ ہی سچ بولتی ہیں۔ وُہ یہ بھی کہتی تھی۔ کہ پیشہ کرتے ہوئے مجھے صرف تین مہینہ ہوئے ہیں۔ یہ تو بالکل جھوٹ تھا۔ کیونکہ وُہ نہ صرف منجھی ہوئی تھی بلکہ اپنے پیشہ کے گُر اس کی رگ رگ میں بسے ہوئے تھے لیکن اس کی داستان کی بنیاد سچ ہی ہوگی۔ سب رنڈیاں بھوک یا مصیبت کی کوئی نہ کوئی داستان سناتی ہیں۔

بصیر گذری ہوئی راتوں اور بچھڑی ہوئی معشوقاؤں کو یاد کرنے لگا ——— بھولی ہوئی معشوقائیں اور رنڈیاں، اس زمانہ کا دُکھ سکھ، محبت کرنا اور اُکتا جانا، رقابت اور معشوقاؤں کے اُبھارے ہوئے پاک صاف جذبات، ان کی سوزش اور غم اور الم، راحت و مسرت۔ یہ سب اس کو یاد آنے لگے۔ اور وُہ ان جذبات اور اس خوشی اور پیار کا جو رنڈیاں ظاہر کرتی ہیں۔ مگر جس کے پیچھے بے رُخی اور لاپروائی بھی ہوتی ہے۔ وُہ پیار جو تھوڑی دیر کے لئے دل کو بے فکری اور مسرت بخش دیتا ہے۔ مقابلہ کرنے لگا۔ مگر عورت نے اس کو اپنے

عبادت سے چونکا دیا۔

"ذرا اُٹھو دیکھیں تو باجی کیا کر رہی ہے؟"

برابر کے کمرے سے ایک عورت کی بھرائی ہوئی آواز آرہی تھی۔

"ہٹو پرے ہیں تو پچھتاؤ گے!"

پھر مرد کے بولنے کی آواز آئی۔

"نہیں میں تو نہیں ہٹتا"

"تو تم جانو لیکن جب تمہاری اماں، ویں کہتے جنے کہ میرا لال کو کن نے مارا تو پھر شکایت نہ کرنا"

نصیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ اور دلال کار میں پڑا سو رہا تھا سامنے سڑک پر ایک آدمی نیند میں جھومتا، کان میں جنیو لپیٹے، ہاتھ میں لُٹیا لیے، رفعِ حاجت کرنے جا رہا تھا۔ نصیر نے اس عرضمند انسان اور سوئی ہوئی زمین سے نگاہ اٹھائی اور آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کا نیلا پن کچھ کچھ پھیکا پڑ چلا تھا۔ لیکن رات ابھی تک صبح کو اپنی تاریک گود میں چھپائے دنیا پر راج کر رہی تھی، اور دن کی روشنی کا نام نشان بھی نہ تھا ....

دیویندر ستیارتھی

نئے دیوتا

گاجر کے گرم حلوے کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا اور اگر کسی دعوت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ہر کھانا نہایت سلیقے سے تیار کیا جائے اور معمولی سے معمولی چیز میں بھی ایک نیا ہی ذائقہ پیدا کر دیا جائے تو بلا شبہ دہلی کی وہ دعوت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

اتنی بھی کیا خوشی ہے، میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن جیسے بھی کمال ہوگا ڈیڑھ سو روپے کیسے اُس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے اُس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی؟ غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی ہتک کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا رہتا ہے اور غریب کسان مزدور سب سے آب اس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں —— ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یاروں دوستوں کی دعوت دے رہا ہے اگرچہ میں نے اپنے خیالات کا اثر چہرے پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

دعوت میں کئی ادیب شریک تھے۔ میں سوچنے لگا، ہندوستان کی آزادی کے متعلق ان سوٹ پہننے والے ادیبوں سے زیادہ مدد کی امید نہ رکھنی چاہئے اور براؤننگ کا خیال —— "چند چاندی کے سکوں کے عوض وہ ہمیں چھوڑ گیا!" —— میرے ذہن میں پھیلتا چلا گیا۔ ان رجعت پسندوں کو یہ گمان کیسے ہو گیا کہ وہ ترقی پسند ادب کا چرچا کر کے سننے والوں کی آنکھوں میں دھول ڈال سکتے ہیں؟ کہاں ترقی اور آزادی کا حقیقی نصب العین اور کہاں یہ چاندی کی غلامی! نفاست حسن کے گورے چہرے پر ہنسی ناچ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو یہ ہنسی مجھے بڑی بھیانک دکھائی دیتی تھی۔

گاجر کا حلوا سچ مچ تھا بہت لذیذ اور وہ میرے خیالات پر حاوی ہو رہا تھا —— مقناطیس اتنا قریب ہو اور لوہے چون کے ذرّے کھنچے نہ چلے آئیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے، مطلب یہ کہ اگر یہ حلوا نہ ہوتا تو میں نے نفاست حسن کو اور بھی زیادہ تنقیدی زاویئے سے دیکھا ہوتا۔

بہتوں کے ناموں سے میں نا آشنا تھا یہ دوسری بات ہے کہ کئی چہرے میرے لئے نئے نہ تھے۔ خاص کر مولانا نور حسن آرزو کو تو اس سے پہلے کبھی فوٹو میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اُن کی آواز مجھے بہت پیاری لگی، بہت جلد میں نے اُن کی فصاحت کا لوہا مان لیا۔ یہ محسوس ہوتے بھی دیر نہ لگی کہ انہیں ایسی ایسی دلیلوں پر عبور حاصل ہے کہ موقع پڑنے پر وہ اپنے حریف کو گھاس کے تنکے کی طرح اپنی راہ سے اڑا دیں۔ عمر میں وہ کوئی بوڑھے نہ تھے ادھیڑ ہی تھے۔ مگر نئے زمانے سے اتنا ہی رشتہ رکھتے تھے کہ سرکاری نوکری کی وجہ سے پاجامے اور شیروانی کو خیرباد کہہ کر انگریزی وضع کا سوٹ

پہننا شروع کر دیا تھا۔

برف میں لگی ہوئی گنڈیریوں کے طشتری سب ادیب دست بڑھ بڑھ کر اٹھا رہے تھے۔ جونہی گنڈیری کا گلاب میں بسا ہوا رس حلق سے نیچے اترتا مولانا ارشد کی آنکھوں میں ایک نئی سی چمک آجاتی

نفاست حسن کہہ رہا تھا: یہ گنڈیریاں تو خاص طور پر مولانا کے لئے منگوائی گئی ہیں

"خوب" مولانا بولے" اور گاجر کا حلوا بھی شاید میرے ہی لئے بنوایا گیا تھا . . "

"جی ہاں"

نفاست حسن کی میان نگاہیں مولانا کی شوخ آنکھوں میں گڑ کر رہ گئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اسے اپنے محکمے میں یہ نوکری دلانے میں مولانا کا بہت ہاتھ تھا۔ مگر خود نفاست حسن ایسا آدمی نہ تھا کہ احسان مندی کو تصور میں بھی لا سکے۔ اُس کا خیال تھا کہ خود وقت کی کروٹ کی بدولت ہی وہ یہ نوکری حاصل کر سکا ہے اور گاجر کا لذیذ حلوا اور گلاب میں بسی ہوئی گنڈیریاں کسی مولانا کا احسان اتارنے کے خیال سے ہرگز پیش نہیں کی گئیں۔

مولانا ادھر بہت موٹے ہو گئے تھے اور وہ حیران تھے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے شہر بمبئی میں چند سال گذارنے کے باوجود نفاست حسن نے اپنی بیٹھک میں ایک آدھ بڑی کرسی رکھنے کی ضرورت کیوں نہ محسوس کی تھی ابھی تک بڑھئیوں نے بڑی کرسیاں بنانا بالکل ترک تو نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ نئے زمانے میں اب لوگ کبھی اتنے موٹے نہ ہوا کریں گے! اپنی گول گول گھومتی ہوئی آنکھیں اُنہوں نے میری طرف پھیریں اور میں نے دیکھا کہ اُن میں غرور اور غم گلے مل رہے ہیں اور وہ بیتے وقتوں کو پھر سے واپس آتا دیکھنے کے لئے بیقرار ہو رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے محفل چھدری ہوتی گئی۔ نئے دوست یہ خیال لیکر لوٹے کہ نفاست حسن ایک نفاست پسند اور دوست نواز آدمی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ رسمی تکلفات کا کوئی بڑا حامی نہیں ہے۔ ہے بھی ٹھیک۔ دوستی ہونی چاہئے آزاد نظم سی ——— قافیہ اور ردیف کی قید سے آزاد۔

مولانا برابر جمے ہوئے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے" صاحب! سومرسٹ مام کا مطالعہ کیا ہے آپ نے؟"

اُنہوں نے یہ بات اِس لہجے میں پوچھی تھی کہ مجھے گول مول جواب پر اترنا پڑا" صاحب کہاں تک مطالعہ کیا جائے؟ اَن گنت کتابیں ہیں۔ اور اَن گنت مصنف۔ اب میں سومرسٹ مام کا خاص خیال رکھونگا"

"تو یہ کہئے نا کہ آپ نے سومرسٹ مام کی کوئی کتاب نہیں پڑھی"۔

اب میں سمجھا کہ سومرسٹ مام کوئی مصنف ہیں میں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا" جی ہاں یہی سمجھ لیجئے"

"تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ اب تک آپ نے یونہی عمر ضائع کی!"

اِس پر نفاست حسن بگڑ اٹھا۔ گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ پتہ چلا کہ مولانا نے نفاست حسن کو چڑانے کے لئے ہی سومرسٹ مام کا تذکرہ

گیا تھا۔ ایک دن خود نفاست حسن نے یہی سوال مولانا سے کیا تھا اور جب انہوں نے میری طرح بات ٹالنی چاہی تو وہ کہہ اٹھا تھا "تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ اب تک آپ نے یوں ہی عمر ضائع کی!"

ادھر مولانا نے انگریزی ادب سے ربط بڑھانا شروع کر رکھا تھا مگر نفاست حسن بدستور یہی سمجھتا تھا کہ یہ صرف ایک دکھاوا ہے اور انگریزی ادب سے نئے رجحانوں سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ جب بھی وہ ان کے ہاتھ میں کوئی انگریزی کتاب دیکھتا۔ اس کے ذہن میں طنز جاگ اٹھتی۔ جیسے سانپ کے سر پر زہر جاگ اٹھتا ہے "اس دکھاوے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ ... یہ دکھاوا ... نماز نیت و سفید کپڑے ہی پر ٹھیک جچ رہے ہیں!"

مولانا بڑی سادہ اور بیاض۔ ہاں میں شعر لکھتے تھے مضامین بھی لکھتے تھے۔ افسانہ نگاری کی راہ میں انہوں نے کوئی کوشش نہ کی تھی۔ ہاں جب کوئی واقعہ سنتے تو یہی گمان ہوتا کہ کوئی کہانی جنم لے رہی ہے اور اگر اس وقت کوئی آدمی ان کی تعریف کر دیتا تو خواہ مخواہ ان کی نگاہ میں بہت اونچا اٹھ جاتا۔ داد پاکر ہی وہ داد دے سکتے ہوں، یہ بات نہ تھی۔ اگرچہ کسی ایسے معاوضے کے منتظر بھی نوجوان ادیبوں کی بیٹھک میں جھانکتے رہتے تھے ان کی ہمہ پرستانہ طبیعت ہی نفاست حسن کے نزدیک وہ عیب تھا جس کی وجہ سے جیسا کہ اس کا خیال تھا وہ پرانے دور کی نمائندگی کرنے میں کامیاب ہوئے تھے اور نہ نئے دور ہی سے رشتہ جوڑ سکے تھے۔

جب بھی نفاست حسن مولانا کے خلاف کچھ کہتا مجھے یوں محسوس ہوتا کہ ادب کا پیادہ دستہ پہلے دور کی ہتک کر رہا ہے۔ وہ تو اپنی ہی ہتک سے سطحی طور پر اس کا گھناؤنا پن کتنا ہی ابھر سے اوجھل رہے مگر جب یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ادب ایک ارتقائی چیز ہے تو کوئی بھی ادیب اپنا یہ وطیرہ جاری نہیں رکھ سکتا۔

"ہاں تو سومرسٹ ماہم والا مذاق" نفاست حسن نہ سہار سکا بولا "بس بس چپ رہیے۔ اتنی زبان مت کھولیے!"

نفاست حسن کی آواز پر زندہ جلنے کا گمان ہوتا تھا۔ مولانا نے قدرے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور بولے "اتنے کیوں گرم ہونے ہو میاں، عمر میں بھی میں تمہارے والد کے برابر ہوں!"

"بس بس یہ شفقت اپنے ہی پاس رکھیے۔ مجھے نہیں چاہیے کمینی شفقت ... یہ سرپرستانہ شفقت۔ بڑے آئے ہیں میرے والد ... والد! اتنی زبان درازی!"

مولانا نے اب تک یہی سمجھا تھا کہ وہ مذاق ہی کی سرحد پر کھڑے ہیں۔ معاملہ تو دوسرا ہی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ ان کے چہرے پر غصے کی تہ چڑھ گئی۔ بولے "ایک مسخرے سومرسٹ ماہم کی خاطر کیوں میری ہتک کرنے پر تلے ہو میاں؟ ... کمبخت سومرسٹ ماہم!"

بات تُو تُو میں میں کی شکل اختیار کر گئی۔ مجھے تو یہی خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں دونوں ادیب ہاتھا پائی پر نہ اتر آئیں۔

نفاست حسن اس دن میزبان تھا اور گھر پر آئے ہوئے کسی مہمان کی شان میں ہر طرح کی زبان درازی سے اسے پرہیز کرنا چاہیے تھا

اور پھر یہ مہمان کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ اُس کا ہمعصر ادیب تھا۔ عمر میں اُس سے بڑا اور زبان دانی میں کہیں بڑھ کر۔ میں سوچنے لگا کہ سومرسٹ ماہم پر نفاست حسن اتنا کیوں فدا ہے؟ ۔ ۔ وہ بھی مولانا کی طرح ایک آدمی ہی تو ہے کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں ہر لحاظ سے نفاست حسن کے کمرے میں پڑی ہوئی کسی بھی ہلکے بھورے رنگ کی کرسی سے مولانا کہیں زیادہ قیمتی تھے نفاست حسن اتنا گرم کیوں ہو گیا تھا؟ وہ شاید اپنے مہمان کو کرسی سے اٹھا دینا چاہتا تھا یہ ٹھیک ہے کہ مولانا کی طنز بڑی تیکھی تھی مگر تھی تو آخر طنز ہی۔ اور اس کا جواب اگر طنز ہی سے دیا جاتا تو اس قدر دلخراش مظاہرہ تو نہ ہوا ہوتا۔

سومرسٹ ماہم آخر کیا لکھتا ہوگا کیا اُسے اپنے وطن انگلستان میں بھی نفاست حسن جیسا کوئی عاشق زار نصیب ہوا ہوگا، مجھے یقین گذرا کہ نفاست حسن کے بہت سے جملے جنہیں وہ موقع بے موقع نہایت شان سے اپنی گفتگو اور تحریر میں نگینوں کی طرح جڑنے میں ہوشیار بن چکا ہے ضرور ولایت کی کسی فیکٹری سے بن کر آئے ہیں۔ اُن کی اپنی تخلیق ہرگز نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ جانے پہلے کب سومرسٹ ماہم کے قلم نے اُس پہ جادو سا کر دیا تھا اور کیا یہ جادو کبھی ختم بھی ہو جائے گا؟

ایک دن اُس نے مجھ سے پوچھا "عورت کس وقت سندر لگتی ہے؟"

مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ میں نے کہا "آپ ہی بتلایئے۔"

وہ بولا "ہاں تو سنو۔ ۔ ۔ جب وہ تین دن سے بخار میں مبتلا ہو اور اُس کے ہاتھوں کی رگیں نیلی پڑ جائیں تب عورت کتنی سندر لگتی ہے! کتنی سندر!"

میں نے سوچا شاید یہ نگینہ بھی سومرسٹ ماہم کی فیکٹری سے آیا ہو۔

میں نے نفاست حسن کو مخاطب کر کے کہا "خشکی چھوڑو میاں، سومرسٹ ماہم تو ایک دیوتا ہے۔"

وہ بولا "اور میں؟"

"آپ بھی دیوتا ہیں، میاں!"

میں نے اُسے بتایا کہ دیوتاؤں میں تین بڑے دیوتا ہیں ـــــ برہما، وشنو، اور شیو۔ اپنی اپنی جداگانہ اہمیت کے باعث وہ بے حد ممتاز بن گئے ہیں۔ برہما جنم دیتا ہے، وشنو پرورش کرتا ہے اور شو ٹھہرا موت کا ناچ ناچنے والا ـــــ نٹ راج!

نفاست حسن کا دھیان اب میری طرف کھنچ گیا۔ مولانا کی آنکھوں میں اب غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وہ بھی میری بات میں دلچسپی لے رہے تھے میں نے بتایا کہ ہر ادیب مختلف وقتوں میں برہما، وشنو اور شو ہوتا ہے۔ جب ایک شخص ایک چیز لکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے میں اُسے برہما کہنا پسند کروں گا۔ وہ اس چیز کو سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے۔ ہر ممکن اصلاح کرتا ہے۔ اُس وقت وہ وشنو کا ہم پلہ ہوتا ہے اور جب وہ اپنے ہی ہاتھ سے کسی تحریر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے، وہ سو فیصدی شو کا روپ دھار لیتا ہے۔

مولانا بولے "بہت خوب! آپ کا تخیل مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے"

میں نے جھٹ سے کہہ دیا "میرا تخیل! نہیں مولانا نہیں۔ یہ میرا تخیل نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ یہ میرا طبعزاد خیال نہیں ہے . . ."

"تو کس کا خیال پیش کر رہے ہیں آپ؟"

"بمبئی کی پی۔ ای۔ این سوسائٹی میں بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو نے میری ایک تقریر پر صدارت کرتے ہوئے یہ سوال مجھ سے کیا تھا۔"

"بہت خوب! . . . بلبلِ ہند نے آپ کی تقریر پر صدارت کی تھی! . . . ہاں تو اب کوئی طبعزاد خیال سنائیے نا!"

"طبعزاد! . . . طبعزاد کی بھی خوب کہی۔ مجھے تو سرے سے یہی شک ہو رہا ہے کہ طبعزاد نام کی کوئی چیز ہوتی بھی ہے یا نہیں"

نفاست حسن بوکھلایا "کیا کہہ رہے ہو میاں؟ سنئے میں ایک خیال پیش کرتا ہوں ——— جونہی صبح کی پہلی کرن آنکھیں ملتی ہوئی دھرتی پر آتی، پاس کی کچی دیوار انگڑائی لے رہی تھی!"

مولانا نے حیرت سے کہا "دیوار انگڑائی لے رہی تھی!"

میں نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا "اس وقت نفاست حسن ایک برہما ہیں، مولانا!"

"برہما!"

"جی ہاں برہما . . . اور نہ جانے کب تک وہ وشنو بنا ہوا اس خیال کو سنبھال سنبھال کر رکھے گا . . . . اور پھر ایک دن وہ شیو بن جائیگا اور خود اپنے ہاتھوں سے اس خیال کا گلا گھونٹ ڈالے گا۔ اُسے خود اپنی تخلیق پر ہنسی آئے گی ——— صرف ہنسی اگر یہ خیال اُس کا سو فیصدی طبعزاد خیال نہیں ہے اور پوری پوری شرم، اگر یہ سچ مچ اُس کا سو فیصدی طبعزاد خیال ہے۔"

نفاست حسن چاہتا تو جھٹ میرے خیال کی تردید کر دیتا۔ مگر وہ چپ بیٹھا رہا۔ شاید وہ کچھ جھینپ سا گیا تھا اور اپنی کمتری کے جذبے کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مولانا بولے "برہما، وشنو اور شیو کے متعلق آج میں کچھ اور بھی سننا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "سنئے۔ وشنو اور شیو کے ہزاروں مندر ہیں اور برہما کا ایک بھی مندر نہیں ہے کہیں . . ."

"برہما کا ایک بھی مندر نہیں؟"

"جی نہیں۔ سنئے تو، بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ ایک بار وشنو اور برہما میں یہ مقابلہ ہو گیا کہ کون پہلے شولنگ کی گہرائی اور اونچائی کا پتہ لا سکتا ہے۔ وشنو جڑ کی طرف چل پڑے اور برہما چوٹی کی طرف۔ برہما اوپر چڑھتا گیا مگر شولنگ کی چوٹی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اوپر سے چمپیلی کا ایک پھول گرتا آ رہا تھا۔ برہما نے پوچھا ——— کدھر سے آنا ہوا؟

پھول بولا ——— شولنگ کی چوٹی سے۔

"برہما نے پوچھا ــــ کتنی دُور ہے وہ چوٹی؟"

"پھول نے کہا ــــ دور، بہت دور!"

برہما چمبیلی کے ہمراہ واپس ہوا۔ راستے میں اُس نے اِس پھول کو اتنا سا جھوٹ بولنے کے لئے رضامند کرلیا کہ وہ وشنو کے سامنے کہدے کہ وہ دونوں خاص شولنگ کی چوٹی سے ہوتے ہوئے آرہے ہیں۔ مگر شو تو ٹھہرا انتر جامی۔ برہما اور چمبیلی کو بڑی بھاری سزا دی گئی ــــ رہتی دنیا تک برہما کا کہیں مندر نہ بنے گا۔ چمبیلی کسی مندر میں پوجا میں نہ چڑھائی جائے گی:

نفاست حسن بولا "مگر یہ تو نیا زمانہ ہے۔ اب تو شاید برہما کا بھی مندر بن جائے کہیں۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر برہما پر کوئی پھول چڑھے گا تو وہ بلاشبہ چمبیلی کا پھول ہی ہوگا۔"

نفاست حسن نے یقیناً اس وقت یہی سوچا ہوگا کہ گو اب تک وہ خود فقط ایک برہما ہی ہے کیونکہ اُس کے پبلشر نے اُس کے افسانوں کا ضخیم مجموعہ شائع کرنے سے ابھی تک گریز ہی کیا ہے۔ مگر جونہی یہ کتاب شائع ہوگی اُس کی شہرت کا حقیقی مندر تعمیر ہوتے دیر نہ لگے گی۔ اور اس مندر میں چمبیلی کے پھول ہی اُس پر چڑھائے جایا کریں گے۔

اپنے متعلق اِس قدر غلط فہمی رکھنے میں اُس کے دو چار گہرے دوستوں کا ہاتھ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُشا کے گھونگھٹ کھولنے سے پہلے کی ساری سیاہی اور سُرخی ــــ اندھیارے اور اجالے کی گنگا جمنی سرگوشیاں ــــ اُس کی طبع میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور اگر اُس نے شروع میں روسی افسانوں کے ترجمہ میں اپنی اٹھتی جوانی کا زور لگانے کے بجائے طبعزاد افسانے لکھنے میں سرگرمی دکھائی ہوتی تو آج اُس کا نام یقیناً صفِ اوّل کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ اب بھی گرے ہوئے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا۔ اگر یہ سو فیصدی طبعزاد افسانہ نگار سو فیصدی دسیسہ ساز بھی ہو گیا تو یقیناً وہ ہندوستان بھر کے افسانوی ادب کی چوٹی پر نظر آئیگا۔

ایک بار دوستوں نے اُسے بتایا کہ وہ بڑا صاف گو ہے۔ چنانچہ سپنوں میں بھی یہ خیال اُس کا تعاقب کرنے لگا کہ واقعی وہ بڑا صاف گو ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو سو فیصدی طبعزاد افسانہ نگار کو زندگی کے مطالعے میں حقیقی مدد دے سکتی ہے۔ جب اِس نوکری کیلئے اُس نے درخواست بھیجی تو اُس سے پوچھا گیا کہ اُس نے کس مضمون میں اپنا علم پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ بلا جھجک اُس نے لکھ بھیجا کہ میں نے اپنی بیشتر زندگی بیسواؤں کا مطالعہ کرنے میں گزاری ہے۔ گو اس صاف گوئی سے کہیں زیادہ کسی کی سفارش ہی نے اُسے یہ نوکری دلانے میں مدد دی تھی مگر وہ برابر نئے ملنے والوں کے روبرو اس کا ذکر بڑے فخر سے کیا کرتا تھا صاف گوئی ــــ سو فیصدی صاف گوئی! میں نے سوچا شاید اس صاف گوئی کی سرحد نے ابھی تک اُس کی بیوی کو تو نہ چھوا ہوگا۔ گھر میں آکر تو اکثر بڑے بڑے ترقی پسند ادیب بھیگی بلی بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ اُس کی ترقی پسندی بڑی حد تک عریاں جنسی بیان سے بھری رہتی تھی مگر کچھ عرصے سے اُس کے ذہن میں یہ وہم

سمجھ گیا تھا، کہ وہ کسی بھی جاندار یا بے جان شے کے گرد اپنے افسانے کو گھما سکتا ہے۔ اپنے ایک افسانے میں اُس نے ایک پتھر کی سرگزشت بیان کی تھی۔ جو ایک ایسی کنواری کی اُٹھتی مچلتی ہوئی چھاتی سے ٹکرانے کے لئے بے قرار ہوا اٹھا تھا۔ آدمی بدستور آدمی ہے مگر پتھر اب پتھر ہی نہیں ہے۔ یہ بات اُس نے بڑی گہرائی سے لکھی تھی نفسیات کی سرحدیں اب ٹکڑی نہ رہیں گی۔ پتھر اب پتھر ہی نہیں ہے، نہ بجلی کا کھمبا بجلی کا کھمبا ہی۔ وہ چاہتا تو اپنے سگرٹ کیس میں بھی دل ڈال دیتا اور اُس کے گرد نفسیات کا باریک جال بُن دیتا۔

اُس کی زبان نہ بہت مشکل تھی نہ بہت آسان۔ یہاں وہاں نئی نئی تشبیہیں بھی جا مرتی تھیں۔ ابھی اُسے کسی کا پھولا ہوا تھیلا دیکھ کر حاملہ عورت کے پیٹ کا دھیان آ گیا۔ ابھی کسی کی ذہنی کمزوری اُس دوشیزہ سی نظر آئی جو آندھی میں اپنی ساری سنبھالنے سے قاصر ہو۔ کیسی گے بوں سوڈے کے بلبلے تھے تو کبھی کی ناک چینی کی پیالی کی گھونٹی جیسی۔

شام ہو چلی تھی۔ نفاست حسن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتا ہوا چھجے پر آ گیا۔ نکلسن روڈ پر قریب ہی کے ٹیلر ماسٹر کی دکان میں برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ چھجے پر کھڑا کھڑا نفاست حسن پلٹتے ہوئے بولا:

"مولانا! چلو لگے ہاتھوں سردار جی ہی سے ملتے آئیں۔"

میں حیرانی سے اپنی سیٹ میں دبکا بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا یہ سردار جی کون ہیں۔ جن سے ملنے کے لئے نفاست حسن اتنا مشتاق نظر آتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ صرف اپنے فرق برائے فرق کے نظریہ کے مطابق ہی مجھ سے بھی لمبی داڑھی والے کسی شخص سے ملنا چاہتا ہے حالانکہ خود اُس کے چہرے پر داڑھی تو داڑھی مونچھ تک کا نشان ہر دوسرے تیسرے دن مٹا ڈالا جاتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اُس نے ایک ادیب کی مونچھوں کو محض اس لئے پسند کیا تھا کہ وہ مونچھیں مولانا نے ناپسند کی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر مولانا نے اُن مونچھوں کی تعریف میں ایک آدھ بات کہہ دی ہوتی تو وہ فوراً کہہ اُٹھتا "مولانا! آپ کی اندھا دھند پسند کی تو حد ہو چکی ہے۔ لاحول ولا قوۃ ——— آپ نے بھی خوب آدمیوں میں آدمی چُنا!

یہ سردار جی کون ہیں! یہ سوال میرے ذہن میں پھیلتا چلا گیا۔ اُن سے متعارف ہونے کی خواہش دیکھ کر نفاست حسن نے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔ وہ ایک عجب مستی کے عالم میں سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا۔ اپنے پاؤں کو وہ ضرورت سے زیادہ زور سے زمین پر پھینکتا تھا اور پھٹ پھٹ کی آواز سے شور پیدا کرتا ہوا پڑوسیوں کے آرام میں مخل ہو رہا تھا۔ اِس قِسم کی حرکت کو وہ آزادی تصور کرتا تھا اور اسے کسی قیمت پر بھی دینے کو تیار نہ تھا۔

ایک پڑے لمبے چوڑے بازار میں گھومتے گھامتے ہم آخر سردار جی کی دکان پر پہنچ گئے۔ پتہ چلا کہ نفاست حسن اسم بامسمّٰی تھا کیونکہ

شراب کی دکان جہاں اُس نے سردارجی سے ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا سخت بدبودار جگہ تھی۔ میز پرسنگ مرمر کی سلوں پر سوڈا اور وسکی بھی بہی ہوئی تھی اور بھاری نشستگاہ کے قریب ہی ٹوٹے ہوئے آبخوروں کا انبار لگ رہا تھا۔ بغل میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی ٹانگیں ایک بوسیدہ الماری سے لگائے اور لٹکانے اپنا سر پُوری طرح کھوئے بے ہوش پڑا تھا۔ آبخوروں کے اتنا قریب ہونے کی وجہ سے اُس کا کھُلا ہوا منہ ایک آبخورہ ہی تو دکھائی دیتا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے گمان ہوا کہ نفاست حسن اِسی شخص سے ملنے آیا ہے۔ گویا اپنے آپ سے اپنے سُند رتام سے اقصات کرنے آیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد نفاست حسن نے اپنی کرخت آواز سے جس سے ہمیشہ کی طرح خواہ مخواہ رندہ چلنے کا گمان ہوتا تھا، پکارا۔

" او میاں جُماّں! ــــ لاؤ تو ذرا سردارجی کو !"

میاں جُمّاں ایک جھاڑن سے بوتل صاف کر رہا تھا۔ دن کے وقت وہ اِسی جھاڑن سے سڑک پر سے اُڑکر آنے والی گرد کو شیشوں میں پڑی ہوئی پیسٹری پر سے جھاڑا کرتا تھا یا آبخوروں کے درمیان تنے ہوئے جالوں کو صاف کر مارتا تھا۔ کچھ دیر بعد جُمّاں نے وسکی کی ایک بوتل اور سوڈے کی دو بوتلیں میز پر لا رکھیں۔

سردارجی کی شخصیت سے واقف ہوتے دیر نہ لگی۔ مگر میں بدستور افسانوں کی دنیا میں گھوم رہا تھا۔ پھر میں نے بے محل ہی نفاست حسن سے پوچھا۔

"آپ کے افسانے تو بہت جمع ہو چکے ہونگے !"

اُس وقت تک وہ سوڈا اور وسکی دونوں کو ملا چکا تھا۔ میں نے سردارجی سے متعارف ہونے سے اِنکار کر دیا تھا۔ اِس لئے اُس نے اور موالانے گلاس ٹکراتے اور اپنے اپنے منہ سے لگا لئے۔ ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے نفاست حسن بولا۔

"میں افسانے وغیرہ کبھی اکٹھے نہیں کرتا۔ میرے افسانے کبوتر کے بچے ہیں جنہیں میں لکھتا ہوں اور کہتا ہوں ـــــ او کبوتر کے بچو! اُڑجاؤ ـــــ اور وہ اُڑجاتے ہیں !"

اِس تشبیہ کے انداز کی میں نے بہت تعریف کی۔ سچ پوچھو تو اُس وقت میرے ذہن میں آئین سٹائن کا نظریۂ اضافیت نمایاں ہو گیا تھا۔ ہر چیز کو دوسری چیز سے نسبت ہے۔ افسانے کو کبوتر کے بچے سے، فاحشہ عورت کی مسکراہٹ کو بدر رو میں چلتے ہوئے بلبلے سے، صبح کی پہلی کرن کو انگڑائی لیتی ہوئی دیوار سے نفاست حسن کو چیرنے سے . . . .

اُس وقت میں سوچنے لگا کہ یہ تشبیہیں نادر اور دور از کار تشبیہیں اِس عظیم الشان ادیب کے دماغ میں پیدا کہاں سے ہوتی ہیں پھر مجھے فوراً ہی خیال آیا، یہ تو ایک سیدھا سادھا سا عمل ہے۔ خود نفاست حسن نے ایک بار مجھے بتلایا تھا کہ اُسے قبض کی شکایت کبھی نہیں ہوتی۔ بعض مصنف تو سخت قبض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ بے چارے بہت زور لگا کر لکھتے ہیں۔ میں نے سوچا اِس لحاظ سے تو نفاست حسن

ہر ملاقات کو دودھ کے ساتھ اطرافی زمانی کھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ پتھر، بلیڈ، رنگین چیزیں، گلدان، کتاب، میز، کرسی، قلم، دوات، ہر چیز پر لکھ کر ان کے مجموعوں کے نام دوڑ دا بھاگو، رودو، بیٹھو رکھ سکتا ہے۔

مگر میں بہت دیر تک سیران افسانوں کی دنیا میں نہ رہ سکا۔ اُس وقت تک دونوں ادیب وسکی کی بوتل آدھی کے لگ بھگ ختم کر چکے تھے معاً ان کے خیال میں قسم قسم کی شراب کو ملا کر پینے کی دھن سمائی۔ چنانچہ تمیز میاں نے بہت سی بوتلوں سے ایک ایک پیگ انڈیلا اور پھر سب کو وسکی میں انڈیل دیا۔ اس وقت مولانا شراب میں اپنے آپ کو کھو رہے تھے۔ شاید اُنہوں نے اسی لئے نفاست حسن کی ادبی جولانیوں کو سراہا جاتا اور پیگ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے انہوں نے نفاست حسن کو ایک تھپکی دی اور بولے۔

"شاباش برخوردار ـــــ لکھے جاؤ!"

نفاست حسن جو سردار جی کے مکان کی فضا سے بہت مانوس تھا اور جو نفرپو کھلانے بہت سے پیگ پی سکتا تھا، بولا۔

"بس بس مولانا! یہی ایک بات ہے جو مجھے سرے سے ناپسند ہے۔ اس بیہودہ سرپرستی کی مجھے چنداں ضرورت نہیں، آپ کی مدح و ذم کی مجھے مطلق پروا نہیں۔ سمجھے آپ۔ اگر آپ نے میرے افسانے پڑھے تو اس سے میرا کچھ سنور نہیں گیا۔ اگر نہیں پڑھے تو کچھ بگڑا نہیں"

مولانا کو اس بے جا گفتگو سے سخت حیرت ہوئی۔ اپنے میزبان کے کندھے تھپکتے ہوئے بولے۔ "برخوردار! اگر تم افسانہ نگاری کے بجائے مٹی کا تیل بھی بیچا کرتے تب بھی میرے دل میں تمہاری ایسی ہی عزت ہوتی۔"

یہ دونوں ادیب تو آپس میں سنجیدگی سے گفتگو کر رہے تھے مگر میں اس ماحول میں بوکھلا سا گیا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ادیب میری طرح پرہیزگار ہیں اور شراب دراصل میں پی رہا ہوں۔

ایک اور پیگ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے نفاست حسن نے پاپڑ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا اور کہا!

"مولانا! میں لکھتا چلا جا رہا ہوں، بہت کچھ لکھتا جا رہا ہوں۔ میری کبھی کسی چیز سے تسلی نہیں ہوتی"

اور ابھی نفاست حسن نے گفتگو ختم بھی نہ کی تھی کہ مجھے خیال آیا کہ تسلی کیسے ہو سکتی ہے کیونکہ ان کے افسانے تو کبوتر کے بچے ہیں اور جب تک وہ کبوتر کے بچے رہیں گے وہ پھڑپھڑاتے نفاست حسن کے پاس سے اڑ جائیں گے۔ آخر نفاست حسن نے کوئی چھتنار ابھی تو قائم نہیں کیا کہ جہاں سے آ کر یہ کبھی کبھی آ کر بیٹھ جائیں اور اپنے گذشتہ مالک کو دیکھ لیں۔ اب وہ بے سہارا آوارہ روحوں کی طرح ایک لامتناہی آسمان میں پھڑپھڑاتے پھر رہے ہیں۔

نفاست حسن اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولا!

"بس ایک چیز لکھ لوں گا۔ ایک چیز تو میری تسلی ہو جائے گی اس کے بعد میں بھی جاؤں تو مجھے یہی تسلی ہوگی کہ میں نے ادب کا ایک بہت بڑا کام کیا ہے"

مولانا کے اور میرے حقیقی اور فرضی نشے سے ہرن ہو گئے ہم دونوں کی توجہ اس افسانے کا پلاٹ سننے کے لئے نفاست حسن کے پتلے اور

خفیف چہرے کی طرف اٹھ گئی۔ نفاست حسن بولا:

"میں ان دنوں بمبئی میں رہتا تھا۔ میرے مکان کا ایک دروازہ ایک غسل خانے میں کھلتا تھا۔ اس غسل خانے میں ایک درز تھی۔ بس اسی درز میں سے میں کنواری لڑکیوں کو نہاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتوں کو بھی۔ اس کے علاوہ نوجوان مرد بھی نہانے کے لئے آیا کرتے تھے اور جیسا آپ کو معلوم ہے انسان عام زندگی میں وہ حرکتیں نہیں کرتا جو غسل خانے میں کرتا ہے۔"

میں اس بات کو سمجھ نہ سکا۔ لیکن میرے سامنے آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت تھا۔ اس لئے میں نے چنداں پروا نہ کی اور سنتا چلا گیا۔ نفاست حسن بولا:

"میں ان غسل خانے میں نہانے والیوں اور نہانے والوں کے متعلق میں لکھ کر مر جاؤں تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوگا۔ اس افسانے کا نام رکھوں گا ـــــ ایک درز میں سے! . . . اور مر جاؤں گا۔"

مجھے نفاست حسن کی اس حرکت پر بہت ہنسی آئی اور میرا جی چاہنے لگا کہ اگر میں اس کا تذکرہ لکھ کر مر جاؤں تو مجھے بھی زندگی میں کوئی حسرت نہ رہ جائے گی۔

مولانا جو نفاست حسن کی سب باتوں کو بڑے غور سے سن رہے تھے، کچھ نہ بولے۔ نہ جانے نفاست حسن کے دل میں خود ہی خیال آیا کہ اس نے مولانا کی ہتک کی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بوسے کے لئے اس نے اپنا دایاں گال مولانا کے سامنے پیش کر دیا۔ مولانا نے تبرکاً ایک بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد نفاست حسن نے بایاں گال پیش کر دیا۔ مولانا کے نزدیک اب تبرک کا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ لیکن انہوں نے بوسہ لے لیا۔

ہم ان کی باہمی لڑائی کا موضوع تھا۔ لیکن اچانک مولانا نے اٹھ کر بڑے خلوص سے چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"دیکھو بھائی اب تم مانو گے۔ میں سومرسٹ ماہم ہوں۔"

نفاست حسن نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"میں سومرسٹ ماہم ہوں"

مولانا نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے

"میں سومرسٹ ماہم ہوں۔"

پھر نفاست حسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولے،

"تم سومرسٹ ماہم ہو ـــــ ہم دونوں سومرسٹ ماہم ہیں۔۔ جو ہے سومرسٹ ماہم ہے، جو نہیں ہے وہ بھی سومرسٹ ماہم ہے ... سومرسٹ ماہم بھی سومرسٹ ماہم ہے! . ."

سعادت حسن منٹو

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ یہاں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا: "دِس لیف ـــــ ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جب کہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نپٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی "صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ اُن سے کہتی "صاحب، تم ایک دم اُلّو کا پٹھا ہے ـــــ حرامزادہ ہے۔ سمجھا" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ اُن سے باتیں کرتی۔ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلّو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں، مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا "بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے" جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا "دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ" چھٹے آدمی نے یہ سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا "لائیے ایک روپیہ دودھ کا" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی

نہیں ہوتی۔ اُس نے جیب میں سے نکال کر اُس کو دیدی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا مالِ غنیمت ہے۔

ساڑھے تین روپے تین مہینوں میں ——— بیس روپیہ ماہوار تو اُس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے اس پاخانے میں گئی تو اُس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اُٹھنے لگی تو اُس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اُس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ زنجیر اس لئے لٹکائی گئی ہے کہ اُٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر جونہی اُس نے زنجیر پکڑ کر اُٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اُس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر باہر نکلا اور سلطانہ سے کہنے لگا "کیا ہوا ——— یہ چیخ تمہاری تھی؟"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ "یہ موا پاخانہ ہے کیا ——— بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پاخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اُس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اُس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اُس کو کوئی کام نہ ملا اس لئے اس نے اس عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالے میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں انبالے آیا اُس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اُس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اُٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لئے اُس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے۔ جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی، چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اُس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا وہ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا، چنانچہ اُس نے ایک فوٹوگرافر سے دوستی

پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر ننھے کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا، چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈہ انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد لوگوں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعے سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی آمدنی پہلے سے دوگنی ہو گئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوا لیں، دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوشحال تھی، مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ وہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا، بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی شہر کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں، اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی، پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔ "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔" یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دکان" لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانے کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں، چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا، کیا بات

ہے خدا بخش، دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے کسی نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا ــــــ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینہ بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔" خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصے سے کھٹک رہی تھی۔ مگر وہ خاموش تھا۔ پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا راستہ بھول گئے ہیں ــــــ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ . . . "

وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرائے میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں آئیں تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں، آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے میں۔ یہاں کیا دھرا ہے؟ ــــــ بھئی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ یہ آخری کنگنی بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔"

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں جانِ من، انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بُچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا، پر کیا کرتی، پیٹ کو بھی آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی، پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکونی میں آ کر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اُس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح اُبھری رہتی تھیں۔ اِس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک کی صدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اُٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں اُسے نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اُٹھتے تھے اور ہوا میں گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اُسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اُسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔ ــــــــ نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئیگا جب اِس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رُک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اُسکا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اُس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اُس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اُس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اُس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ جو یہ سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اُٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں۔ جن کو چند موٹے موٹے انجن اِدھر اُدھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اُس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے چنانچہ جب اِس قسم کے خیال اُس کو آنے لگے تو اُس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اُس نے بارہا کہا "دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں" مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اُس کی تشفی کر دی "جانِ من ــــــــ میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔"

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے۔ مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجیٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اُس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی

طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اُس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اِس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اُس کو اس احساس نے بہت دُکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اُس کا دل بہت مغموم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اُس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ کو سر کے نیچے رکھے لیٹی رہی پر جب اُس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو وہ اُٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی۔ تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے۔ پر انجن کوئی بھی نہیں تھا۔ شام کا وقت تھا چھڑکاؤ ہو چکا تھا اس لیئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا سلطانہ مسکرا دی اور اُس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اُس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اُس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اُس نے پھر سڑک کی جانب دیکھا تو وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ وہی جس نے اُس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اُسے اشارہ کیا۔ اُس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اُسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اُسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اُس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لیئے کہا: "آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے" وہ آدمی یہ سُن کر مسکرایا "تمہیں کیسے معلوم ہوا ——— ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا "یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر اِدھر آئے" وہ یہ سُن کر پھر مسکرا دیا "تمہیں غلط فہمی ہوئی میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیئے اور ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے" یہ کہہ کر اُس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا "آپ جا رہے ہیں؟" اُس آدمی نے جواب دیا "نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ——— چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ"

سلطانہ نے اُس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے اُس آدمی نے بالکل خاموشی سے اِن کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ

دونوں پھر اُسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ تو اس آدمی نے کہا "میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے گرم پتلون پہنے تھا سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا۔ "فرمائیے۔ . . ."

شنکر بیٹھا تھا یہ سن کر لیٹ گیا "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ، بلایا تمہیں نے ہے مجھے" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا "میں سمجھا، اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے جایا کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے"۔

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی۔ مگر اس کے باوجود اُسے بے اختیار ہنسی آ گئی "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا "یہی جو تم لوگ کرتے ہو"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں . . . میں . . . میں کچھ بھی نہیں کرتی"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا"

سلطانہ نے بھنا کر کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ——— آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی"

"جھک مارتی ہوں"

"میں بھی جھک مارتا ہوں"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں"

"میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا"

"ہوش کی دوا کرو ——— یہ لنگر خانہ نہیں"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں"۔

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا: "یہ والنٹیئر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا: "الّو کے پٹھے۔"

"میں بھی الّو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی خدابخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الّو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا: "تم ہندو ہو، اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔"

شنکر مسکرا دیا: "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ پنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں۔"

"جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ـــــ بولو رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی: "تو جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا: "میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرتا ہوں، جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا ـــــ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالہ میں آیا ہوتا جہاں وہ خوشحال تھی۔ تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دیکر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی۔ اس لئے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدابخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا: "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدابخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا، کہنے لگا: "پرانے قلعے کے پاس سے آ رہا ہوں وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھیرے ہوئے ہیں، انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں ـــــ"

"کچھ انہوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے ـــــ پر سلطانہ میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ

کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی۔ "سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو ۔۔۔ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ نہ کہیں جا سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟ ۔۔۔ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا "پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیئے ۔۔۔ خدا کے لئے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لئے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیف برداشت کرنے کے بعد ہم . . ."

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لئے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی ایک قمیص پڑی ہوئی ہے اس کو میں کالا رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے دیوالی پر مجھے لا کر دیا تھا، یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی کالا رنگوا لیا جائیگا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے، سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو . . . دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو ۔۔۔ میری بھینٹی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا "اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو ۔۔۔ میں کہاں سے لاؤں گا ۔۔۔ افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے ۔۔۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ، میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا، دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی، ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام

بھی ہوتا تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اُس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں۔ جن میں اُس کے، دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اُٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھوکر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آکھڑی ہوئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہوگئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہوگئی تھی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اُسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اُس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اُسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اُس سے کیا کہے۔ دراصل اُس نے ایسے ہی بنا سوچے سمجھے اُسے اشارہ کردیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اُس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ——— میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہوگئی۔ کہنے لگی "نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے"

شنکر اس پر مسکرا دیا "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں؟"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ ——— نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں ——— یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں ——— چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو ——— کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے ——— اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے ———"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی "صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو"

"جو دوسرے چاہتے ہیں" شنکر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا؟"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ اُن میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا "میں سمجھ گئی ہوں"

"تو کہو کیا ارادہ ہے۔"

"تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی"

"تم غلط کہتی ہو ——— اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن اُن کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو ——— تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

شنکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا "میرا نام شنکر ہے ——— یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا "شنکر میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا "پہلے بات بتاؤ"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی "تم کہو گے میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر ."

"کہو کہو ——— رک کیوں گئی ہو"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا "بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں ——— یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سن کر کہا "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا "نہیں، میرا مطلب یہ ہے اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو۔"

شنکر مسکرایا "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لو بس اب خوش ہو گئیں۔ پھر سلطانہ کے بُندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا "کیا یہ بُندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا "تم نہیں کراؤ گے بیچارے کے معمولی بندے ہیں ——— زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہونگے۔"
اس پر شنکر نے کہا "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں ان کی قیمت نہیں پوچھی - بولو دیتی ہو"
"لے لو" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے اس کو بعد میں افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی ایک چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا "ساٹن کی کالی شلوار ہے ——— دیکھ لینا۔ شاید لمبی ہو ——— میں اب چلتا ہوں۔"
شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔
سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔
دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے اس نے جب پہن لئے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے ——— کب بنوائی؟"
سلطانہ نے جواب دیا "آج ہی درزی لایا ہے" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں "یہ بندے تم نے کہاں سے لئے؟"
انوری نے جواب دیا "آج ہی منگوائے ہیں"
اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

عبدالرحمٰن چغتائی

لگان

کھلیان جل رہا تھا۔ نامو۔ ناجی تیز دھکے بسرس کے سامنے کھڑے دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے "محنت کا پھل" نامو نے کہا "ایسا ہی ہوتا ہے" وہ اور زور سے ہنسے، اُن کے قہقہوں کی آواز شعلوں میں مل گئی۔ یہ پہلا میلان یہ پہلی چتا تھی جس پر رونے پیٹنے کی بجائے بے دریغ قہقہے لگائے جا رہے تھے۔ آگ کے شعلے، اس میں دکھ درد، دھرتی کی بلائیں، بھیانک آوازیں سبھی کچھ تھا مگر وہ ہنسی جو سماج کی سیوا کرنے والے ہنس رہے تھے شعلوں میں لپٹی ہوئی پوری قوت کے ساتھ ان کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔ "یہ جزا ہے ہماری ریاضتوں اور دعاؤں کی" مندہ کھلیان کے گرد کھڑا چلا چلا کر کہہ رہا تھا "کسانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی بے دریغ جل رہی ہے"۔ مندہ کی آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ جیسے واقع ہوئے برسوں گزر گئے تھے۔ آج حقیقت سے بھی زیادہ روشن نظر آ رہا تھا۔ کھلیان جلانے والوں میں ملدہ بھی بت بنا تھا۔ اسے امیدیں لہراتی ہوئی دکھائی دیں شعلوں کی رو میں۔ وہ خون کا سا رنگ۔ گویا تمام گاؤں کا کفارہ دیا جا رہا تھا۔

ملدہ چونک اٹھا جیسے کسی ڈراؤنے خواب نے جگا دیا ہو۔ رات کا وقت تھا۔ وہ الجھیاں سے زمین پر لیٹا ہوا، پاؤں پسارے میدکی دنیا میں بسنا چاہتا تھا۔ پر نیند اس کے نزدیک نہ آتی تھی مگر گزشتہ کی یاد، وہ بھولی بسکی آرزوئیں، امیدیں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آ رہی تھیں۔ چاہتا تھا آواز کو بند کر دے اور کہہ دے "اپنے فرائض سے ہرگز غافل نہیں ہوں"۔

مندہ کسان تھا۔ مدتیں ہوئیں اس نے اپنے گاؤں کو چھوڑ دیا تھا۔ کسان شہر میں پہنچ کر مزدور بن گیا تھا۔ مطمئن تھا کہ اس کی مشقت اسے کسی کا محتاج نہیں ہونے دیتی اور وہ زندگی کے دن اپنے آپ سے نفرت کئے بغیر گزار رہا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ کھلیان جل رہا ہے اسی طرح جس طرح آج سے برسوں پہلے جلایا گیا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی کھلیان کے گرد ناچ رہے ہیں۔ قہقہے پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی دنیا، وہی گاؤں، وہی لوگ تھے جن کے لئے وہ ہر طرح کی اذیتیں اٹھانے کا بیڑا اٹھا چکے تھے۔ زمین، لگان، بنئے کا قرضہ سبھی کچھ تھا جو بہ دالستہ اس نے برسوں سے بھلا رکھا تھا۔ اس نے دیکھا وہی جگہ ہے جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ جہاں وہ پرورش پا کر بڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی بڑی محنتیں اور ریاضتیں کی تھیں اور ہمیشہ خوش اعتقادی سے کہا تھا "یہ گاؤں ہم کو ایک دن جنت کے دروازے تک پہنچا دے گا جہاں زندگی میں سکھ کے سوا کچھ نہ ہوگا"۔

بلندہ نے جب گاؤں چھوڑا تو وہ اکیلا نہ تھا۔ سبھی تھے۔ وہ اور اس کے ساتھی جنہوں نے اپنی اپنی محنت اور روزی کو آگ لگا کر تماشہ

دیکھا تھا۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی وہ یہ بھول نہ سکا اس احساس کو دل سے نہ نکال سکا کہ وہ شہر میں اجنبی ہے۔ شہر والوں نے بھی ایک پل کیلئے یہ فراموش نہ کیا تھا کہ بلندہ گاؤں سے آکر یہاں آباد ہوا ہے۔ وہ اپنی روزی کے ساتھ ہمیشہ دیانتداری برتتا تھا۔ وہ محنت پسینہ ایک کر دیتا تھا لیکن جب وہ یہ سنتا کہ شہر کے لوگ اس پر رحم کھا کر اس کے لئے مزدوری مہیا کرتے ہیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔ اس وقت اسے گاؤں کی یاد ستانے لگتی اور وہ دیوانوں کی طرح سر اٹھائے وطن کو بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن ناکامی کچھ کرنے نہ دیتی تھی اور وہ ایک لمبا سانس لیتا اور کہتا شہری اور شہر بہت اچھے ہیں جہاں مزدوری کے ساتھ لگان دینا نہیں پڑتا۔

بلندہ چاہتا تھا کہ نیند اس پر حملہ آور ہو جائے وہ سو جائے، وہ تھوڑے عرصہ کے لئے پھر سب کچھ بھول جائے مگر پرانی یاد اتنی دلفریب اور دلکش تھی کہ آنکھیں بند ہوتے ہوتے اس کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اسے یہی نظر آ رہا تھا کھلیان جل رہا ہے وہ اور اس کے ساتھی سب مبہوت الو اسوں کی طرح چلا رہے ہیں۔ اسے یاد تھا کہ کھلیان کو آگ اسی نے لگائی تھی جوانی کی ترنگ تھی۔ وہ چاہتے تھے کھلیان جل جائے اور جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے سال بھر کی محنت، وہ کھلیان کتنا اونچا اور کتنا بلند تھا۔ اس کے گرد ناچتے ہوئے ہمارے سائے بھوتوں کے سائے نظر آ رہے تھے کہتے ہیں بھوت کھلیان جلانے کے عادی ہیں اس روز بھی تو آگ بھوتوں ہی نے لگائی تھی۔ وہ محنت کا پھل اور حاصل۔ وہ موتی کے دانوں کی طرح نکھرا اور دھلا ہوا صاف ستھرا کھلیان ہماری آنکھوں کے سامنے جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا کھلیان ہم ہی نے تو جلایا تھا ہم نے لگان ادا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا "کھلیان جل جائے راکھ ہو جائے قحط پڑ جائے۔ گاؤں کا گاؤں بھوکا مر جائے، ہم مر جائیں تو مر جائیں"۔ تحصیلدار کہتا تھا" مگر لگان کبھی معاف نہ ہو گا"۔ ویلدار نے کہا تھا۔ زمیندار نے سمجھایا تھا جو آتا تھا یہی کہتا تھا پر ہم کسی کی بات سے متاثر نہ ہوئے ہم میں سے کسی کا رنگ زرد نہیں پڑا۔ ناچ بھی تو بند نہ ہوا فضا رنگین ہو گئی تھی اور ان شعلوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا جن میں لگان جل رہا تھا

بلندہ کو یاد تھا سب نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اپنی کمائی کو اپنے حاصل کو سال بھر جو پیسہ پیسہ ایک کر کے پیدا کی ہوئی دولت کو آگ لگا دیجئے کیونکہ بنئے کا قرضہ اور لگان کی ادائیگی کھلیان نہیں چکا سکتا۔ وہ جب جاگ خیالات کی رو میں پہلو بدل کر اوندھا لیٹ گیا اس کا اضطراب اور بھی بڑھ رہا تھا۔ پاس ہی اس کی بیوی پڑی سو رہی تھی۔ چاہتا تھا بیوی کے قریب ہو جائے اس پر اپنا بازو رکھ دے۔ تاکہ وہ جاگ اٹھے لیکن گاؤں کی یاد تھی۔ کہ تازہ ہوتی جا رہی تھی اور وہ تھا کہ بے کل ہوتا جا رہا تھا رات قدم بڑھائے بڑھتی آ رہی تھی۔ اسے یاد آیا۔ آج کی رات اور اس رات میں کوئی نمایاں فرق نہیں جب انہوں نے کھلیان جلایا تھا

دیا خاموشی کے ساتھ جل رہا تھا۔ سرسوں کا تیل۔ دھواں نقش کی ہوئی تصویروں کی مانند خیالوں کے تسلسل کی طرح پھیلتا بل کھاتا۔ اور اندھیرے میں کھو جاتا۔ نہ کوئی پتنگا نہ پروانہ دیئے کے گرد کچھ بھی نہ تھا جس سے اس کی توجہ بدل جاتی رات کا ہر قدم آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ واقعات جو برسوں ہوئے پیش آئے تھے اسے تازہ دم بنائے جا رہے تھے۔ چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے، ساتھیوں

کی دیکھ بھال کرے ان کو ڈھونڈھ نکالے، ان کا منہ چوم لے اور کبھی ارادوں کو پورا کرنے کے لئے کھلیان تو کیا بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ملندہ کی موہی اس کے پہلو میں اطمینان کی نیند سو رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دوئی محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ذرا بھی مخالف نہ تھے۔ وہ تو ایسے تھے گویا ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہوں۔

بلندہ سوچنے لگا آخر ہم نے کھلیان جلایا کیوں تھا۔ اس بے دردی اور لاپرواہی سے کھلیاں جلانے کی آخر ضرورت کیا تھی۔ گاؤں والے ہمدردی کر رہے تھے مگر ہم تو سب پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ اور کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وہ دن کیسے یاد ہیں جب ہل چلایا گیا۔ پھر بیج ڈالا گیا۔ پانی لگایا۔ ایک ایک دانے کی سیوا کی۔ گیہوں پھوٹ نکلا تو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ لہرانے لگا۔ جب پک گیا تو اس کا سنہری رنگ کیا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ سونے کی طرح دانہ دانہ چمک رہا تھا۔ مجھے یاد ہے جب کھلیان لگایا جا رہا تھا۔ تو ہم نے کتنی دعائیں کی تھیں۔ کھلیان کتنا شاندار کتنا اونچا اٹھ گیا تھا۔ نگاہیں اس سے سیراب ہوتی تھیں۔ جو آتا تھا یہی کہتا تھا۔ گیہوں یہ کھلیاں سونے اور جواہرات کا ڈھیر ہے۔ ایک ایک دانہ سونے کی ایک ایک اشرفی سے کیا کم ہوگا۔

ہمارے دعاؤں کا ماتم کر دیا تھا۔ امیدوں کو آگ لگا دی تھی۔ آرزوؤں کا خون بہا دیا تھا۔ دنیا کہتی تھی کسان کا حرص جل رہا ہے کسان کے گاڑھے پسینے کی کمائی برباد ہو رہی ہے۔ مگر سیرو ناچی، اور میری آنکھوں کے سامنے جو کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ گاؤں والوں نے کبھی دیکھا سوچا نہ تھا۔ گاؤں ہمارے جینے مرنے کا سہارا اور کھلیان ہماری محنتوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ ہمارے عمل پر نقطہ چینی کرتا۔ تحصیلدار ذیلدار چھپ چھپ کر افواہیں پھیلاتے تھے۔ اپنی اپنی رائے بیان کرتے۔ لگان کی معافی اور اپنی سفارشوں کا ذکر کرتے تھے۔ لیکن ہم کہتے تھے پہلے قرضے ادا نہیں ہوئے۔ بنئے کے تمسکات ہماری گردنوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ زمینوں کے نئے پٹے اور لگان۔ کسان کو کیا کچھ کرنا ہے۔

کھلیان کا جلنا ایک نظام کے مٹنے کا نما کرنا تھا جو ہم نے تیار کیا تھا۔ وہ ہماری جہالت مازی کی آخری ہچکی تھی۔ چوٹ کی نوعیت اور اثرات کو سمجھنے کی کس میں اہلیت تھی۔ لیکن مستقبل بھوک کے مرنے اور کھلیان جلانے کے بعد ہی نظر آتا ہے۔

اندھیرے میں اس کی آنکھیں خطرناک طور پر چمک رہی تھیں۔ صحن کے سامنے والی دیوار میں ایک روزن تھا۔ اس میں سے بکھرے ہوئے ستارے نظر آ رہے تھے۔ آسماں پر ایک ستارہ ٹوٹا۔ آسمان میں ایک ہیجان سا نظر آیا۔ اسے یاد آیا ماتو نے گاؤں میں ایک قتل کر دیا تھا۔ بلندہ ستاروں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ آج سے چند سال پیشتر قتل کی رات بھی ستارے اسی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس رات بھی ایک ستارہ ٹوٹ کر مغرب کی جانب آسمان میں گم ہو گیا تھا۔ وہ قتل دراصل ماتو کی غیرت کا امتحان تھا۔ لاش کو بیش قیمت زیوروں کے ساتھ ہی دبا دیا گیا تھا۔ پھر اسے وہ رہٹ یاد آیا جو ساری رات ایک ہی سُر میں راگ الاپنے کا عادی تھا۔ اور وہ شکستہ دیوار بھی جس پر گلاؤ کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک جوں کی توں تھی۔ لاش کو اسی کے نیچے تو دبا دیا گیا تھا۔ پھر وہ پیپل کا ٹرا سا جو جوہڑ کے کنارے سے جا ملتا

تھا جو عام شکل و صورت میں دکھائی دیا۔ اس قتل نے گاؤں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی ماتو نے فیصلہ کیا تھا۔ اگر پولیس قاتل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی تو اسے ایک دو اور بھی قتل کرنے ہوں گے ماتو کی منگیتر ایک کھاتے پیتے زمیندار کی بیٹی تھی۔

جب ہم گاؤں سے نکلے تو ہم سب اکٹھے تھے۔ ہماری آنکھیں دنیا کی سنہائی بلندیوں کی طرف لگی ہوئی تھیں وہاں جہاں انسان کا مستقبل اس کے معیار کے مطابق کندہ نظر آتا ہے ماتو راستہ میں بیمار ہو گیا تھا۔ ایسا بیمار کہ پھر جانبر نہ ہو سکا۔ کتنا صبر والا کتنا صاحب دل انسان تھا اسے اس وقت بوڑھی ماں۔ جوان بیوی۔ ننھا سا بچہ کچھ بھی یاد نہ تھا اس نے صرف یہی کہا، گاؤں کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھنا وہی کرنا جو آئندہ کے لئے سوچا ہے" وہ جگہ جہاں وہ بیمار ہوا اور چل بسا۔ ایک چھوٹی سی بستی تھی بستی کے لوگوں نے ہمارے ساتھ کتنی ہمدردی کی تھی۔ ماتو نے کہا تھا۔ " خالی پیٹ، بیماریوں کو تھک کر چور ہو جانا اپنے آپ پر رحم نہ کھانا کیونکہ ارادوں کو چھوڑ دینا۔ قدم کا ڈگمگا جانا غلامی کی لعنت سے بھی بدتر ہے" ماتو کو بستی کے لوگوں نے کفن دیا تھا۔ جوان بوڑھے سب ماتم میں شامل ہوئے تھے جب ہم دوسری رسومات سے فارغ ہو چکے۔ تو بستی والوں نے ہماری بہت مدد کی تھی انہوں نے ہمیں بھائی بندوں کی طرح رخصت کیا تھا اس وقت ماتو کی موت کی وجہ سے ہمیں اپنی کمزوری کا احساس ہونے لگا تھا ارادوں میں ملد می سر رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے پرانے نظام کو بدل دینے کی توقعات شکل باری معلوم ہونے لگی تھیں۔ زمیندار تحصیلدار بنیا، لگان سبھی یاد آتے تھے وہی جنہوں نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم اپنے پیغام کو ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیں اور آزادی سے یہ کہتے پھریں کہ زندگی کی بہتری کے لئے موجودہ نظام کو بدلنا ہی پڑے گا۔

اور بستی سے باہر وہ سایت پر اس جگہ جہاں ہم نے عہد باندھے تھے پھر ہم ایک ایک کر کے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ میں گھبرا گیا تھا ساتھی کی چیخیں نکل گئی تھیں شیرو کی گردن جھک گئی تھی ہم دور دور سے ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے۔ گویا ایک دوسرے کو بلا رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے نیک اور اعلیٰ مقصد کے لئے جدا ہو رہے تھے۔ ہم ماتو کی طرح بادار تھوڑے ہی تھے۔ جو چند روپے لے کر جنگ پر چلا گیا تھا۔ اور پھر آج تک واپس نہیں آیا۔ اُن دنوں خوب یاد ہے جنگ نے بھی ایک دھم مچا رکھا تھا گاؤں میں سوائے جنگ کے اور ذکر ہی نہ تھا سینکڑوں گاؤں خالی ہو گئے تھے ہزاروں عورتیں مزدوروں کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ لوگوں کو کیا ملا تھا۔ کسی نے بھی کسی کا لگان ادا نہ کیا تھا

اسے یاد آیا جب وہ شہر میں داخل ہوا تو گرد سے اس کا حلق خشک تھا سر کے بال اس کے اپنے معلوم نہ دیتے تھے۔ مٹی سے اٹے ہوئے پاؤں۔ بالوں میں جمی ہوئی گرد اجنبیت اور شہر دور دور۔ کوئی ساتھی نہ تھا۔ قدم رک رک کر اٹھتے تھے۔ مگر وہ چلتا رہا چلتا رہا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ اس نے ایک نیا جہاں آباد کرنا ہے جہاں لگان تحصیلدار ذیلدار زمیندار گاؤں کا منحوس بنیا کچھ بھی نہ ہو گا۔ کئی دفعہ مشکلات کے تصور سے تلملا اٹھا تھا۔ اس نے سوچا تھا۔ کہ میری روح کبھی سیراب نہ ہو گی۔ کوئی ساتھی نہیں، زمین نہیں، کھلیان نہیں۔ روح کی تشنگی اور دیوانگی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کھلیان گیا گاؤں گیا۔ ہمدم گئے اور لگان تو ادا کرنا ہی پڑے گا۔ وہ ماتی ہے۔ وہ سب کے ذمہ ہے کوئی گاؤں۔ کوئی کسان اس سے نہیں بچا۔ کسی کسان نے کھلیان کو آگ نہیں لگائی۔ کسی نے کسی بڑی قربانی کا تہیہ نہیں کیا۔

اسے یاد تھا کہ جب وُہ گاؤں سے نکل رہے تھے۔ تو ان کو ہانکے حجام کی ماں ملی تھی۔ اس نے بڑی دعائیں دی تھیں۔ وہ ہم سب کو اکٹھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ ماتو نے اُسے گیہوں دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس نے اسکا وعدہ یاد بھی دلایا۔ وُہ غریب بالکل نہ جانتی تھی۔ کہ ہم لوگ گاؤں سے ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ اور کسی ایسی سمت کو جا رہے ہیں۔ جہاں قرضہ بنیا تحصیلدار اور لگان کچھ نہ ہوگا

ہم نے جب گاؤں چھوڑا۔ تو ایک ایک درخت گن رہے تھے۔ زمینوں کی وسعت گاؤں کا ہر مکان ایک ایک زخم نظر آ رہا تھا وہ شہتوت کا پرانا درخت وہ آڑو کا بل کھاتا ہوا پانی۔ وُہ میدانوں میں کھیلتے ہوئے بچے کتنے خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے بیشرو اور ناجی کو پہچان لیا تھا۔ وُہ بڑھ کے تنے کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ ایک نے کہا تھا۔ وار دپنے جا رہے ہیں دوسرا بولا ڈھلوان کے پیچھے بیٹھ کر جوا کھیلیں گے تیسرا کہنے لگا سائیں کاتو کے تکیہ میں سب مل کر چسکا اڑائیں گے۔ بچوں کا خیال آیا۔ تو بچے بھی یاد آ گئے۔ جو جو کچھ یاد آ رہا تھا جلندہ کے بیان سے باہر تھا۔ اس نے خیال کیا کہ جب سے گاؤں چھوڑا ہے۔ میں نے اپنی بساط سے زیادہ محنت کی ہے اسے شرمندگی کا احساس ڈبوئے جا رہا تھا اس نے اپنی حالت کو بہتر بنانے کیلئے کیا کچھ نہیں کیا چوری بھی کی۔ جوا بھی کھیلا تھا کونسی برائی ہے جو نہیں کی نیکیاں بھی کر کے دیکھ چکا ہوں۔ مگر وُہ حالت جس نے ہر ممکن، اور ناممکن کام پر مجبور کیا۔ آجتک نہ بدل سکی۔ میری بیوی کو شک سا ہونے لگا ہے۔ کہ میں اب محنت کی طرف پوری توجہ نہیں دیتا۔ روپیہ ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کرتا۔ وُہ نہیں جانتی۔ میں کیا چاہتا ہوں اور وُہ کیوں نہیں ہوتا

وُہ کل کہہ رہی تھی۔ پیر جمن کا عرس ہے۔ دیکھنے جاؤنگی۔ بسوں پر بھی ملوں گی۔ اچھے اچھے کپڑے پہنوں گی۔ وہ میرے ساتھ شانے سے شانہ ملائے ہجوم میں جائے گی۔ میری بیوی میری راحت کا سامان ہے جب میں محنت و مشقت کے بعد گھر واپس آتا ہوں۔ تو میری زندگی میں اُبھار و غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا انمول پیار مجھے ایسی دنیا میں اٹھائے رکھتا ہے۔ جہاں سوائے ایک دوسرے کے اعتماد کے اور کچھ موجود نہیں۔ وہ کتنی اچھی ہے۔ اس کا برتاؤ ہمیشہ خوش کن ہوتا ہے۔ میری بیوی کے دل میں اکثر امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ان کے زیر اثر ہمیشہ اپنے آپ کو دوسروں سے بلند تصور کرتی ہے۔ وُہ مجھ پر بڑا فخر کرتی ہے۔ اس کو میری کمائی کا احساس ہے۔ وُہ اسے پاک اور حلال کی کمائی خیال کرتی ہے۔ ایک دفعہ میں اسے سرکس دکھانے لے گیا تھا۔ اسے ہاتھی، شیر، چیتے دیکھنے کا بہت شوق ہے اب بھی جب کبھی کہتا ہوں کہ تجھے پھر سرکس دکھانے لے جاؤنگا۔ تو بڑے پیار میں آ جاتی ہے۔ میری بڑی خاطر و مدارات کرتی ہے۔ اس وقت اس کے دل میں گدگدیاں سی ہونے لگتی ہیں اُسے خوش رکھنا بھی کتنا آسان ہے!

جب وُہ پہلے پہل سرکس دیکھنے گئی تھی۔ تو وہاں اس نے بہت سی مختلف قسم کی عورتوں کو دیکھا تھا۔ انکے متعلق اُس کے نظریئے بہت دلچسپ تھے۔ وہاں ایک میم تھی جب وُہ کسی بات پر ہنس دیتی تھی۔ تو وُہ کہتی تھی: ”دوسروں کو دکھانے کے لئے ہنستی ہے۔ اس کا اپنا آدمی تو کہیں نظر ہی نہیں آتا۔

ماموں کی بیوی بیوی تھی۔ ماموں کی بیوی ہم سب کی ماں تھی ہم سب اسے بہن کہہ کر پکارتے تھے۔ ہم میں سے وہی تو ایک شادی شدہ تھا۔ جب ہم نے گاؤں چھوڑا تھا اس وقت اس نے بہت سی روٹیاں پکا کر دی تھیں۔ آم کا اچار پیاز، کیا کچھ نہ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنی آس تھی کہ ہم جلد واپس لوٹ آئیں گے بھلی عورت تھی۔ وہ ہماری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اُسے کس نے بتایا ہوگا۔ مگر اس کا خاوند راستے میں چل بسا۔ اچھے گھرانے کی لڑکیاں ہمیشہ ایسی ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ کھیتوں میں ہم سب آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ تو وہ ماموں کے لئے روٹی لائی لسی اور اچار بھی تھا کانسی کے پیالے میں سب کو تھوڑا تھوڑا پلاتی جاتی اور مسکراتی جاتی تھی۔ آہ! اگر زمیندار نے اسے تنگ کیا تو میں اس کا خون پی جاؤں گا

اسے یاد آیا کہ پہلا زمیندار ایک نیک دل انسان تھا۔ اُس کا زمانہ بہت اچھا تھا۔ لیکن وہ جلد ہی مر گیا تھا ہم سب مل کر اس سے چوسر کھیلا کرتے تھے کہتا تھا ہم سب ایک ہی مٹی سے بنے ہیں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک دفعہ جوہڑ کے قریب ایک سیاہ ناگ نکل آیا تھا تو وہ زمیندار نے ہی مارا تھا۔ کہتا تھا یہ میرا ہی حق ہے ممکن تھا کہ وہ جوہڑ کے سارے پانی میں زہر ملا دیتا۔" جب کبھی وہ کوئی نئی بات سُن پاتا تو ہمیں سنانے کے لئے کھیتوں کی طرف اس طرح بھاگا آتا۔ گویا اسے کوئی اشد ضروری کام یاد آ گیا ہو۔

ہمارے گاؤں کا جوہڑ کتنا من موہنا تھا۔ اس کا پانی کیسا نتھرا ہوا ہوتا تھا برسات کے دنوں میں تو اس کی کیفیت نہایت ہی خوشگوار ہوتی تھی۔ ہم اس میں مچھلیاں پکڑا کرتے تھے وہاں کبھی کبھی مرغابیاں بھی آ کر بسیرا لیتی تھیں ایک دفعہ جوہڑ کے کنارے جیناں کو مجھ سے پتھر لگ گیا تھا جیناں کا نام یاد آتے ہی ملدہ کی حالت عجیب سی ہو گئی جیناں بالکل نہ روئی تھی۔ وہ یہاں یہ شکایت تک نہ لائی تھی بلکہ ہنس کر کہتی تھی۔ جیناں کی آنکھ ہے نوراں کا گھڑا نہیں جو ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ جائے وہ کتنی دلفریب تھی۔ گاؤں میں جیناں تھی نوراں بھی تھیں ہمارا گاؤں گاؤں ہی تھا شہر میں رکھا ہی کیا ہے شہر بھی کبھی گاؤں بن سکتے ہیں؟ ہم تو اپنے جوہڑ میں اکٹھے ہی نہایا کرتے تھے۔ جیناں دیکھتے دیکھتے تیراک بن گئی تھی وہ ایک تند تیراک تھی سوہنی نے بھی ایسے خراٹے نہ بھرے ہونگے وہ کس طرح بے دھڑک میرے بازوؤں پر سے جنگلی مچھلی کی طرح اچھل جاتی تھی نوراں بھی اچھی تھی وہ جیناں کی رازدار تھی مگر وہ اس سے کتنا رشک کرتی تھی جیناں کی یاد۔ اور دوسری یادوں کے بہاؤ کو وہ کیسے روکتا وہ کسی کو بھی ٹھکرا نہ سکتا تھا۔

گیہوں اور باجرے کے کھیت اور ان کی عارضی پگڈنڈیاں جو جیناں کی راہ گزر کے نشاں تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے ہرے بھرے پودے کونپلوں جیسے بھٹے کھیلتے اور جھکتے ہوئے جوار کے تنے نظر آئے۔ وہ ہرے ہرے کھیت ان میں جیناں کونج کی مانند گردن اٹھائے کچھ ڈھونڈتی ہوئی جیسے کچھ کھو گئی ہو اس کا رواں رواں جوان تھا۔ وہ گاؤں کے بیلے پر اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھی وہ بل کھاتی۔ جوہڑ میں گھس پڑ کر رہے ہوئے دن سے زیادہ سیتی نظر آتی تھی جیناں اسی گاؤں میں رہتی تھی جس کو ہم سب نے چھوڑ دیا تھا۔ ستدنی ہو کر رہتی ہے۔ جیناں نے بڑے وثوق سے کہا تھا" ساتھی ایک پل کے لئے چھوٹ جائے تو

بدھو کا مطلب اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔" وہ بھلے سانولی کر دھان کے کھیت لگایا کرتی تھی۔ جیناں کی آنکھیں صبح کے نکھرے ہوئے ستاروں کی مانند تھیں۔ اس کے لمبے لمبے بازو دھان کے کھیت پر اترتے ہوئے راج ہنسوں کے کھلے ہوئے پر معلوم دیتے تھے۔ وہ اپنے بالوں کو جو اس کی نشیلی آنکھوں کے سامنے آ کر ناچنے لگتے گھڑی گھڑی سنبھالتی رہتی تھی۔ جیناں گاؤں کی پالتو ہرنی تھی۔ وہ گاؤں کا نشان تھی۔ میں اکثر شہتوت کے درخت کے نیچے کھڑا اس کی پازیبوں کی جھنکار پر کان لگائے رہتا تھا۔ میں اس کو بے دھڑک سینے سے لگا لیتا تھا۔ میں اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم لیتا تھا۔ وہ اپنی معصومیت سے تھرتھرا اٹھتی۔ اور صرف اتنا کہتی تھی۔ "باپ کہتا ہے۔ بلندہ کا اس گاؤں میں کیا رکھا ہے۔ نہ زمین ہے نہ کھلیاں"

بلندہ زمیں پر دراز تھا۔ واقعات خودبخود اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ سوں یہ زندگی کے تار تھے جن کی امیدیں جھلک اٹھی تھیں۔ وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ جیناں اور وہ ... چاہتا تھا جیناں کو اک بار پھر یہ کہتے ہوئے سُنے "تمہاری اپنی زندگی ہے۔ وہی اس کی جوانی کی مسکراہٹ ہے" جیناں ایک دفعہ دوسرے گاؤں میں تماشا دیکھنے گئی تھی۔ وہ سب بیل گاڑی پر سوار ہو کر گئی تھیں۔ گاڑی کا پہیہ جوہڑ کے قریب دلدل میں پھنس گیا تھا۔ جب میں کا دھکا دینے کو بڑھا تو مِصیاں نے مجھے باجرے کا بھٹا دے مارا تھا۔ وہ ست رنگے میٹھی تھی۔ سرخ کپڑے موٹے موٹے چاندی کے زیور ظالم کو کیسے بھلے معلوم دے رہے تھے۔ واہ کیا پُرلطف منظر تھا۔ میں نے بھٹے کو زور سے لگا کر اٹھا دیا تھا اور جیناں کو کہا تھا کہ ذرا بیلوں کو ہانک دے تو بیلوں نے مڑ جانے کی کوشش کی تھی۔ اور میں جھٹکے سے گر گیا تھا۔ جیناں کس طرح کھلکھلا اٹھی تھی۔ اس نے سب کو نیچے اتار دیا تھا۔ اور بھی بہت سی لڑکیوں کے چہرے اسے باری باری یاد آئے جن سے وہ مانوس تھا۔ ایک کے بازو کھل گئے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر لیٹ گیا۔ اس کے دل کو ایک ٹھیس سی لگی۔ اس نے کہا "کتنے اچھے اور معصوم لوگ تھے۔ وہ جو گاؤں میں رہتے تھے"

جوہڑ کے پاس پیپل تلے ہوئے اسے اور بھی کئی واقعات یاد آئے۔ نقشہ بدل گیا۔ گیہوں کے کھیت دور تک جاتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس کا دل کھل گیا۔ کسانوں کی امیدوں کا یہی تو حاصل ہوتا ہے۔ مارچ کے مہینے میں جب گیہوں پک جاتے ہیں۔ کھیت وہ سنہرے سمندر دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ بوڑھوں سے لے کر بچوں تک خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ سفری پرندے دور دور سے آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ اُن کی آوازوں سے وہ ہرے بھرے کھیت اور بھی خوشنما معلوم دینے لگتے ہیں۔ صبح و شام ان کی میٹھی میٹھی آوازیں لہراتے ہوئے کھیتوں میں یوں سنائی دیتی ہیں جیسے کوئی کہہ رہا ہو "تمہاری محنت کا پھل پک کر تیار ہو گیا ہے"

پھر اسے وہ مختلف کردار نظر پڑے جن سے گاؤں کی زندگی تھی۔ ان میں ایک نہایت شاندار کردار بابا ہیرو تھا۔ اُسے یاد آیا۔ بابا ہیرو شہر سے تیتر اور بٹیر پکڑنے آیا کرتا تھا۔ کتنا بلند قامت بھاری بھرکم انسان تھا۔ اس کی آواز میں غیر معمولی وجاہت تھی۔ ڈاڑھی مہندی سے سرخ۔ آنکھیں موٹی موٹی پرمعنی۔ ناک لعل نما۔ سر کے بال کھڑے کھڑے بلند حوصلہ ہونے کا ثبوت تھے۔ جب بات کرتا تھا تو نیچے کا ہونٹ آگے

بڑھ جاتا اور پھر پھیلتا ہوا معلوم دیتا تھا۔ اس سے اس کی زبان میں لکنت سی آجاتی تھی۔ اور وہ معصوم سا دکھائی دینے لگتا تھا۔ گاؤں میں ایک دفعہ ایک دنگل ہوا تھا۔ لوگ جوق در جوق ہمارے گاؤں میں جمع ہوئے تھے۔ نوجوان کیسے سنورے ہوئے نظر آتے تھے۔ لالو اور نیرو کی کشتی تھی۔ لالو نے نیرو کو پیٹ دیا تھا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ گاؤں میں ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی لوگوں کے دل بجھ گئے تھے۔ لیکن بابا تیرو نے نیرو کو گود میں ڈال کر اس کا بازو تھام لیا تھا۔ اور اس مہارت سے باندھا تھا۔ کہ صحت مند ہو جانے پر نیرو خود بھی بھول چکا تھا کہ اس کا بازو کبھی ٹوٹا بھی ہے بابا تیرو اس وقت کتنا جوان نظر آرہا تھا۔ اسے اپنے فن پر کتنا بھروسہ اور کتنا اعتماد تھا۔ وہ کبھی کبھی ہمیں شہر لے جایا کرتا تھا۔ اسے ہم گاؤں والوں سے لگاؤ تھا۔ وہ ہمیں اپنے بچوں کی طرح چاہتا تھا۔ وہ پتنگ بھی اڑایا کرتا تھا۔ ایسے ایسے کھیلوں میں زندگی نظر آتی تھی۔ کہا کرتا تھا: "یہ سب کچھ تازہ دم اور جوان رہنے کے ذریعے ہیں" وہ شہر کا رہنے والا تھا شہر سے اس نے ہمیں مانوس کرایا۔ میں آج شہر میں ہوں شہر میری روزی کا ذریعہ ہے۔ ان دنوں تو شہر رومان نظر آتے تھے آج میرا گاؤں ہر گاؤں ایک رومان بن رہا ہے۔ مجھے کوئی گاؤں سے جانے مجھے کوئی گاؤں کا باشندہ کہہ کر پکارے۔ آج برسوں کے بعد بلندہ کو گاؤں کی دھول آنکھوں کی بصارت کا سامان نظر آرہی تھی۔ اٹھتا اور لیٹ جاتا۔ وہ جھنجھلا اٹھا۔ کہ گاؤں چھوڑا کیوں؟ جوں جوں سوچتا۔ پریشان ہوتا جاتا تھا۔ نیند آنکھوں سے خفا تھی۔ بے مائیگی نے گذشتہ یاد کو اور بھی تازہ سا دیا تھا۔ بے کلی میں شانہ بیوی کے جسم سے چھو گیا تھا۔ بیوی نے پہلو بدلا اس نے دیکھا کہ بلندہ منہ موڑے پڑا تھا۔ اور وہ اس کے تاثرات کا احساس نہ کر سکی اور پہلے کی سی نیند سو گئی۔

اس نے خیال کیا وہ گاؤں چلا جائے اور زمین کا تقاضہ شروع کر دے۔ لگان میری گردن پہ ہے میں ادا کر سکتا ہوں۔ بنیا کیوں مرا ہوگا اس کا بھی ایک ایک پیسہ چکا سکتا ہوں مجھے گاؤں جانا چاہیے مجھ میں حالات پر قابو پانے کی اہلیت ہے۔ تحصیلدار، ذیلدار، بنیا ذرا بھی ہچکچائے تو انہیں قتل کر دونگا قتل ہو گیا تو کیا۔ پھانسی لگ گیا تو کیا۔ گاؤں میں پھر ایک تبدیلی واقع ہوگی جس کا باعث ماتو نائی اور شیرو کا ساتھی بلندہ ہوگا۔

گاؤں کی یاد کے ساتھ ساتھ ہر بات کی یاد عود کرتی چلی آتی تھی۔ کھیتوں کی ڈھلوانوں پر وہ رومان بھری راتوں میں مٹھیا، وہ گیت بھی یاد آرہے تھے۔ جو وہ راتوں میں گایا کرتے تھے۔ اور ان گیتوں میں کس کس بھانی لڑکیوں کو خطاب کیا جاتا تھا۔ بلندہ کا انتخاب جنیاں، نوراں، اس کو سب کچھ یاد تھا۔ صرف اتنا چاہتا تھا پھر ایک بار وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے جا دیکھے، زمین پر قبضہ کرے، بیلوں کو ہانکنے لگے۔

گاؤں کی یاد کے ساتھ گاؤں کے سارے فرائض کا بوجھ اسے اپنے کندھوں پر محسوس ہونے لگا۔ ماتو کی بیوی ماتو کا بچہ اس کی بوڑھی ماں کیا کیا بھلاتا اور کیا یاد میں لاتا۔ یہاں بھی وہاں بھی مزدور کی حیات تنگ ہے۔ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ پاس بیوی گہری نیند سوئی پڑی تھی۔ اس کے سانسوں میں سوائے بے فکری کے اور کچھ نہ تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں تازگی تھی۔ چہرے سے بلند ہمتی برس رہی تھی۔ بولا جو کچھ ہے گاؤں میں ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر گاؤں چلا جاؤں گا مجھے جانا ہی ہوگا۔ کچھ نہیں تو اسے دور سے ہی دیکھ آؤں گا۔ وہ میری پیدائش

کی جگہ ہے۔ میرا خمیر اس کی مٹی سے بنا ہے۔ روح کی تسکین کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ میں ایک بار پھر مقدر آزمائی کروں ہمت کروں اپنا گاؤں ایک بار تو ضرور دیکھنا ہی ہوگا۔ مجھے گاؤں ضرور دیکھنا ہے

اندھیرا چاروں طرف اندھیرا تھا۔ سرسوں کا تیل ختم، دیا بجھ چکا تھا۔ سردی لمحہ بلمحہ بڑھ رہی تھی۔ بیوی کی طرف پلٹا تو وہ سمٹی سمٹائی پہلی سی گہری نیند سو رہی تھی۔ خود بھی دوبارہ دراز ہو جانا چاہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ احاطہ جہاں وہ رہتا ہے۔ جہاں اسے اطمینان ملتا ہے ایک بھدی سی دیوار سے گھرا ہوا ہے۔ جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی ہے۔ ذرا سے دھماکے سے اس کی اینٹیں گرنے لگتی ہیں۔ اُسے محسوس ہونے لگا۔ کہ لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ سہانی رات ختم ہو رہی ہے۔ رات کے ختم ہوتے ہی تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور صبح وہ پھر اپنی مزدوری میں پورے اطمینان سے محو ہو جائیگا۔

دُور سے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ ایک مرغ پھر پھڑپھڑایا۔ اُسے تشفی سی ہوئی۔ اب دن چڑھا کہ چڑھا۔ بلندہ جس احاطہ میں رہتا تھا۔ وہ کئی قسم کے لوگوں سے آباد تھا۔ فرسودہ دیواریں ٹوٹے پھوٹے تختے گھاس پھوس اور بھوسے کے ڈھیر الٹی سیدھی چٹایاں گرد اور اوپلوں سے اٹی ہوئی دیواریں۔ گاڑی بانوں کے بے رونق سے گھر ان کے تانگے۔ ٹوٹی ہوئی گاڑیاں شکستہ پہیئے یہ وہاں کی دولت تھی۔ یہ وہاں کی کائنات تھی۔ جو قدم قدم پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ گاڑی بانوں نے اس احاطے کا کافی سے زیادہ حصہ اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ اور بھی بیسیوں قسم کے لوگ اور ان کے بھائی بند اُن کے ساتھ آباد تھے۔ اور ان کا آبائی پیشہ ان سے ملتا جلتا تھا۔ گاڑی بانوں نے حفظانِ صحت میں کافی سے زیادہ دلچسپی لے رکھی تھی۔ مگر پھر بھی صبح ہوتے ہوتے اتنا گوبر جمع ہو جاتا تھا۔ کہ گھوڑوں کے سُم کیچ کیچ کرتے ان میں دھنس جاتے تھے۔ احاطہ میں ایک گروہ اور بھی رہتا تھا۔ جن کی عورتوں نے مرغ اور مرغیاں کثرت سے پال رکھی تھیں۔ گاڑی بانوں میں اور ان وحشت خیز عورتوں میں اکثر جنگ چھڑی رہتی تھی۔ اور یہ سلسلہ اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ ہفتوں ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ گاڑی بان بھی بڑی جرأت سے کام لیتے تھے۔ مرغے مرغیاں اٹھائے جو ہاتھ لگتا تھا چٹ کر جاتے تھے۔ کبھی کبھی یہ جنگ جنگِ عظیم کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اور ان دونوں فریقوں کو اپنے اپنے جوہر دکھانے کا بہت موقع ملتا تھا۔ احاطہ کے اندر ایک بوسیدہ سی انگنائی تھی۔ اس میں ایک مبہم سا انسانی جوڑا رہتا تھا۔ خاوند پہلے درجے کا شرابی اور جواری تھا۔ عورت کی شکل ڈائن کی سی، گویا رنگی ہوئی ہنڈیا کسی مکان کی دیوار پر لٹکا دی گئی ہو۔ پریشان بال چپٹا ناک، کھلے ہوئے ہونٹ، بیٹھی بیٹھی آنکھیں۔ لیکن جتنا اتفاق اور پیار اس جوڑے میں تھا۔ اتنا کسی اور میں نہ تھا۔ کوئی ان کی مثال پیش نہ کر سکتا تھا۔ ان کی محبت اور چاہ پر سب احاطہ حیران تھا۔ ان کے رازِ محبت کو جاننے کے لئے ہر کوئی بیتاب ہی رہتا تھا۔ ایک چادر ان کی کوٹھڑی کے دروازے پر برسوں سے پڑی چلی آتی تھی اب اس کے چیتھڑے ہو گئے تھے کئی روزن تھے جن کے پیچھے وہ برسوں سے اکٹھے رہتے سہتے چلے آتے تھے

بلندہ بھی اس بستی کا ایک باشندہ بن گیا تھا۔ وہ ان سے مانوس ہو چکا تھا۔ لیکن اجنبیت کا احساس ابھی تک اس کے ذہن سے گم نہ ہوا تھا۔ مرغوں کی بانگ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سبھی کچھ تھا۔ وہ اس ماحول کا رہنے والا تھا۔ لیکن گاؤں کی یاد نے اور ان فرائض

نے جو اُسے سنا رہے تھے۔ بالکل بیگانہ سا بنا دیا تھا۔ دور احاطہ کی دیوار کے پار آنے جانے والوں کے چلنے کی آوازیں کچھ اور بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کی آہٹ اُسے کچھ ایسی معلوم ہونے لگی۔ جیسے چلنے والوں کے جوتوں کے نیچے لوہے کی بڑی بڑی میخیں لگی ہوئی ہیں۔ گویا کوئی پیادہ فوج کوچ کر رہی ہو۔

اس کی آنکھوں میں جنگ کا نقشہ کھچ گیا جو اُسے سنائے افسانے میں جنگ کے کردار کیا گیا تھا جس سے اس کے دل میں بھی ایک حرکت اور ایک ولولہ سا آگیا۔ اس کا ہیجان بڑھتا جا رہا تھا۔ وُہ دیکھ رہا تھا۔ کہ جنگ ساری دنیا کو ایک سمت کی طرف کھینچے جا رہی ہے میں بھی جانے والوں کے ساتھ ہو لوں جنگ پر گیا ہوا کوئی قسمت والا ہی لوٹتا ہے۔ بابو اور اس کے ساتھ جو گاؤں سے جنگ پر گئے تھے واپس نہ آئے تھے دیوار کے پار چلنے والوں کی آوازیں کچھ اور نزدیک آگئیں، اس کا جوش اور بڑھ گیا اور ساتھ ہی ہمت بھی بڑھ گئی تھی۔ یکلخت وُہ بیتاب سا ہو گیا۔ بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی تھی نگاہیں دیکھ بھال میں تھیں۔ کہ دور ایک ستارہ چاند کی مانند چمکتا کستاں کستاں ڈھلتا ہوا دکھائی دیا یہ ستارہ صبح سے پہلے پورے جمال پر ہوتا ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے اڑنے کے لئے پر تول رہا ہو۔ باہر جھانکنے لگا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کالے کالے دھبے آگے کی طرف سرکتے ہوئے دکھائی دئے آوازیں اور بھی بلند ہو گئی تھیں۔ وہ زیادہ توجہ اور نگاہوں کو پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ گاؤں کے اکثر لوگ فوجی وردیوں میں ملبوس نظر آ رہے تھے اب پو پھٹ رہی تھی نظر آنے والے چہروں کے متعلق کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔ سمجھتا تھا کہ سب دیکھے بھالے ہیں۔ وُہ دیوار پر چڑھ گیا۔ اور دل دھڑک لیکا اور دیوار پھاند گیا۔

وُہ سوچ رہا تھا کہ سبھی ہیں قطار در قطار چلے جا رہے ہیں۔ قربان گاہ کی طرف وہ بھی ان میں مل گیا اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ سوائے اس کے محکوموں کے سر پر یہ بھی ایک لگان ہے۔

حیات اللہ انصاری

ہانمت

اس زمانے کا قصہ ہے جب ہم لوگ دنیا کے پندرہ ہزار برس پرانے تمدن موہنجوداڑو کی نشانیاں کھود کھود کر نکال رہے تھے۔ ایک شام کو کام سے فارغ ہو کر جیسے ہی ہم لوگ کیمپ پر آئے چاروں طرف سے بادل گھر آئے اور کھانے سے فارغ ہونے تک تو ایسا اندھیرا ہو گیا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ کوندا چمک رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ہماری کھدوائی سے بنے ہوئے ٹیلے اور گڈھے بے حد بڑے اور پُر اسرار معلوم ہو رہے تھے۔ اتنے میں ہم نے سر پر ایک گھڑگھڑاہٹ سی سنی۔ اوپر اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ گھڑگھڑاہٹ بہت تیزی سے بھاگتی ہوئی موہنجوداڑو کے کھنڈروں تک پہونچ کر بند ہو گئی۔ ہم لوگ سب کو تعجب ہو گیا کہ یہ بادل کی گرج نہیں ہے۔ پھر کیا ہے؟ میرا خیال تھا کہ کوئی ہوائی جہاز ہے جو مشین کی خرابی کی وجہ سے نیچے اترنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ لیکن میرے دوسرے ساتھی پروفیسروں کو اس میں شک تھا۔

تھوڑی دیر میں کھنڈروں کے پاس پھر وہ آواز سنائی دی۔ اتنے میں کوندا لپکا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بہت بڑا پرند اڑا جا رہا ہے اس کے پروں پر سرخ، نیلے، زرد، اور سبز رنگ سے معلوم ہوئے۔ مگر ایک دوسرے میں ایسے ملے جلے نظر آئے کہ یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ کون حصہ کس رنگ کا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اس کے پروں کی حرکت جو دیکھی ہے وہ قدرتی نہیں مصنوعی ہے اس لئے وہ یقینی ہوائی جہاز ہے لیکن میرے ساتھیوں کو اب بھی شک تھا۔

صبح کو جب ہم لوگ موہنجوداڑو کے کھنڈروں میں پہنچے تو وہاں کی نرم مٹی پر ایسا نشان ملا جو صرف کسی لوہے کی مشین کا ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھیوں کا شک اب بھی دور نہیں ہوا تھا کہ اتنے میں ایک کتاب پر نگاہ پڑی میں نے دوڑ کر اسے اٹھایا تو وہ کتاب نہیں ایک کاپی تھی جس کی تحریر تو میں اس وقت نہیں پڑھ سکا مگر اس کے وجود نے میرے ساتھیوں کا شک دور کر دیا

کاپی کی جلد پر جو نقش و نگار تھے وہ ایسے انوکھے تھے کہ بہت غور کرنے پر بھی نہیں طے ہو سکا کہ یہ کس تمدن کی پیداوار ہیں۔ ان میں کرسیاں پر کرسیاں اسی طرح بنی ہوئی تھیں جیسے بدھ گیا کے مندر پر مگر ان میں کنگورے اس طرح کھیچے ہوئے تھے کہ دونوں چہرے الگ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کنگوروں کی بناوٹ ٹھیک ٹھیک تھی۔ انسانی شکلوں کا تناسب وہی تھا جو ایلورا اور اجنٹا میں نظر آتا ہے لیکن گردن کی لمبائی میں مصری آرٹ کی شباہت تھی۔ عمارتوں کی بناوٹ وہی تھی مگر اس میں ہندو کاریگری کی دیدہ ریزی سے کچھ ایسے نقوش بنے تھے جو قصر الحمرا کے طغروں سے ملتے جلتے تھے۔ بعض بعض شکلیں ایسی بھی تھیں جو چینی اژدھے سے مشابہ تھیں۔ بہ سمندر سمندر کے موتی اس طرح پروئے ہوئے تھے کہ مل کر

اک زنگا بار بن گئے تھے۔

تمدنوں کا اتنا گہرا ملاپ نہ تو دو چار شخص پیدا کر سکتے ہیں اور نہ اس کے لئے ایک آدھ قصبہ ہی کافی ہو سکتی ہے۔ یہ آرٹ کسی متمدن قوم کی صدیوں کی ترقی کی نشانی معلوم ہوتا تھا۔ مگر سوال یہ اٹھتا تھا کہ خیالات و جذبات کا وہ مشترک رشتہ کب ہو سکتا ہے جس نے ایسے رنگ برنگ موتی نتھی کر لئے۔

بعد کے نقوش کی طرح کابلی کی زبان اور رسم خط بھی مختلف زبانوں اور خطوں کا معجون مرکب تھا۔ اس وجہ سے ایسے اشارے مل گئے کہ پڑھنے میں زیادہ دقت نہیں اٹھانی پڑی۔ یہ کسی شخص کی ڈائری تھی۔ اسے پڑھ کر مجھے اتنی حیرت ہوئی جتنی زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ واقعہ ہے اور نہ یہ یقین آتا تھا کہ دنیا میں کوئی ملک ایسا ہو سکتا ہے جہاں سائنس اور فلسفہ اتنی ترقی کر گیا ہو۔ اور پھر بھی وہ نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اگر میں نے وہ عجیب ہوائی جہاز اپنی آنکھوں سے تندرستی کی حالت میں نہ دیکھا ہوتا تو میں اس ساری تحریر کو کسی تخیل پسند مصنف کی پروازِ خیال سمجھتا۔

ڈائری کے لئے پڑھنے والا اب اتنا بے چین ہوگا کہ اسے میری حیرت کی رام کہانی سے الجھن ہونے لگی ہوگی۔ اچھا لیجئے ڈائری دیکھیے۔ آما اور نیا دوں کہ ڈائری میں بہت سے انگریزی، سنسکرت، فرانسیسی، چینی اور پراکرتی زبانوں کے الفاظ تھے جو اپنی اپنی جگہ پر بالکل ناموزوں معلوم ہوتے تھے۔ غالباً اس عجیب تمدن میں ہو کر ان کے معنی بدل گئے تھے۔ میں نے قیاس سے ان کی جگہ بامعنی الفاظ رکھ دیئے ہیں۔ جہاں جہاں موزوں لفظ نہیں ملا وہاں اصل لفظ کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ان باتوں کی تشریح جا بجا حاشیہ میں جس کا ڈائری کے ساتھ ساتھ دیکھنا بہت ضروری ہے، کر دی گئی ہے۔

ڈائری

۱۲ر ستمبر ۲۰۰۱۲ سنہ تمدن[1] میں بال بال بچ گیا ورنہ بڑی بڑی موت کا شکار ہو گیا ہوتا۔ جان بچنے کو تو بچ گئی۔ مگر دماغ کو ایسا دھچکا پہنچا ہے کہ ابھی تک حواس بجا نہیں۔ دل ایسا کانپ رہا ہے جیسے پانی پر تیرتا ہو۔ پتہ نہیں کیسی آفت آ گئی۔ یا تو کل بازار میں اسی چہل پہل تھی یا دیکھتے دیکھتے یہ حال ہو گیا کہ پنچھی کچھے کرتے اور ساریاں ادھر ہیں تو گھبراہٹ میں چھوٹی ہوئی ٹوپیاں اور جوتیاں ادھر ادھر زخمی سسک رہے ہیں تو ادھر کچلی کچلائی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ حالت یاد کر کے اپنے جان بچنے کی خوشی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ پھوٹ پھوٹ روؤں۔ کیسا غضب ہے! کیسا اندھیر ہے! کیسی اچانک تباہی ہے!

آج دن بھر وہ دو لوں کے جھکڑ چلتے اور وہ گرد و غبار اڑا۔ سورج کو دیکھو تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کی کھال کھینچ لی ہے اور نیچے سے جیتا جیتا گوشت نکل آیا ہے۔ دن بھر لوگ تو گھروں میں دبکے پڑے رہے اور سڑکوں اور گلیوں پر بگولوں کے غول ناچتے رہے۔ اس

[1] سن اس اور ان مہینوں کی کوئی تحقیق نہیں ہو سکی۔

گرمی کی شدت کی کسر یوں نکلی کہ ادھر سہ پہر ہوئی لو رکی اور شمالی[۱] ٹھنڈی ہوا کا پہلا جھونکا آیا کہ لوگ نہا دھو کپڑے بدل گھروں سے نکل پڑے۔ آج کی اتنی بھیڑ مہینوں سے گول بازار میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

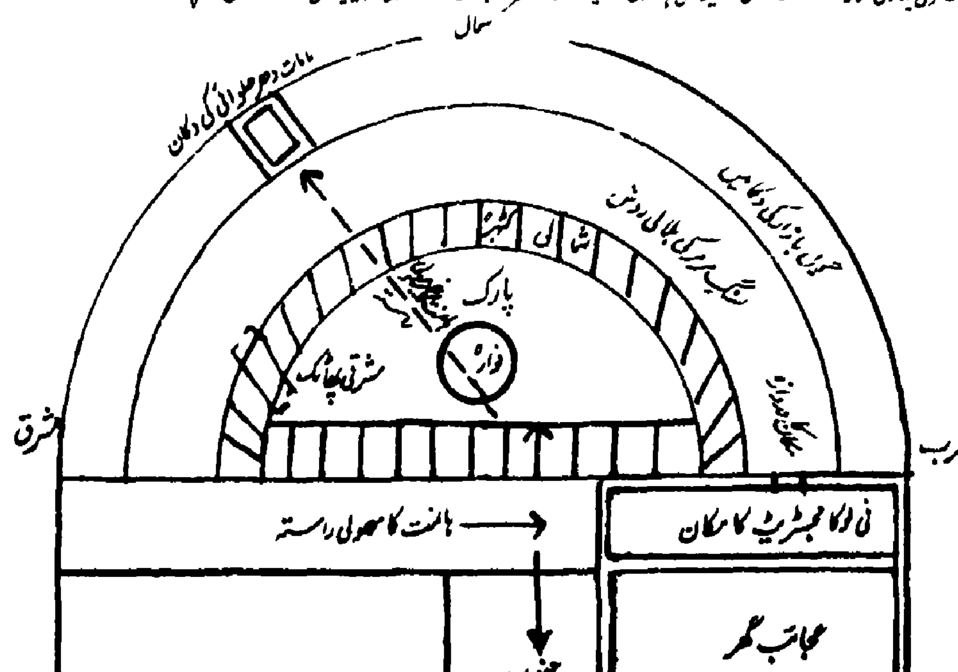
شربت والوں گنڈیری والوں اور بالائی کی برف والوں کی صدائیں ہزاروں قدموں کی چاپ۔ مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کو دور سے پکارنا سلام کرنا اور ہنسنا۔ بچوں کی سیٹیاں اور خوشی کی چیخیں۔ سفید پگڑیاں اور رنگ رنگی ساڑیاں چم چم کرتے لال اور کالے جوتے اور موروں کے پروں کی ایسی رنگین چپلیں گھسی مونچھوں کے اوپر جوانی کی مستی چڑھی آنکھیں۔ سیاہ بالوں کے دل میں سفید نگوں کے کانٹے۔ رسیلوں اور سجیلوں سے بھرپور سفید اڑھنیاں لٹکتے ہوئے رومال۔ بھربھری کلائیوں اور صراحی دار گردنوں میں پہنے ہوئے گجرے۔ ہر طرف ہنسی۔ ہر طرف رنگ۔ ہر طرف خوشبو۔ وہاں پہنچتے ہی خوشی کا نشہ چڑھتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ساری دنیا خوشگوار موسم سے شکست کر کے ساونی شام کی پیشوائی کے گیت گا رہی ہے۔

میں سیٹھ مرکی ہلالی روش پر ٹہلتا دائیں طرف کی سجی دکانوں اور ان کے خریداروں کو دیکھتا بائیں طرف پارک کے پھولوں کی کیاریوں سے آنکھیں سینکتا پارک کے گرد نیم دائرہ بنا کر اس کے مشرقی پھاٹک تک جا پہونچا۔ پارک کے اندر گیا۔ وہاں کالج کے لڑکے لڑکیاں تماشا منانے کو آگئیں تھیں۔ لڑکے کبڈی کھیل رہے تھے اور لڑکیاں گھاس پر لیٹی کچھ بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں۔ بالائی کی برف کھا رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ ان سے گذر کر فوارے کے پاس بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بچہ اپنے دوست کے کو بسکٹ کھلا رہا تھا۔

یہی دیکھتا ہوا میں پارک کے کٹہرے کے جنوبی حصہ کی طرف جا پہونچا جہاں مردوں عورتوں جوانوں بوڑھوں اور بچوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ بانسٹ[۳] کو گاتے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے مگر ابھی تک لوگوں کا شوق کم نہیں میں نے اب تک اس کو صرف دو بار دیکھا تھا اس لئے میں بھی آج آبا۔ آج اس کی زیارت پھر کی جائے میں عجائب گھر کے برابر جہاں سے بانسٹ جنوب کی طرف عدالت روڈ پر مڑا کرتا تھا کھڑا ہو گیا۔ بانسٹ کے آنے کا وقت آگیا تھا۔

---

[۱] ہوا کوئی بیماری ملا دیتی ہے۔ [۲] جہاں تک میرا خیال ہے گول بازار پارک عجائب گھر اور بانسٹ کے راستہ کی جغرافیہ یہ ہوگی۔ [۳] نون غنہ پڑھا جائے



نیلے آسمان اور سفید عمارتوں کے پس منظر میں بارہ فٹ کا [illegible] ہانٹ 'ڈبو کا دیو' ایک ہاتھ سے پانی کا چھکڑا گھسیٹتا، دوسرے میں پیپ لیے پانی چھڑکتا چلا آ رہا تھا۔ پاؤں بھاری تو ہاتھی کے ایسے مگر پھرتی ان میں تازی کتوں کی ایسی۔ سینہ کا ڈھول جیسے ریل کے انجن کی شکل مگر کمر میں چیتے کا لوچ۔ گردن جیسے ربڑ کی نال۔ مگر اس میں کالے سانپ کی لہر آواز جیسے ... کی کرچ مگر اس میں چیل کی پکار کا اتار چڑھاؤ۔ اس میں شبہ نہیں کہ انجینئر[1] نے ہانٹ تک مشینی ترقی کو کمال پر پہنچا دیا جب انسان نابود ہو گیا۔

ہانٹ ایک فٹ پاتھ پر بہت ہی سست اس کے پاؤں کی دھمک آنے لگی دھم دھم —— دھم دھم۔ ساتھ ساتھ اس کا لاؤڈ سپیکر ہٹو بچو اور چھکڑے کی گھڑگھڑاہٹ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بہت بڑی سڑک کی تیاری ہو رہی ہے کوٹنے والا انجن لگا ہے اور سینکڑوں ڈھرمٹ چل رہے ہیں یا کوئی پلٹن کی پلٹن توپیں گھسیٹتی دھاوا کرتی چلی آتی ہے۔

جب ہانٹ اپنی مرضی کے اندروں نے پارک کی آہنی چکر مکر کرتا ہٹو بچو چلاتا پارک کے سامنے آگیا تو اس نے حسب معمول گردن گھما کر ذرا مسکرا کر ہم سب کو سلام کیا۔ اسے دیکھ کر یہ یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ یہ جھوٹ موٹ کا آدمی ہے۔ وہ پانی چھڑکتا ہوا عجائب گھر کے برابر سڑک کے موڑ تک پہنچ گیا۔ اب اسے حالت رو بہ جنوب کی طرف مڑنا چاہیے تھا ورنہ عجائب گھر سے ٹکرا جاتا۔ آج نہ جانے اسے کیا سوجھا کہ جنوب کے بجائے شمال کی طرف مڑ گیا۔ یعنی جدھر ہم لوگ کھڑے تھے یا پارک اور گولوں بازار تھا۔ اور اسی طرح پانی چھڑکتا کٹہرے تک آگیا۔ اس کی ایک ٹھوکر لگتے ہی کٹہرا اس طرح لٹ گیا۔ جیسے وہ لوہے کا نہیں سرکنڈوں کا بنا ہوا تھا۔ ہانٹ تو نکل گیا۔ مگر جب چھکڑا گذرنے لگا تو جھٹکے ہوئے کٹہرے نے بڑی بے بسی سے اس کے پہیے تھام لئے۔ شاید ہانٹ پر اس کا کچھ اثر ہوا اور وہ رکا۔ رکا تو نہیں۔ رکنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ بدل دیا۔ ایک جھٹکے میں کٹہرے کو ساتھ لے اس طرح کھنچا چلا آیا جیسے لوہا نہیں ململ کا تھان تھا۔ اس ذرا سی رکاوٹ پر ہانٹ کو غصہ آگیا اور وہ بہت زور زور سے چلانے لگا۔ اس کی "ہٹو بچو" "باؤ باؤ" ہو کر رہ گئی۔ کان پھٹے جا رہے تھے اور آس پاس کی عمارتیں تھرا رہی تھیں۔ ہانٹ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سارے مجمع کی وہ حالت ہو گئی جو بکریوں کے گلے کی ہوتی ہے۔ جب بھیڑیا حملہ کرتا ہے۔ آدمی پر آدمی گرنے لگا۔ مرد اور عورتیں چیخنے لگے۔ بچے رونے لگے۔ سب بدحواسی سے ادھر ادھر بھاگنے اور ایک دوسرے کو پکارنے لگے۔ آپس میں ٹکرا کر گر پڑے اور بھاگنے والوں کی لاتوں سے کچل کچل گئے۔ دو ایک تو ایسے بدحواس ہوئے کہ سیدھے ہانٹ سے جا کر ٹکرا گئے اور اس کے پاؤں کے نیچے آگئے۔

ہانٹ فوارے کے پاس پہنچا۔ ایک آیا بچے کی گاڑی چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ وہ ہانٹ کے سامنے پڑ گئی اور ایک ٹھوکر میں فٹ بال کی طرح اڑ گئی۔

اب ہانٹ کی راہ میں فوارہ تھا۔ اس نے ضرور کچھ رکاوٹ ڈالی۔ یہی کوئی آدھا سکنڈ۔ مگر پھر فوارہ ہی فوارہ معہ حوض کے دھڑام

---

[1] اس جگہ جو لفظ تھا اس کی تحقیق نہیں ہو سکی میں نے صرف قیاس سے اس کا ترجمہ انجینئر کیا ہے۔

سے نفرین پیدا ہوا۔ اور ہاملٹ چنگھاڑ اٹھا۔ سیدھا گول بازار کی دوکانوں کی طرف چلا۔ اس کا رخ مامات دھر حلوائی کی طرف تھا۔ فوارے کی رکاوٹ سے اس کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔ اب وہ اتنا چیخ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ طوفانوں کی گرج آکاش میں چھو جانے والے پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہے

اتنی دیر میں سارا پارک اور گول بازار خالی ہو گیا۔ صرف بکھرے ہوئے جوتے چپل اور ٹوپیاں کٹہرے سے اٹکی ہوئی ساڑیوں اور کرتوں کی دھجیاں چلا چلا کر اپنے زخمی اور کچلی ہوئی انجان لاتیں چند لمحے پہلے کی چہل پہل کی یادگار رہ گئی تھیں۔ فوارے کے پاس بیٹھے کو بسکٹ کھلانے والا بچہ معہ اپنے کتے کے کچل گیا تھا مگر اس کا باپ اور سیٹھ ہاملٹ کے قدموں سے بچ گئے تھے۔ کتا جس طرح پڑا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے نے اپنے ننھے مالک کو بچانے کے لئے ہاملٹ پر حملہ بھی کیا تھا۔

ہاملٹ مامات دھر حلوائی کی دکان تک پہونچا۔ اندر جانے سے پہلے سائبان سے اس کا سر ٹکرایا۔ سائبان پاش پاش ہو کر زمین پر آ رہا۔ اتنے میں بڑے زور کے دھماکے کی آواز آئی اور دکان معہ اپنی منزل عالیشان عمارت کے ہاملٹ پر آ رہی۔

۱۳ ستمبر ۶۲ء بدھ صبح | رات بھر نیند نہیں آئی۔ گول بازار کی تباہی کی تصویر آنکھوں کے سامنے اس طرح پھر رہی ہے۔ جیسے میں ابھی وہیں ہوں۔ رات ڈائری لکھنے کے بعد ایک بات اور یاد آئی عجیب سی بات ہے۔ جب ہاملٹ نے مامات دھر کی دکان کا رخ کیا تھا تو اس کی دکان پر جتنے خریدار تھے سب اپنی اپنی جان لے کر بھاگ گئے۔ مامات دھر بھاگا نہیں جانتے ہو اس نے کیا کیا۔ ایک تھال پھولوں کا اٹھایا۔ اس میں ہار پھول تھے۔ ہاتھ میں سیندور لیا اور رام نام جپتا ہاملٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں کیا سکون اور بھروسہ تھا! جس نے دیکھا ہے اسے یقین ہو گیا کہ ہاملٹ ان کے پاس پہونچ کر اپنے ماتھے پر سیندور لگوائے گا۔ گلے میں ہار پہنے گا اور مٹھائی کا تھال لے کر واپس چلا آئے گا۔ شاید اسی لئے اس نے اتنی ہمت کی ہے۔ یا ممکن ہے کہ پہلے سے کچھ کبھی عادی ہو۔

مامات دھر کا قد صرف پانچ فٹ کا تھا۔ ہاملٹ کے ٹیکہ لگانے کے لئے بیچارے نے سوا فٹ اونچی پیڑھی کا ارادہ کیا تھا۔ افسوس یار دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ مامات دھر کے قریب آنے سے پہلے ہی ہاملٹ ایک ڈگ رکھ کر سائبان کے پاس پہونچ گیا اور اس کے بعد گرد و غبار اور گرتی ہوئی اینٹوں اور شہتیروں سے مامات دھر اور ہاملٹ دونوں کو چھپا لیا۔ اللہ جانے مامات دھر کو کتنی کامیابی ہوئی

۱۴ ستمبر ۶۲ء بدھ شام | سنا ہے کلجگ میں بھی ایسے لوگ ہیں جو عاقبت اندیشی کے پیچھے اپنی جان تک خطرے میں ڈال دیتے ہیں مجسٹریٹ کی لونگا نے اس کی مثال بڑی بہادری سے پیش کی۔ کل جس وقت ہاملٹ کٹہرا توڑ کر پارک میں گھسا۔ اس وقت مجسٹریٹ صاحب اپنے مکان کی چھت پر جو عجائب گھر کے بغل میں ہے تشریف فرما تھے۔ ہاملٹ کے کٹہرا توڑنے کا انہوں نے غور سے معائنہ کیا پھر فوراً اپنے بیوی بچوں کو بلا بھیجا اور کہا کہ ہاملٹ نے بے راہ روی اختیار کی ہے۔ سیدھی راہ کی طرف ایک سمت ہوتی ہے

لیکن بے راہ روی کی کوئی سمت نہیں۔ اس کے لئے سب سمتیں ہوتی ہیں۔ اب ہانت کا کوئی ٹھیک نہیں کہ وہ کیا کرے گا اور کدھر جائیگا اس وقت ہم لوگوں کی جان سخت خطرے میں ہے۔ نہ جانے کس وقت وہ ہمارے گھر میں گھس آئے۔ اور ہم پر حملہ کر دے۔

بیوی نے اس پر دبی زبان سے کہا۔

"اول تو ہانت اب دور نکل گیا ہے۔ دوسرے وہ چھت پر کیسے آسکے گا"۔ مجسٹریٹ صاحب اس احمقانہ خیال پر ہنسے اور بولے "تم کیا جانو کہ بے راہ روی کتنی بری چیز ہے۔ یہاں اس کا تجربہ کرتے نندگی بیتی ہے زندگی! جب کوئی راہ سے ہٹا تو پھر ہٹا۔ اب ہانت سے یہ بھی عجب نہیں کہ وہ صرف ہم پر حملہ کرنے کے لئے یہاں اڑ آئے"۔

پھر وہ کہنے لگے:۔

خیر زیادہ باتوں کا وقت نہیں۔ جو کچھ کرنا ہے جلد کرنا چاہئے۔ ہم لوگوں کا گول بازار سے جانا تو اب سخت خطرناک ہے۔ اس لئے صرف ایک صورت رہ گئی ہے وہ یہ کہ چھت پر سے کود پڑیں اور اگر نیچے زندہ پہنچیں تو فوراً تھانے کے دامن میں پناہ لیں۔

اس وقت سنتے ہیں کہ مجسٹریٹ صاحب کے چہرے پر وہ شان تھی جو بڑے سے بڑے فیصلے سناتے وقت بھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ داڑھی کا ایک ایک بال ایسا کھڑا تھا جیسے پولیس کے سپاہی پریڈ پر اور پلکوں کے اس پار سے آنکھیں اس آن بان سے تک رہی تھیں جیسے جیل کی سلاخوں کے باہر سے جیل کا افسر۔ کسی کی مجال تھی کہ اس کے فیصلے سے سرتابی کرے۔ سب فوراً حکم ماننے پر تیار ہو گئے۔ بہادری کی نوعاسے پہل خود کی اور بڑی بہادری سے کوٹھے پر سے نیچے کود پڑے مگر افسوس! سڑک تک پہونچتے ہی وہ ہانت کی زد سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے بیوی بچوں میں سے کسی نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ اس گندی دنیا میں بہت کم سعدت ایسے نکلتے ہیں۔ جو اپنے بزرگوں کے مرنے کے بعد اُن کے نقشِ قدم پر چلیں۔

بارایسوسی ایشن میں فی لوقا کی جانب اندہانہ شہادت کی خبر جب سنی گئی تو ممبران بہت متاثر ہوئے اور فوراً یہ تجویز پیش کی کہ مرحوم نے مسیحی قانونی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس پر ان کا ایک شاندار مجسمہ بنوا کر عدالت عالیہ پر کھڑا کیا جائے۔ مگر صدر نے یہ تجویز یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ مرحوم کا قربانی کا فیصلہ ہے جتنا بڑا اور ہم لوگوں کے لئے باعثِ تقلید ہو لیکن اس کے عمل درآمد میں ایک قانونی کمزوری رہ گئی۔ وہ یہ کہ انہیں چاہئے تھا کہ اپنے فیصلہ پر خود نہیں بلکہ دوسروں سے عمل کراتے۔

سنتے ہیں کہ یہ پوائنٹ صدر نے ایسا نکالا تھا کہ اس پر سب ممبروں نے فوراً اپنی تجویز واپس لے لی اور ایک تجویز یہ پیش کر دی کہ مجسٹریٹ فی لوقا کی جگہ صدر بار ایسوسی ایشن کا مجسمہ عدالت عالیہ پر لگایا جائے۔

۱۴ ستمبر ۲۰۰۰ء لندن صبح | قانونی نکتے بھی کیسے نازک ہوتے ہیں! ان باتوں کو کون سمجھ سکتا ہے؟ ابھی ابھی اخبار سے ایک بڑی دردناک خبر معلوم ہوئی ہے۔ ماماٹ دھر کی دکان کی اوپر والی منزلوں پر کوئی شخص ریزی زایا اپنے مال

باپ بھائی بہنوں اور بیوی بچوں سمیت رہتا تھا۔ ہائمنٹ کی ٹکر سے مکان جو گرا تو سب دب کر مر گئے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ خود بچ رہا صاف بچ رہا۔ نامہ نگار کا بیان ہے کہ وہ اپنے بچنے کی خوشی میں راگ ورنگ کا جلسہ کرنے والا ہے۔ اُسے کرنا تو چاہیئے۔

اخبار میں ان لوگوں کی فہرست چھپی ہے جو اس حادثے سے مر گئے یا زخمی ہوئے۔ بڑی لمبی فہرست ہے۔ مرنے والوں میں کچھ تو ایسے ہیں جن کی کمائی پر خاندان بھر کا پیٹ چلتا تھا۔ افسوس! کیسا دردناک حادثہ ہوا ہے۔ ان لوگوں پر ترس آتا ہے آج کتنے گھروں میں کہرام مچا ہوگا۔

۱۴ ستمبر ۱۴۰۰ سنہ ند شام | غضب ہے، اندھیر ہے، ری زابا راگ رنگ کا جلسہ نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ وہ کیا تا دن ہائمنٹ کی مخالفت میں بھی نہیں بلکہ خود انجینیئر کی مخالفت میں احتجاج کر رہا ہے۔ جیسے انجینیئر نے ہائمنٹ کو اسی دردناک حادثہ کے لئے تو بھیجا ہی تھا۔ اور ری زابا کے ساتھ۔ ری بات میں بھی کتنی کشش ہوتی ہے اور بھی بہت سے لوگ شریک ہیں۔ جس شخص کا بھی کوئی عزیز مارا گیا ہے اس کو ری زابا نے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ کر لیا ہے۔

۱۵ ستمبر ۱۴۰۰ سنہ ند | شہر بھر کی قریب قریب سب انجمنوں نے جلسے کر کے یہ تجویز پاس کی ہے کہ اگر حکومت ری زابا کے جلسے کو نہیں روکتی تو ہم سب اس کو بزورِ روکیں گے۔ پبلک کو اتنا جوش ہے کہ کل بارہ بجے رات تک "انجینیئر زندہ باد" اور "ری زابا پر لعنت" کے نعروں کی آوازیں آتی رہیں۔

خبر ہے کہ آج رات کو کسی وقت شہری کونسل کا اجلاس ہے اور صبح تک صدر کونسل کا کوئی بیان نکلنے والا ہے

۱۶ ستمبر ۱۴۰۰ سنہ ند رات | آج ہماری انجمن کا جلسہ تھا۔ شاید ہی کوئی ممبر آنے سے رہ گیا ہو۔ سارا ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ برآمدہ، گیلری اور صحن ہر جگہ بھیڑ لگی تھی۔ ضعیف بڈھے، رندمشرب جوان بچے والی عورتیں، کھلنڈرے بچے سب ہی تو موجود تھے۔ وہ ہزاروں برس کا پتھر والا ممبر جو تبرک کی طرح عبادت خانے میں رکھا رہتا ہے۔ آج کم اہتمام سے احتیاط سے نکال کر بیچ ہال میں رکھا گیا تھا۔ زمانے کی رگڑ سے گھسے ہوئے اُس کے زینے اور اُس کی برف کی ایسی ٹھنڈی سفیدی ہم لوگوں کے دلوں میں وہی اثر پیدا کر رہی تھی جو چاندنی میں گورِ غریباں کا نظارہ پیدا کرتا ہے۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ دیکھا چاہیئے کہ اس ری زابا کے قصہ کا انجام کیا ہوتا ہے۔

جس وقت صدر صاحب صبح صادق کے چاند کی ایسی سفید پگڑی اور سفید عبا میں نورانی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے تشریف لائے تو "انجینیئر زندہ باد" کا وہ شور ہوا کہ معلوم ہوتا تھا در و دیوار محراب و منبر ہر چیز نعرے لگا رہی ہے۔ پھر فوراً ہی ایسی خاموشی چھا گئی جیسے سب طرف انسان نہیں تراشے ہوئے بت دھرے تھے۔ گود کے بچے تک خاموش تھے۔

صدر صاحب نے کھنکھار کر تقریر شروع کی۔ بتایا کہ ہمارے اوپر انجینیئر کے کیا کیا احسانات ہیں۔ اسی کا رحم و کرم کہ اس

کوہستانی علاقے میں جہاں گھاس تک نہیں پیدا ہوتی ہے اور جہاں منزلوں تک پانی نظر نہیں آتا ہے۔ آج ہم سب اسی کا دیا کھاتے ہیں۔ اسی کا دیا پیتے ہیں۔ اور آج ہم چلے ہیں اسی پر الزام لگانے۔

ہم سب یہ سن کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے خود صدر صاحب کی سفید داڑھی پر بھی آنسو یا سی شبنم کے قطروں کی طرح چمک رہے تھے۔ صدر صاحب نے بتایا کہ یہی ری زاما جو آج یوں انجینیر کے خلاف اکڑتے گھومتے ہیں ان کی ماں ان کی پیدائش سے پہلے ایسی بیمار پڑی تھیں کہ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ جب وہ انجینیر کے اسپتال میں جاکر رہیں۔ تب اچھی ہوئیں۔ اگر انجینیر کی عنایت اس عورت پر نہ ہوتی تو آج یہ پیدا تک نہ ہوتے۔ تب ان کو اپنی قدر و عافیت معلوم ہوتی۔

صدر صاحب نے بتایا کہ حکومت نے اس ری زاما کو انجینیر کے خلاف مقدمہ چلانے کی اجازت دیدی ہے اور دو چار روز میں وہ منحوس دن آجائیگا جبکہ عدالت کے ہال میں انجینیر کے خلاف گندگی اچھال کر ری زاما ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا منہ کالا کرے گا۔ میرے خیال میں اس کو ایک بار سمجھانا تو چاہیئے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ شاید وہ نہ جانتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اتمام حجت کے لئے ہم کو اپنا ایک نمائندہ بھیجنا چاہیے۔

صدر صاحب نے نائب صدر کو نمائندہ بنایا اور مجھے گواہ کی حیثیت سے ساتھ جانے کا حکم دیا اور پھر کہا کہ اگر مقدمہ چلا تو اپنی انجمن کی جانب سے میں انجینیر کی صفائی پیش کروں گا۔

خوشی کی تالیاں بجیں۔ نعرے لگے اور پھر جلسہ ختم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ شہر بھر کی انجمنوں نے طے کیا ہے کہ انجینیر کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے لئے اپنے اپنے نمائندے اسی طرح بھیجیں گی۔

۱۷ دسمبر سنہ ۲۰۱۴ء لندن | آج ہم اور انجمن کے نائب صدر ری زاما سے ملنے گئے۔ جب میں ملنے کے لئے گھر سے نکلا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا جو چار روز ہوئے عالی شان محل تھا۔ غمگین آنکھوں کا جوڑا جو روتے روتے خشک ہو گیا ہے۔ سوکھے ہوئے ہونٹ اور مرجھائے ہوئے گال تھے۔ لیکن جب وہاں پہونچا تو دنگ رہ گیا۔ ایک ہال کے بیچ کھچے ٹکڑے میں بیس پچیس آدمیوں کے دربار میں گاؤ تکیہ لگائے شان سے ری زاما بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا پڑوسی قوال یاد آگیا جس کے نام لاٹری نکل آئی تھی اور ہم سب مبارکباد دینے گئے تھے۔ ری زاما دائیں بائیں ہر طرف اپنا تبسم از راہ مہربانی بانٹ رہا تھا۔ ہم دونوں سے وہ بہت اخلاق سے ملا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تو پہاڑ پر ہے اور ہم لوگ نیچے کھڑے ہیں۔ پر وہ اپنے اخلاق سے اس بلندی و پستی کو ڈھانکنا چاہتا ہے۔ خوب! کل کے تراشے ہوئے بت آج خدا بنتے ہیں۔ ری زاما کو گھمنڈ تھا کہ اس پر جو مصیبت پڑی ہے کسی پر نہیں پڑی۔ اسی مصیبت کے سرمائے سے وہ لیڈر بن گیا تھا۔

---

[1] ممکن ہے کہ انجینیر ڈاکٹر بھی ہو۔ یا پھر اس نے اپنے روپیہ سے کوئی اسپتال بنوایا ہوگا۔ [2] وہاں حرکات کا دستور بالکل جدا گانہ معلوم ہوتا ہے۔

جب ہم لوگ پہونچے ہیں اس وقت شہر کے ایک امیر کبیر تشریف لائے تھے۔ پہلے دونوں میں سلاموں کا تبادلہ ہوا۔ پھر ایک دوسرے کی تعریفوں کا۔ اس کے بعد امیر کبیر صاحب نے بہت قرینہ سے مطلب کی بات کہی کہ آپ پر غم کا اتنا بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑا میں چاہتا ہوں کہ جتنا حصہ بٹا سکتا ہوں بٹاؤں میں باغ والی کوٹھی آپ کے نذر کرنا چاہتا ہوں

مرزا بابا نے فوراً پہلو بدلا۔ وہ تاڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس مہربانی کی قیمت کیا ہوگی۔

"حضور کیا عرض کروں میرا غم تو اب کوئی غم نہیں مجھے تو اپنے ایسے اور سیکڑوں غم زدوں کی فکر ہے" بہانہ پاتے ہی امیر کبیر صاحب مطلب پر آ گئے۔

"جی میں اس سلسلے میں بھی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ ان غم زدوں کی مالی مدد اور عدالت میں ان لوگوں کی وکالت۔"

شاید مرزا بابا پہلے ہی سے سمجھ رہا تھا کہ یہ امیر کبیر صاحب کمر کو بچا کر سر پر ہاتھ مارنا چاہتے ہیں یعنی کچھ لایعنی ہمدردی اور روپیہ کے بدلے مصیبت زدوں کی وکالت کو جو اس وقت ناموری اور لیڈری کا نایاب ذریعہ ہے ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے مسکرا کر کہا "حضور! اس سلسلہ میں جو بدنامیاں اٹھانا پڑ رہی ہیں وہ آپ کے شایانِ شان نہیں۔ اس کے لئے تو وہ میرا ہی ایسا گمنام و ناکارہ شخص چاہیئے۔"

سب سمجھ گئے کہ گمنام و ناکارہ کے معنی اس جگہ "عقلمند اور بہادر کے ہیں" بیچارے امیر کبیر صاحب یہ صاف انکار پا کر چڑ سے گئے ذرا دیر خاموش بیٹھے رہے اور پھر آداب بجا لا کر رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد مرزا بابا صاحب ہم لوگوں سے ایسی آوازیں جو گنگنانے کے لئے زیادہ موزوں تھی مخاطب ہوئے اور بلا تمہید سمجھانے لگے کہ ہم کو لوگوں کی مخالفت سے خوفزدہ نہ ہونا چاہیئے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم بھی ان کے دربار کی حاضری کے لئے آئے ہیں میں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ ہم ایک اور مطلب سے آئے ہیں۔ انہوں نے سنتے ہی کہا ہاں ہاں میں سمجھ گیا اور پھر اپنی نصیحت شروع کر دی نائب صدر صاحب سنتے رہے بیچ میں جیسے ہی مرزا بابا صاحب ذرا سانس لینے کو رکے انہوں نے فوراً تیزی سے بولنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے۔

"حضور ہم لوگ وارمان ای انجمن کے ممبر ہیں۔ اس نے ہم کو آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ ہم آپ کو معاملے کی اونچ نیچ"......

مرزا بابا صاحب فوراً بولے "ہاں اونچ نیچ۔ میں تو یہی سمجھا رہا تھا۔ .

یہ کہہ کر وہ پھر تقریر کرنے لگے۔ وہاں بات کہنے کی گنجائش ہی نہیں تھی اس لئے ہم لوگ بلا کچھ کہے سنے واپس چلے آئے۔

۱۹ر دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء رات

"چھوٹی بچی بہت تیز بخار میں بھن رہی ہے۔ پہلے اس کے لئے ڈاکٹر سے دوا لا دیا تب جانا۔" آج مرزا بابا کا مقدمہ تھا۔ جیسے میں گھر سے نکلنے لگا بیوی نے یہ کہا۔ میں نے بھی سوچا کہ یہی مناسب ہے۔ جب باہر نکلا تو دیکھتا آیا ہوں کہ سب دکانیں بند پڑی ہیں۔ وہ مکانات جو ہر وقت ہنستے اور گاتے رہتے تھے۔ اس وقت منہ

لٹکائے افسردہ کھڑے ہیں۔ سڑکوں پہ ٹوٹے پتے اور ردی کاغذ اڑتے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف بوگی برس رہی ہے۔ خاموشی سے سر جھکائے ہوئے آدمیوں کے غول عدالت کی طرف جا رہے ہیں۔ بس ان کے قدموں کی چاپ اور کھسر پھسر سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہی دنیا کی آواز ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر کا پتہ کہاں تھا۔ مجھے گھر واپس آ کر بیوی کو خبر کر دینا چاہئے تھی۔ مگر اس وقت کی رو میں بلا سوچے سمجھے بہ گیا۔ عدالت کی عمارت کے اندر پہنچ گیا تب ہوش آیا

عدالت اندر باہر ہر طرف سے اتنی بھری ہوئی تھی کہ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ مرد عورت، بوڑھا بچہ، جوان ادھیڑ سب ہی تو جمع تھے۔ ہال کے بیچ میں ری زابا سرخ شیروانی اور آڑی ٹوپی پہنے اپنے مریدوں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا چینج رہا تھا۔ جیسے شہریوں کی محفل میں دیہاتی پٹر با مرید تھے کہ اس کی بے بات کی بات پر بھی اُن کو ہنسی آ رہی تھی۔ ہاں اور یہ بھی بتا دوں کہ ان لوگوں نے اس ڈر سے کہ پبلک ان کی تکا بوٹی نہ کر ڈالے اپنے چاروں طرف پولیس کھڑی کر رکھی تھی۔ اتنے میں ججوں کی آمد ہوئی۔ اور فوراً سناٹا چھا گیا۔

جیسے ججوں کا حکم ملا ری زابا نے اپنے کپڑوں کی شکنیں برابر کیں حالانکہ وہاں ایک شکن بھی نہ تھی۔ پھر کھیسیں کاڑھ کر اپنے مریدوں کی طرف دیکھا اور بحث شروع کی۔

"حضورِ والا!"

اس وقت اتنا سناٹا تھا کہ ججوں کے کاغذ اُلٹنے پلٹنے تک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ری زابا کی تقریر کیا تھی؛ مجھے تو اس سے الجھن ہونے لگی۔ ذرا سی بات چھ گھنٹہ میں کہی۔ وہی بات جو وہ لوگ پہلے دن رٹ رہے ہیں کہ ہامنت کو انجینئر نے بنایا ہے۔ اس کی شکل صورت وضع قطع، چال ڈھال بولنا چالنا، رفتار فلاں جگہ سے چلنا فلاں جگہ سے مڑ جانا۔ یہ سب انجینئر نے اس میں پیدا کیا ہے۔ ہامنت میں مجال نہیں کہ اپنے میں ایک بات بھی از خود پیدا کرے چنانچہ انجینئر نے ہامنت کے بنانے کے بعد جو بیان نکالا تھا اس میں یہ فقرہ تھا "کہ یہ میرے ارادے سے چلے گا اور میرے ارادے سے مڑے گا اور میرے ارادے سے باتیں کرے گا۔ میں اس سے میلوں دور رہوں گا مگر میرا ارادہ اس کے ساتھ رہے گا۔"

اس کے بعد وکیل کہنے لگا کہ ہامنت کو شہر میں چلنے پھرنے کی صرف اسی وجہ سے اجازت دی گئی تھی کہ اس کے حرکات و سکنات کا ذمہ دار انجینئر ہے اور انجینئر کے کاموں پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اچھا! اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ہامنت کی بے راہ روی کا ذمہ دار انجینئر نہیں بلکہ کوئی اور مثلاً الف ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج سے ہم کو انجینئر کی کاریگری اور اُس کے الفاظ پر کوئی بھروسہ نہ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ ہر چیز کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اُسے الف خراب نہ کر دے۔ ایسی حالت میں حکومت نے جو ہم سب کو انجینئر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے بحث

غلطی کی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی چلائی ہوئی خوراک بنانے والی مشینیں[1] کل زہر بنانے لگیں۔ اس کا پہاڑوں پر بنایا ہوا آبپاشی کا بند پھٹ جائے اور ہم سب غرقاب ہو جائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرے جواب میں کہا جائے گا کہ انجینئر نے ہامنت کو بنایا۔ اس نے مشینیں فٹ کی اور ایک اندازہ پر چلائی۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ چنانچہ ہامنت اسی کے حکم پر چلا اور اتنے دنوں تک چلتا رہا۔ لیکن اب جو یہ غلطی ہو گئی ہے ایک ناگہانی بات ہے جس کی ذمہ داری اس پر کسی طرح نہیں آسکتی ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جس سے ہمارے شہر کے اخباروں کے کالم کے کالم رنگدے گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انجینئر نے جب ہامنت کو تیار کیا ہے تو اسے اس بات کا علم تھا کہ یہ مشین بگڑ سکتی ہے؟ اور یہ کہ اگر بگڑ جائے تو اس کا کتنا خوفناک انجام ہوگا؟ اگر اسے یہ علم تھا اور پھر بھی اس نے ہامنت کو شہر میں چلایا۔ پھر تو انجینئر کی ذمہ داری اتنی بڑھ جاتی ہے گویا تمام خوفناک حادثات اس نے خود کیے ہیں۔ اگر اسے علم نہیں تھا تو پھر ایسے شخص کو قطعی اتنا بڑا انجینئر نہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری موت اور زندگی، بھلا بُرا سب اس کے ہاتھوں میں سونپ دیا جائے۔

لوگ یہ دلیلیں سن رہے تھے اور دل ہی دل میں تعریف کر رہے تھے۔ دلیل سے ثابت کرنے کا کیا۔ کوئی منطقی ہو تو یہ شک ثابت کر سکتا ہے کہ دن کے وقت رات اور رات کے وقت دن ہوتا ہے۔ ابھی اس کی تقریر ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ آسمان سے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو بادل کا کہیں دور دور پتہ نشان نہیں تھا۔ شمالی پہاڑ گرج رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا الٰہی خیر کیجیو۔

جب واپس آیا ہوں تو لڑکی کی حالت سرسامی تھی مگر میں کچھ اتنا پریشان تھا کہ اس کے پاس گیا تک نہیں۔ کیا ہونے والا ہے؟ انجینئر اور غلطی! بدبخت ۔ ی زابا پاگل ہو گیا ہے۔ ایسے ہی کچھ تسوک سنے تو ہماری انجمن کے صدر سے رنج کر لئے ہوتے۔ وہ لو! لڑکی چلا رہی ہے اولاد بھی رحمت نہیں زحمت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ دن کو چین ملے نہ رات کو نیند۔

۲۰ رمجھ سنہ ۲۱۴۰ند رات | آج میری وہ حالت تھی جو گھوڑ دوڑ والے کی ہو جاتی ہے۔ جب گھوڑے منزل پر پہنچنے والے ہوں۔ راستے بھر دل دھڑک رہا تھا۔ کہ دیکھا چاہیئے کہ آج مقدمہ کس کل بیٹھتا ہے۔ آج ہماری انجمن کا صدر وکالت کرے گا۔ دوسری طرف یہ بھی فکر تھی کہ لڑکی کو بحرانی حالت میں چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ نہ جانے رات کو ملے گی یا نہیں۔

عدالت جب پہونچا ہوں تو سوائے ری زابا اور اس کے مریدوں کے سب کے ہونٹوں پر مہر لگی ہوئی تھی۔ ری زابا اپنے مریدوں سے چلا چلا کر باتیں کر رہا تھا اور وہ لوگ بات بات پر ہنسی کے مارے بیتاب ہوئے جا رہے تھے۔ اس وقت ہنسی کی

---

[1] خالباً اس ملک میں سائنس تنی ترقی کر گئی ہے کہ: ہاں کیمیاوی طریقوں پر مشینوں سے خوراک تیار کر لی جاتی ہے۔ جس کی یہاں ابھی کوشش ہی ہو رہی ہے۔

کونسی بات تھی؟ کامیابی کا نشہ تھی کہ ہیجر ہے

ہمارے وکیل نے کھڑے ہوتے ہی پوچھا کہ اصل مجرم یعنی ہامنٹ کو حاضر عدالت کیوں نہیں کیا گیا؟ اس پر عدالت نے کہا کہ وہ مجرم نہیں سمجھا گیا اس لئے حاضر نہیں کیا گیا[1]۔ وکیل نے اس پر کیا خوب کہا۔ کیا اس سے میں یہ سمجھوں کہ عدالت نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مجرم نہیں ہے؟ یہ اعتراض اس کا ایسا چپکا کہ فوراً عدالت نے ہامنٹ کی حاضری کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں ہامنٹ آیا۔ اس کے پاؤں اور کمر زنجیروں میں کسے ہوئے تھے اور پولیس کے سپاہی گھسیٹ رہے تھے۔ اس کی غلافی آنکھیں اب پہلے کی طرح چکر مکر کرنے کی جگہ نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے کا رنگ ایسا اڑا ہوا تھا جیسے مر گیا ہو۔ پتہ ہے کہ کیسا ہی پتھر دل کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ ندامت ہوتی ہی ہے۔ مجھے حالانکہ یقین آگیا تھا۔ کہ اصل مجرم یہی ہے مگر پھر بھی کمبخت پر ترس آہی گیا

وکیل صاحب نے سوال کیا کہ مجرم کیسے آیا؟ کیا خود چل کر آیا ہے؟ مخالف کے وکیل نے جواب دیا نہیں خود سے نہیں آیا ہے بلکہ اسے سپاہی زنجیروں سے گھسیٹ کر لائے ہیں۔

دو چار ادھر ادھر کے سوالوں کے بعد پھر ہمارے وکیل نے پوچھا کہ کیا اسی طرح ہامنٹ بازار میں نکلتا تھا۔ وکیل مخالف نے جواب دیا نہیں وہاں وہ خود چلتا تھا۔ ہمارے وکیل نے اب عدالت کو مخاطب کر کے کہا دیکھئے حضور! وکیل صاحب قبول رہتے ہیں کہ ہامنٹ کی دو حرکتیں ہوتی ہیں ایک غیر اختیاری جس سے وہ عدالت میں آیا ہے اور ایک اختیاری جس سے وہ بازار میں چلتا تھا۔ مخالف وکیل کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہامنٹ نے جو جرم کیا ہے وہ اختیاری حرکت سے کیا ہے جب اس نے اختیاری حرکت سے جرم کیا ہے۔ تو پھر وہ قصوروار کیوں نہیں؟

اس نکتہ پر وکیل مخالف کا منہ اتر آیا۔ عدالت نے بھی بہت داد دی۔ اور پبلک کی تو حالت نہ پوچھو اس نے تو ایسے ایسے نعرے لگائے ہیں۔ اتنی تالیاں پیٹی ہیں کہ پانچ منٹ تک کوئی کارروائی ہی نہ ہو سکی۔ میں نے ہامنٹ کی طرف دیکھا تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ میں نے دل میں کہا لو اور بے قصور بنو۔

ہمارے وکیل نے عدالت سے کہا میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ ہامنٹ خود جاندار اور با ارادہ انسان ہے۔ نہیں۔ اس کی جان اور ارادہ جو کچھ ہے انجینئر کا عطا کیا ہوا ہے۔ اسی کی طاقت اور ارادے سے یہ چلتا ہے اور اسی کی طاقت اور ارادے سے ٹھہرتا ہے۔ بغیر اس کی مرضی کے یہ اینچ بھی نہیں چل سکتا۔ مگر ساتھ ساتھ انجینئر نے اپنی اجازت سے اسے اپنے فعل کا مختار بنا دیا ہے۔ اگر شک ہو تو اس کا دماغ کھول کر دیکھ لیجئے۔ اس میں یہ بتانے کے لئے کہ کدھر شمال ہے اور کدھر جنوب کدھر مشرق ہے اور کدھر مغرب قطب نما بھی لگا ہوا ہے۔ مزاج کی گرمی کو اعتدال پر رکھنے کے لئے تھرمامیٹر لگا ہے۔ بے راہ روی سے بچنے کے لئے بریک بھی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر اس نے قصور کیا ہے تو اس کا ذمہ دار کون؟

اب ہمارا وکیل کہنے لگا کہ اگر غور کیجئے تو ہم انسان ہمیشہ سے صرف ہامنٹ ہی کو نہیں بلکہ تمام انجنوں کو جاندار اور فاعل مختار مانتے چلے

---

[1] غالباً انجینئر عدالت کی حاضری سے مستثنیٰ ہوگا۔

آئے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "انجن آ رہا ہے" "انجن گیا" "انجن بولا" یہ تمام فقرے بتاتے ہیں کہ دل میں ہم انجن کو وہی درجہ دیتے ہیں جو ایک انسان کو۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ ان پر اخلاقی فیصلے بھی کرتے ہیں: "یہ انجن اچھا ہے" "وہ انجن بُرا ہے" اس کی سب سے اچھی مثال اخبار کے ایک بیان میں ملتی ہے وہ لکھتا ہے۔ "جب ہانت بیئر میں گھسا اور لوگوں کو کچلتا جا رہا تھا تو عورتیں اسے کوس رہی تھیں" حرامی کو موت آئے" "نگوڑے کمبخت کے پاؤں ٹوٹیں" اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے تحت الشعور میں اسے جاندار فاعل مختار سمجھ رہی تھیں۔ جب ہانت جاندار فاعل مختار ٹھیرا۔ اور اس پر اخلاقی فیصلے نافذ ہو سکتے ہیں تو پھر وہ اپنے اس جرم کی سزا کیوں نہ پائے؟

کہا جائے گا کہ اگر ہانت فاعل مختار ہے تو انجینئر کا اس کے افعال میں کیا دخل؟ یہ سوال ایک مغالطہ ہے۔ ورنہ ہانت کے ہر فعل میں اس کا ذاتی ارادہ اور انجینئر کا ارادہ دونوں پائے جاتے ہیں۔ انجینئر چلاتا ہے ہانت چلتا ہے۔ انجینئر موڑتا ہے ہانت مڑتا ہے۔ انجینئر بلواتا ہے ہانت بولتا ہے۔

کسی نے یہ سوال کیا کہ اگر ہانت میں ایسا ہی ارادہ ہے تو پھر وہ خود ہی انا انجینئر ہے۔ وکیل نے کہا نہیں۔ اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا۔ ہانت کو اختیار و ارادہ ملا ہے مگر ایک حد تک۔ مثلاً وہ زمین پر چل سکتا ہے۔ مگر آسمان پر نہیں اڑ سکتا۔

احساس کہ لوگوں کے دلوں پر سے ایک بوجھ سا دور ہو گیا۔ انہوں نے اتنا شور مچایا۔ بات بات پر تالیاں بجیں کہ میں تو تقریر بھی نہیں سن سکا صرف اتنا سمجھ سکا کہ وکیل نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ انجینئر کو ہانت کی بے راہ روی کا علم تھا تو ضرور مگر اس پر بھی انجینئر پر یہ الزام نہیں آتا ہے کہ اس نے ہانت کو پہلے سے کیوں نہیں درست کر لیا۔

اب صدر نے عدالت سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"حضور یہ وہ عدالت ہے جو ہزار دو سال سے انسان کے دکھ سکھ، رنج خوشی، سزا و جزا کا فیصلہ کرتی آئی ہے۔

یہاں پہنچ کر صدر کی آواز بھرا گئی۔

اس کی ابتدا ماضی کی لمبی اندھیاری رات کو چیرتی ہوئی اتنی دور نکل گئی ہے کہ آج ہماری آنکھوں سے بالکل اوجھل ہے۔ آج اسی مقدس عدالت کے سامنے ہم انصاف کی روٹیوں کا اتنا قدیم ذخیرہ لئے فریادی ہیں کہ اس بے عقلی کے فتنے کو ختم کر دے" (تالیاں)

جب ہمارا صدر تقریر کر کے بیٹھا ہے تو زبان پر تاثر کی مہر لگی تھی۔ مگر آنکھوں سے شکریہ کی پٹیاں نکل رہی تھیں۔

عدالت نے ہانت کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟ ہانت بالکل خاموش تھا شاید سوچ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ کون جانے اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ مگر یا نا پڑتا ہے کہ چہرے پر بلا کا ضبط تھا۔ اس کی خاموشی پر عدالت نے ڈانٹا اور پولیس والوں نے گھسیلا اور چونکایا۔ اب تو سورج کی ایسی چمکتی سچائی کے سامنے ہانت نے گردن جھکا لی۔ اور پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کی سیاہی کا ہلکا سا خط جو سامنے سے دکھائی دیتا تھا صاف دل کی سیاہی کا پتہ دے رہا تھا۔

سچ ہے کہ انصاف کی گدی میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

پبلک کے شور اور تالیوں کے درمیان میں میں نے ری زا بااور اس کے مریدوں کے جھنڈ پر نظر ڈالی۔ اسے وہ تو اس طرح جھٹ گیا تھا۔ جیسے مرغیوں کا غول بلی کے حملے پر۔ ری زا با تو ذرا آگے بڑھا ہوا کھڑا تھا اور اس کے ساتھی نہ جانے چپکے چپکے کدھر کھسک گئے تھے۔ دو چار جو کھڑے تھے وہ بھی ری زا با سے ایسے کٹے کٹے کہ سرسری دیکھنے والے کو پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا کہ ان کا ری زا با سے کوئی تعلق بھی ہے

وہ مارا۔ اور خوش ہوا اور ہنس ہنس کر تقریر کو ا

اب عدالت نے پبلک سے پوچھا کہ ہامنت کی طرف سے کسی کو صفائی تو نہیں پیش کرنا ہے؟ ہر طرف سناٹا تھا۔ ایسے سیاہ کار مجرم کی طرف سے کون بولتا۔ اتنے میں ایک چیں چیں کرتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "میں صفائی پیش کروں گی" یہ ایک پانچ سال کی لڑکی تھی جو ایک کونے سے چلّا رہی تھی۔ اس کی ماں نے فوراً اس کا منہ دبا لیا اور کہنے لگی "جی نہیں حضور یہ یوں ہی بکتی ہے۔"

عدالت نے کہا ہم اسے بھی موقع دینا چاہتے ہیں۔ کہ جو کہنا ہو کہے۔

لڑکی دوڑ کر ہامنت کے پاس گئی، اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی۔

"اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ تو بالکل نیک ہے۔ بہت اچھا ہے!"

عدالت - بس یا اور کچھ کہنا ہے۔

لڑکی - یہ بہت نیک ہے" "بہت اچھا ہے۔"

بچاری لڑکی ہامنت کو کھلونا سمجھے ہوئے تھی۔ سب اس پر ہنس دیئے اور عدالت برخاست ہو گئی۔

اس وقت ہر طرف اتنی خوشی تھی۔ اتنا شور تھا کہ معلوم ہوتا تھا ہر شخص کی زندگی کی ساری مصیبتیں اک دم سے ختم ہو گئی ہیں۔ اس ہنگامہ میں کہیں میری گھڑی گر گئی۔ میں اسے ڈھونڈھنے لگا۔ اس کے ڈھونڈھنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ ساری عمارت خالی ہو گئی۔ چپراسی دروازے بند کر کے چلے گئے اور شام کا اندھیرا بڑھ آمد دں اور درختوں کے نیچے بسیرا لینے لگا تب اکدم سے گھڑی ایک اینٹ کے پیچھے چمکتی نظر آ گئی۔ میں اسے لیکر جب واپس آنے لگا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایسے سناٹے میں ری زا با کسی طرف سے نکل کر جا رہا ہے۔ کیا وہ ابھی تک کہیں چھپا ہوا تھا؟ اس کے چہرے پر مایوسی سوگ منا رہی تھی۔ سر بھویں اور پلکیں اس بڑھیا کی طرح جو گئی جوانی ڈھونڈھتی پھرتی ہو۔ زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی نگاہ میرے اوپر نہیں پڑی۔ میں کھڑا دیکھتا رہا۔ آگے دھندلکا پیچھے دھندلکا اور اس طرح وہ عمارت سے نکل گیا۔

شمالی پہاڑوں کی چوٹیاں جو ہزاروں لاکھوں برسوں سے انسانی کارناموں کا مشاہدہ کرتی آئی ہیں۔ اس وقت ہلکی سیاہی کا دوپٹہ اوڑھے آسمان کی نیلاہٹ میں دور تک گھسی ہوئی صرف ایک ٹمٹماتے ستارے کی روشنی میں ہماری دنیا کو بے توجہی سے دیکھ رہی تھیں۔ ان سنگین چوٹیوں کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم انسانوں نے کیا کامیابی حاصل کی ہے۔

راستہ بھر میں یہ دیکھتا آیا کہ لوگ گھروں کو چراغاں کر رہے ہیں۔ جب اپنے گھر آیا تو وہاں بھی چراغاں نظر آیا۔ اندر آ کر یہ بھی خوشخبری ملی کہ بچی کا بخار اتر گیا۔

۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء لندن — صبح | آج اخباروں نے ...ی رانا پر سخت لعن طعن کی ہے۔ لیکن اسی سلسلے میں ایک نئی بحث چھڑ گئی ہے۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہ ری زانا نے انجینئر کی مخالفت کر کے بہت برا کیا ہے مگر اختلاف اس پہ ہے کہ فعل کی برائی اس بات میں ہے کہ اس نے ایسا سوچا کیوں یا اس بات میں کہ اگر سوچا تھا تو زبان سے کیوں نکالا۔ یہ بحث اتنا طول پکڑ گئی کہ آج دو جماعتوں میں اس پہ مار پیٹ ہو گئی۔ تین شخص زخمی ہوئے۔

میرے خیال میں اصل جرم اسی میں ہے کہ ایسا سوچا کیوں؟ جو بات ماننے کی ہے بس وہ مانی ہوئی ہے۔

یہ بھی خبر ہے کہ ابھی دو ایک انجمنوں کی طرف سے اور بحث ہوگی۔ آج انجمن کے عدم کی بحث سن کر دل پر سے بڑا بوجھ اتر گیا۔ دل تو بڑا پاپی ہوتا ہے نا۔ وہ ری زانا کے کہے میں کچھ نہ کچھ آ گیا تھا۔ کبھی کبھی ایک کھٹک سی ہو جاتی تھی کہ اگر انجینئر قصور وار نکلا تو ——— مگر توبہ یہ کیسی بات ہے۔ آج ری زانا کی ہر بلی صورت دیکھ کر دل کو اتنا سکون ہے گویا جیسے جی جنت مل گئی۔

۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء لندن — شب | آج عدالت میں تین انجمنوں کی طرف سے وکیل پیش ہو گئے۔ ایک وکیل نے کہا۔ میں مانتا ہوں کہ ہامنت قصور وار ہے میں اس کی طرف سے صفائی نہیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ حق کی حمایت ہو اور حق یہ کہتا ہے کہ ہامنت کو قصور وار ٹھہرانے سے پہلے دیکھ لینا چاہئے کہ اس میں تحریک کس کی ہے۔ اصل مجرم وہی ہے جس کی تحریک ہے۔ اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو کھل جاتا ہے کہ ساری حرکت سڑک کی ہے۔ اس کو چاہئے تھا کہ ہامنت کو شمال کی طرف موڑتی۔ مگر اس نے جنوب کی طرف موڑ دیا۔ ہامنت بچارے کا جو کچھ قصور ہے وہ یہ کہ اس کے بہکانے میں آ گیا۔

دوسرے وکیل نے بھی صرف 'حق' کی حمایت کے لئے ہامنت کی صفائی پیش کی۔ کہنے لگا کہ ہامنت کو قصور وار ٹھہرانے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ اس نے جرم کن حالات میں کیا ہے۔ وہ بہت لمبا راستہ طے کر کے تھکا ماندہ گول بازار تک آیا تھا۔ یہاں کالی آنکھیں، ہنستے ہونٹ اور رنگین تالیوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس پر اس نے خوش ہو کر ان سب کو سلام بھی کیا۔ اسی حالت میں بڑھتا ہوا جب وہ عجائب گھر تک پہونچ گیا تو اس کے داہنی طرف سناٹا تھا اور بائیں طرف حسن و رنگ کے جھرمٹ۔ اخباروں کے بیانوں سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مڑنے کا ارادہ کیا تھا مگر نہیں مڑا۔ کیا اس سے یہ صاف سمجھ میں نہیں آ جاتا ہے کہ اس رنگین محفل نے اپنی اداؤں سے اسے ایسا بھایا کہ غریب کو شمال جنوب کی تمیز نہیں رہی۔ اب میں عدالت سے پوچھتا ہوں کہ ایسی حالت میں قصور ہامنت کا ٹھہرتا ہے یا اس مجمع کا جس نے اسے گمراہ کیا۔

تیسرے وکیل نے کہا کہ میں مانتا ہوں کہ ہامنت مختار ہے اور یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ قصور اس نے اپنی سمجھ سے کیا۔ لیکن پھر بھی میں

پوچھتا ہوں کہ اس کی سمجھ میں یہ خرابی کیسے آئی ؟ یہ یقینی بات ہے کہ انجینیئر نے اس کو بے عیب ہی بنایا ہوگا۔ اسی سوال کے جواب میں ذرا ان مستریوں پر نظر دوڑائیے جن کے ہاتھوں یہ تیار ہوا ہے جنہوں نے اس کی آواز، اس کی چال درست کی ہے اور جو کئی سال سے اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ کیا وہ ان قصوروں کے ذمہ دار نہیں ٹھہرے ہیں ؟ عدالت کو یہ اعتراض ایسا مناسب معلوم ہوا کہ اس نے فوراً مستریوں کو گرفتار کر بلوایا۔

دو مستری ہانپتے کانپتے آئے۔ ڈرے چہرے ایسے سفید جیسے دھلا کپڑا۔ آنکھیں آندھی سے پریشان چڑیوں کی طرح سہمی ہوئی۔

عدالت نے اُن کا قصور انہیں بتا کر پوچھا کہ کہو تم اپنی صفائی میں کیا کہتے ہو ؟

دونوں نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر کہا۔

"حضور! ہم لوگ بالکل جاہل اور ناسمجھ ہیں۔ جو کچھ جیسا جیسا انجینیئر کی طرف سے حکم ملتا ہے ویسا ہم کر دیتے ہیں۔ اگر اس سے ہم ذرا بھی کم و بیش کرنا چاہیں تو کر ہی نہیں سکتے ہیں۔ اس کی ہم میں اہلیت ہی نہیں ہے۔"

عدالت نے یہ عذر مان لیا۔

پھر مستری ہاتھ باندھ کر کہنے لگے۔ "اجازت ہو تو کہیں قصور کس کا ہے ؟"

عدالت۔ کس کا ؟

"حضور ہم نے ہائنٹ کو اپنے ہاتھوں سے تیار کیا۔ اس کے چلنے پھرنے بولنے اور ریاں جھاڑنے کی سال بھر سے نگہداشت کر رہے ہیں ہم جانتے ہیں کہ وہ کتنا سمجھدار ہے اور اس کا ہر قدم کتنا سیدھا پڑتا ہے وہ کبھی اپنی مرضی سے ایسا جرم نہیں کر سکتا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا اس بے وقوف جھکڑ کا ہے۔ یقین مانئے کہ وہ اتنا بے وقوف ہے کہ آگا پیچھا دایاں بایاں کچھ نہیں جانتا ہے۔ اسی بے وقوف کی صحبت میں رہتے رہتے ہائنٹ کی ساری بدھ ماری گئی اور اس کے لئے بھی دایاں بایاں یکساں ہو گیا۔

آج کی بحثوں پر جو اخباروں میں تبصرے ہو رہے ہیں وہ بھی خوب ہیں۔ ماہرین تو سب پر متفق ہیں کہ قصور جھکڑ کا ہے۔ ہائنٹ کو بالکل چھوڑ دینا چاہئے۔ بالوں میں سے کچھ تو سزا کا مستحق سمجھتے ہیں اور کچھ جھکڑ کو۔

رہی پھانسی لینے والی دلیل۔ اس پر کورٹ بار میں روز کے جمع ہونے والے تو بہت ہی ناراض ہیں۔ ان کا بس چلے تو جس وکیل نے یہ بات کہی تھی اسے تڑپ تڑپ کر مار دیں۔ لیکن ان کے علاوہ شہر بھر کے جوانوں کے ماں باپ اس بات کو معقول بات سمجھتے ہیں اور اس پر غور کر رہے ہیں۔

۲۲ر ستمبر ۲۰۰۱ء لندن
رات

آج بزرگوں کی انجمن کا اجلاس پیش ہوا۔ اس نے کہا کہ ہم کہتے ہیں چھت اوپر ہے۔ زمین نیچے۔ اسی طرح ہمارے یہاں چار سمتیں حقیقی ہیں مشرق مغرب شمال جنوب پھر ان سمتوں کے کونے اور در کونے بھی ہیں ہم روز ہی سنتے رہتے ہیں اور سنتے سنتے ہمیں لگتے ہیں کہ یہ بھی واقعی ہیں۔

اگر ذرا اس نظام شمسی سے باہر نکل کر اتنی دنیا پر نگاہ ڈالئے تو اوپر نیچے کیا ہوگا۔ کون حصہ اوپر ہوگا کون نیچے ؟ اس طرح پھر سمتیں کیا

ہوں گی۔ کون مشرق ہوگا اور کون مغرب؟ ہم ذرا بھی اپنا تخیل بڑھا دیں تو معلوم ہو جائے گا کہ سب فرضی چیزیں ہیں، اوپر، نیچے، مشرق، مغرب، یہ کچھ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یا تو ہر سمت ایک سمت ہے یا کوئی سمت کوئی سمت نہیں ہے۔

اس حقیقت کے جاننے کے بعد یہ سوال ہی فضول ہو جاتا ہے کہ ہانت داہنی طرف کے بجائے بائیں طرف کیوں مڑ گیا۔ داہنی طرف اور بائیں طرف کیا؟ اسے مڑنا تھا مڑ گیا۔ بلکہ اگر وسیع نظر سے دیکھو تو مڑنا ہی کوئی چیز نہیں۔ اسے حرکت کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ حرکت کرتا رہا اور اگر اس سے بھی وسیع نظر سے دیکھو۔ وہ وسیع نظر جہاں پہونچ کر کائنات کی سرحدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ جہاں پہونچ کر فنا و بقا کا سنگم بنتا ہے۔ تو صاف نظر آئے گا کہ حرکت و سکون بھی کوئی چیز نہیں ہیں۔ ہانت کو ایک حکم ملا تھا وہ اُسے انجام دیتا رہا۔ جب حرکت نفس الامر میں کوئی چیز نہیں تو یہ سوال کہ ہانت اِدھر کیوں مڑا، اُدھر کیوں نہیں مڑا بالکل فضول اور بیکار ہے۔

اس لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ ہانت کو سزا دینا کہ وہ جنوب کی طرف کیوں مڑا، یا چھکڑے کو سزا دینا کہ اس نے ہانت کو کیوں بے راہ کیا ایک فضول سی بات ہے۔ لیکن اگر سزا دے بھی دی جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کی مخالفت کرنا بھی ایک فضول سی بات ہے۔

ان دلیلوں پر لوگ بے طرح واہ واہ کر رہے تھے۔ بعض تو اس طرح جھوم رہے تھے جیسے بین پر سانپ، اور عدالت تو ایسی بے خود ہوئی کہ حالانکہ صریحاً اصول کی خلاف ورزی تھی مگر اس نے اسی وقت وعدہ کر لیا کہ ہم آپ کی رائے پر ضرور عمل کریں گے۔ اس کے بعد اور وکیل آئے مگر وہ دہی کی ہوئی باتوں کو اُلٹ پھیر کر کہتے رہے۔

عدالت برخاست ہو جانے کے بعد لوگوں میں پھر وہی تشویش پھیل گئی۔ جو پہلے دن تھی کہ بجائے عدالت کا فیصلہ کیا ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اندر سے کوئی کہہ رہا ہو کہ سزا ہانت ہی کو ملے گی۔ لیکن اگر . . . . نہیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ توبہ! توبہ!

یکم گھپ سنہ ۲۱۴۰ نند صبح عدالت کا فیصلہ آ گیا۔ ہانت کو پھانسی اور چھکڑے کو پچاس سال کی قید بامشقت۔ وہ اُلٹا لٹا دیا جائے گا اور دو آدمی بیٹھے ہر وقت اُس کے پہیے گھمایا کریں گے۔ چھٹی صرف رات کو چار گھنٹے کی ملے گی۔ ہانت کی سزا تو خیر معقول ہے۔ مگر چھکڑے کے لئے پچاس سال کی قید اور وہ بھی ایسی مشقت کے ساتھ ذرا زیادہ رہی۔

دو گھپ سنہ ۲۱۴۰ نند سہ پہر ہانت کو پھانسی ہو گئی۔ اسے پابہ زنجیر پھانسی گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے کیلئے سارا شہر سڑکوں پر امنڈ آیا تھا۔ بچے، ہرے، سُرخ چمکیلے کپڑے پہنے سیٹیاں بجاتے، غبارے اڑاتے، اپنے باپ دادوں کے کندھوں پر سوار تھے۔ یہ عورتوں کے غول کے غول رنگین کپڑے پہنے، گلوں میں ہار ڈالے گاتے اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر جا رہے تھے، کھلونے والے، خونچے والے صدائیں دیتے گھوم رہے تھے۔ بالکل یہی معلوم ہوتا تھا کہ عید کا میلہ ہے۔

جب بامت ان لوگوں کے بیچ سے گذر رہا تھا۔ تو اس پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ سڑے گلے پھل گندے انڈے اور کیچڑ کے لوندے اتنے پھینکے گئے اتنے پھینکے گئے کہ ساری سڑک گندی ہو گئی۔ اور وہ اپسی میں ہر ایک کے کپڑے خراب ہو گئے۔

عدالت کے انصاف کی ہر شخص تعریف کر رہا تھا اور ہر شخص خوش تھا اگر کسی کو افسوس تھا تو اس بارہ برس کی لڑکی کو جو اس دن بامت کی طرفداری کرنے آئی تھی۔ آج تو جسے دیکھو لڑکی کی ماں کو نصیحت کر رہا تھا۔ کہ اس لڑکی کے چال چلن بگڑ رہے ہیں۔ ابھی سے دبا دبا کر ٹھیک کر لو۔

ایسے ہی لوگ بڑے ہو کر ری زابا بنتے ہیں۔ ان کی پیدائش ہی بند ہو جاتی تو کیسا اچھا ہوتا۔

جا بجا وہ لوگ بھی نظر آئے جو کبھی ری زابا کے ساتھ تھے وہ بھی خوش تھے۔ کہ ان کا دشمن اپنے کیے کو پہونچا۔ مگر ری زابا کہیں نظر نہیں آیا۔

۳ رگھسپ سلنہ فدرات — اس وقت ایک عجیب حادثہ ہوا۔ میں اپنی انجمن کے صدر کو مبارک باد دے کر واپس آرہا تھا کہ اتنے میں درخت کے سایہ میں ایک پرچھائیں نظر آئی۔ اس نے مجھے بہت ادب سے پکارا۔ دیکھا تو ری زابا تھا

ری زابا بیچارہ اپنے کیے پر بہت نادم تھا۔ رو رہا تھا۔ کہتا تھا کہ اب میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں۔ میں اسے کیا مشورہ دیتا۔ ساتھ لے کر اپنی انجمن کے صدر کے پاس لے گیا۔ وہ پہلے تو اس کی صورت دیکھتے ہی بگڑ گئے۔ مگر جب ری زابا نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور ان کی تقریر کی تعریفوں پر تعریفیں کرنے لگا تو وہ پگھل گئے اور بولے کہ تم کچھ فکر نہ کرو۔ جا کر اخبار میں یہ بیان دیدو کہ میں نے جو کچھ کیا صرف اس غرض سے کیا تاکہ امتحان ہو جائے کہ انجمن کا دوست کون ہے اور دشمن کون؟ اس کے بعد سب خود بخود درست ہو جائے گا۔

نہ تو اب عشق کے قابل رہا ہے
نہ مجھ کو وہ دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ روکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

مظہر جانجاناں

بلراج ساہنی

واپسی بواپسی

نوراحمد نے صبح کے وقت نماز پڑھتے ہوئے توپوں کی آوازیں سنی تھیں۔ اُس کے بعد چپراسیوں کو نئی وردیاں پہنے اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے پروردگار سے یہ پوچھنے کی کوشش نہ کی کہ ماجرا کیا ہے وہ حسب معمول خداوند تعالیٰ سے سارے کشمیریوں کی اور خاصکر داروغے کی چمڑی کتوں کے آگے ڈالنے کی دعا کرکے چپ چاپ اپنی لوئی کی تہوں میں سمٹ کر بیٹھ گیا اور کئی گھنٹے بیٹھا رہا۔

حسب دستور بارہ بجے دو بجے کا بڑا پھاٹک کھڑکھڑایا اور داروغہ صاحب اپنی چھڑی گھماتے ہوئے داخل ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی نوراحمد نے حسب معمول اپنا چھ فٹ چار انچ لمبا جسم ایک ٹانگ کے سہارے کھڑا کیا اور بڑی محنت سے گلا صاف کرکے استقبال کے طور پر کوئی تولہ بھر کف دالان میں تھوکا۔ آج دائیں بائیں کی کوٹھڑیوں سے ہنسی کی بجائے شور و غل کی آواز آئی جس سے تنہائی میں رہنے والے نوراحمد کو پتہ چلا کہ آج مہاراجہ کا جنم دن ہے۔ اور شاید اس خوشی میں کچھ قیدی چھوڑ دیئے جائیں۔

اگر آٹھ سال اِن توپوں کے چھوٹنے کا کچھ اثر نہیں ہوا تو آج کیا ہوگا۔ لنگڑے نوراحمد کو اس کا خیال رہا تھا۔ لیکن جب پچھلے سالوں کی طرح قیدی کوٹھڑیوں میں سے لوٹیاں سنبھالے ہوئے نکلے۔ تو نورو مجبوراً سوچنے لگا کہ اب اس کی بیوی کی جدائی پر ایک سال اور بڑھ جائیگا۔

اور جب اس کی کوٹھڑی کے آگے سے گذرتے ہوئے داروغہ صاحب کے قدم یکایک رک گئے تو اُس کا دل بھی رُک گیا۔ اور اُس کی لال آنکھیں ڈبڈبا آئیں

چابی قفل میں گھومی اور اُس کو باہر آنے کا حکم ملا۔ نکلتے ہی داروغہ صاحب نے ایک زنالے کا تھپڑ رسید کیا اور اُس کی ٹوپی زمین پر آ رہی۔ نورو نے جھکے سے اُسے اُٹھایا اور لاابالیانہ انداز میں ملدیا۔ وہ زمانہ کب کا ختم ہوچکا تھا جب تھپڑ لگنے سے اُس کی پیشانی پر بل پڑجایا کرتے تھے۔

بدقسمت قیدی اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر اپنی اپنی کوٹھڑی سے الوداع کہہ رہے تھے۔ لیکن اُس نے نہ سنا اور نہ ہی سوچا کہ اُس کے جانے کے بعد ان بیچاروں کا وقت کیسے گذرے گا۔ جیل کے مضحکہ خیز دستور کے مطابق اسے کسی نے ایک پرانے کپڑوں کی تھیلی لادی کسی نے پیسے دیئے۔ کسی نے انگوٹھا لگوایا اور کسی نے مشین پر چڑھنے کو کہا۔ نورو ایک سحرزدہ کی طرح ان ہدایتوں پر عمل کرتا رہا

اور اپنی بڑبڑاہٹ سے کام لیتے والوں کا دل بہلاتا رہا۔ پھاٹک کے باہر پہنچکر اُس نے باقی لوگوں سے آگے بڑھکر اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھا اپنی محسناحیوں کی معذرت کے لیے دارو غہ صاحب کے آگے سر جھکا دیا اور اپنے ساتھیوں کے الوداعی کلمات سنتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔

دس سو رو قدم اُتر کر وہ ٹھہ گیا۔ اب دفعہ سرینگر کے شہر اور اس کے گرد و نواح کی فصیل پر نظر دوڑائی۔ اپنے محلہ کو پہچاننے کی کوشش کی نیمیں پر تھیے ہنسنے سکا ردں کو رینگتے ہوئے دیکھا اور مطمئن ہوکر پھر نیچے اترنے لگا۔ سڑک پر قیدیوں کے عزیزوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ ایک ہنگامہ بپا تھا جسے دیکھ کر اسے نفرت ہونے لگی ——— آزادی کی خواہش کرتے وقت اُس نے کبھی یہ نہ سوچا تھا۔ کہ باہر کی زندگی میں رونا دھونا بھی ہوگا۔

پھر اُس کی نظریں مجمع سے اِدھر اُدھر ہوئی گھوم گھوم کر کسی کو تلاش کرنے لگی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد مایوس ہوگئی اور وہ چل پڑا۔ دیکھکر بھیڑ سے الگ دور پل پر بیٹھا ہوا ایک جوان اُٹھا اور نورو کی طرف چلا۔ اُس کی ڈاڑھی بابر کے بادشاہ کی طرح ترشی ہوئی تھی۔ اسکا رنگ گورا تھا اور وہ سرخ شال اور لال پٹی والی پگڑی پہنے تھا۔ نزدیک آکر وہ اچانک نورو کے پاؤں پر گر پڑا نورو گھبرا سا گیا۔ اور لازمی واقعے خیر پوچھنے کے بعد گھسٹنے لگا صاف کپڑوں سے اسے نقصان سا ہو رہا تھا میلی ہوجان نے اُس کی بانہہ پکڑ کر کہا۔

"لالہ! مجھے نہیں پہچانا"

نورو دیر تک نہ کر سکا کہ یہ اصلیت ہے یا محض مذاق۔ اُس نے نوجوان کو سر سے پیر تک دیکھا۔

یہ چہرہ جوانی میں بھی نوجوان کی آنکھوں میں سادگی تھی۔ وہ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

نوجوان نے کہا۔

"لالہ! میں حبیب ہوں!"

"حبیب؟ اوہ بے شرم!" نورو نے نوجوان کو چھاتی سے لگا لیا۔ اُس کی لال آنکھیں بھر آئیں۔ اور اُس کی مسکراہٹ خوشی اور غم کی حدوں کے درمیان ایک بے کار سی لکیر کھینچنے لگی۔ لیکن نوجوان کو یہ جذباتیت اچھی نہ لگی۔ کیونکہ اُس میں آٹھ سال بن بیاہے جسم کی بو تھی۔

وہ الگ ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

"حبیب؟ اوہ بے شرم؟ تو اتنا بڑا ہوگیا" باپ نے بیٹے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لالہ! آٹھ سال تو ہوگئے"

"ہاں آٹھ سال ہوگئے" انورو نے جواب دیا وہ کچھ آگے بڑھے اور کچھ دیر چپ رہنے کے بعد حبیب نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"لالہ اب تم کیا کرو گے ؟"
نورو کو یہ سوال بہت بُرا لگا۔ آٹھ سال کی سخت قید سے چھٹکارا پاکر دورخ کی پہاڑی سے ابھی اترا ہوں اور میرے بیٹے کے پاس
خیر مقدم کا یہی ایک ہی ذریعہ تھا۔ کہ مجھ سے پوچھے اب میں کیا کروں گا ؟ کیا اسے کسی نے یہ نہیں سکھایا کہ یہ باتیں ایسی حالت میں نہیں کی
جاتیں ــــــــ ؟ نورو چلا اُٹھا۔ یہ وہ حشو نہیں ہے۔ جو پولیس والوں کی کوشش کے باوجود اُس کے کندھے سے نہیں اترتا تھا۔ جس
کے روتے ہوئے چہرے کی یاد نے اُس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا تھا اور اب اُس کو اپنے باپ کے ساتھ رہتے ہوئے شرم آتی
ہے شاید اسی وجہ سے "رحمتی" ابھی نہیں آئی۔ کیوں آئے ؟ کبھی چور کے گھر آنے پر بھی کسی کو خوشی ہوتی ہے ؟ لیکن نہیں نہیں اُس نے
محبت بھری نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا کتنا خوبصورت چہرہ ہے۔ کیسا سڈول جسم ہے کچھ دنوں تک وہ خود ہی دیکھ لیں گے کہ

نورو اب کتنا بدل گیا ہے۔
لیکن وہ رحمتی کیوں نہیں آئی کہیں بیمار نہ ہو کہیں مر ہی نہ گئی ہو۔ بھلا پوچھوں تو ؟ پھر رُک گیا۔ حبیب سوچے گا باپ کتنا بیشرم
ہو گیا ہے۔ اُسے اب یہ موقعہ نہیں دینا چاہیئے اُس نے بیٹے کے سوال کا جواب سوال میں دیا۔

"تو اپنا احوال سُنا"
حبیب کا چہرہ تمتما گیا۔ وہ اسی انتظار میں تھا۔ اُس کے وردی پہنکر آنے اور باقی لوگوں سے الگ ہو کر بیٹھنے کا مطلب ہی یہ تھا۔
کہ دنیا جان لے وہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ شاید اُسے دیکھ کر باپ بھی عبرت حاصل کرے اُسے بھی معلوم ہو کہ نیکی اور پارسائی بُری چیز نہیں
ہے اٹھارہ برس کی عمر میں ہی اُس کی سب خواہشیں برآئی تھیں یہ انعام کسی کسی کو ہی ملتا ہے۔ وہ اب ایک بااثر انگریز کا بہرا تھا
دن رات کامبرلیکھ صاحب کی خدمت میں گذارتا تھا۔ گھر جاتا تو اپنے عزیزوں کے محلہ تک میں قدم رکھنا اُسے صعوبت تھا۔ کئی سڑکیں
یتیموں جس پر گذرنے کی بجائے اُسے دو میل کا چکر کاٹنا منظور تھا۔ ایسا باپ اور ایسی ماں برادری تو اُسے کچا ہی کھا ڈالے
میں رام منشی باغ میں گشینن صاحب کی کوٹھی پر نوکر ہوں۔ دو سال ہوئے کام شروع کیا تھا۔ پہلے مکان کی صفائی اور بوٹ
پالش کا کام ملا۔ پھر صاحب نے میری ایمانداری اور محنت کے صلہ میں مجھے اپنے کارخانے میں چپراسی بنا دیا۔ اب دو مہینہ سے بہرے کا
کام کر رہا ہوں۔ بیس روپے طلب ملتی ہے اور روٹی کپڑا ساتھ۔ صاحب پولو کھیلتا ہے دو موٹریں ہیں اُس کے پاس جدھر نکل جاتا ہے
ایک جہان دیکھتا ہے۔ پچھلے ہفتہ مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر گلمرگ لے گیا تھا۔ کیا تو کچھ جانتا نہیں۔ پر لالہ اللہ رحم کرے اور میرے ایمان کو برکت
بخشے صاحب آئندہ اور بھی مہربان ہوگا۔ خدا جانتا ہے رات کو تین تین بجے کلب سے آتا ہے اور اُس کی جیبوں میں سینکڑوں روپے
پڑے ہیں۔ اگر چاہوں تو پانچ دس روز ادھر اُدھر کر دوں۔ لیکن حرام کی ایک پائی مجھے منظور نہیں۔
لنگڑے نور احمد کو اور سننا مشکل ہو گیا۔ دیکھو لنگور کی طرف۔ بجائے اِس سے کہ حسب دستور پہلے اپنی ماں کا پھر دوسرے عزیزوں

اقارب کی خیریت کا حال سنانا اسے اپنے صاحب کی پڑی ہے۔ اور پھر اس کی یہ جرات کہ اپنے باپ کو نیکی اور ایمان پہ وعظ کرنے لگے ؟ لعنت ہے! اُس نے بات کاٹ کر کہا: بہت اچھا بہت اچھا۔ لیکن بیٹا جو شخص پہلے باہر سے آئے اُسے پہلے بزرگوں کا حال احوال سنانا چاہئے۔ ادب یہی سکھاتا ہے۔

اوہ سان کا کیا ہے، حبیب نے کہا جس گندگی میں پہلے پڑے ہوئے تھے اُسی میں آج بھی ہیں۔ وہی گندہ پانی پیتے ہیں۔ سال سال بھر نہاتے نہیں۔ سارا سارا دن فضول بک بک میں گذار دیتے ہیں۔ بابا جہد جو کے پاس جو کچھ تھا۔ وہ سب کچھ شراب اور جوئے کی نذر ہو گیا ہے، اور اب گھروالی کو مارنے کے سوائے اُسے کوئی کام نہیں۔ لالہ ان لوگوں سے مجھے نفرت ہو گئی ہے!

چناروں سے گھری ہوئی وہ پرانی سڑک اب نہ تھی اُس کی جگہ اک کشادہ میدانوں نے لے لی تھی۔ جن پر شور مچاتی ہوئی موٹریں ادھر سے اُدھر گذر رہی تھیں۔ جو راہوں پر سپاہی سنتری کے ساتھ ہاتھ ہلا رہے تھے اور بار بار نورو کو اس پاس کے فٹ پاتھ پر چلنے کا حکم دے رہے تھے۔ جس پر اُترنے چڑھنے میں اسے دقت ہوتی تھی۔ ہر طرف تغیر و انقلاب کی بو آ رہی تھی۔

ندی کے آس پاس وہ چنار کے درخت جن میں اکثر دوپہریں اُس نے ہمراہی دوشیزاؤں کے ساتھ چھپ چھپ کر گزاری تھیں۔ اب اُن کا نشان تک نہ تھا۔ آٹھ سال کے اندر نورو کا دیس بالکل بدل گیا تھا" میں نے سنا ہے فرنگی حرام چیزیں بھی کھاتے ہیں۔ کیا یہ ٹھیک ہے" نورو نے طنز آلود لہجے میں کہا۔

حبیب کی مغرور پیشانی اس بات پر جھک گئی۔ کھانا پکانا خانساماں کا کام تھا۔ لیکن پلیٹ میں رکھ کر تو وہی لاتا تھا۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ صاف کہہ دے کہ چوری کے مقابلے میں یہ کام بُرا نہیں ہے بلکن آخر باپ تھا۔ وہ جسارت نہ کر سکا ——————

نورو کو بھی افسوس ہوا۔ یہ مانا کہ اُسنے اپنے بیٹے کے لئے کسی روشن طرزِ زندگی کی خواہش کی تھی۔ اگر اس قید کی طویل غیر حاضری نے یہ امیدیں برباد کر دیں۔ تو اس میں حبیب کا کیا قصور ؟

کچھ دور دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر نورو سے نہ رہا گیا "رحمتی کیوں نہیں آئی ٹھیک تو ہے نا" "ہاں ٹھیک ہے" حبیب نے کچھ ادھورا سا جواب دیا "مجھے کام زیادہ تھا اس لئے کوٹھی سے سیدھا ادھر ہی آ گیا"

اب وہ سڑک کے آر پار بنے ہوئے ایک اونچے پھاٹک کے پاس پہنچے۔ جو پھولوں اور شاخوں سے لدا ہوا تھا۔ اُس کے بعد رنگ برنگ جھنڈیوں کا ایک تانا سا لگا ہوا تھا۔ دوکانیں سجی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ سنہرے حروف سے مزین پارچات لٹک رہے تھے۔ جنم دن کی ان نشانیوں کو دیکھ کر نورو کو پہلے مہاراجہ کی یاد آگئی۔ اس وقت یہ موٹریں بھی نہ تھیں۔ اور یہ چوڑی چوڑی سڑکیں بھی نہ تھیں۔ فوجی ڈوگرے ایک کندھے پر بندوق اور دوسرے پر علم رکھ کر پہرا دیا کرتے تھے۔ بوڑھا مہاراجہ کتنا شریف تھا جاتے جاتے ہزاروں خیرات کر جاتا تھا۔ جس دن کچھ کمی واقع ہوئی۔ ڈیوڑھی میں جا گھسے تو دال بھات تو ضرور ہی مل جاتا تھا

سپاہی کو چوتھے پانچویں دن ایک ولایتی سگریٹ پلادو۔ پھر چاہے وزیر کی جیب کتر لو۔ آہ وہ دن . . .
اچانک حبیب اٹھ گیا۔ اور کلائی پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"لاؤ اب اجازت دو مجھے کام ہے۔ شام کو آؤں گا۔"

نورد کو جیسے کسی نے نشتر چبھو دیا ہو۔ اسے باپ کو گھر تک چھوڑ آنے کی فرصت نہیں۔ اس کے ہاتھوں میں جلن ہوئی۔ لیکن پہلے دن ہی کان کھینچنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ کل سہی — اس نے سوچا۔

اس کے بعد لنگڑا نور احمد اپنے محلہ میں پہنچا۔ کیچڑ، باقر خانی اور سڑی ہوئی مچھلی کی بدبو سونگھتے ہی اس نے اپنے جسم میں ایک نئی جان سی محسوس کی۔ کسی کنجوس بنئے کی طرح جسے پردیس سے واپسی کے وقت یہی اندیشہ لگا رہتا ہے۔ کہ میرا گھر کہیں لٹ تو نہیں گیا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک گھر کو پہچانتا، اُسے تسلی ہوگئی کہ اس کا کوئی ہم پیشہ محلہ کے دو ایک مکان اڑا نہیں لے گیا۔

اپنی گلی کے سرے پر پہنچکر اُس نے بسم اللہ پڑھی اور اندر داخل ہوا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہی دیواریں جن کی طرف اُس نے کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی پرواہ تک نہ کی تھی۔ آج اُسے کھانے کو دوڑیں۔ ان کی اینٹیں اسے اجنبی معلوم ہوئیں۔ جیسے پوچھ رہی ہوں کہ تم کون ہو؟ یہاں تمہارا کیا کام ہے؟ دیواروں سے نورد کو ویسے ہی ڈر لگتا تھا لیکن یہ تو راستہ ہی روک رہی تھیں۔ اُس نے سوچا کہ شاید وہ کسی دوسری گلی میں گھس آیا ہے۔ وہ واپس لوٹا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ مرنے کے بعد اپنی قبر سے اٹھ کر چل پڑا ہے۔ اس نے "رحمتی" اپنی بیوی کے چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لکیریں جو جیل میں ہر دم اُس کے سامنے رہتی تھیں۔ کسی دھندلی دنیا میں جا بسی تھیں۔ بازار میں پہنچکر اُس نے گلی کا پھر جائزہ لیا۔ گلی وہی تھی۔

اتنے میں اندر سے ایک ڈھول کی طرح موٹی ادھیڑ عمر کی ہتنی ہاتھوں کو پھرن کے اندر چھپائے ہوئے۔ اپنی چھاتیوں کے شباب رفتہ کو کانگڑی کا سینک دیتی ہوئی اور نورد کو دیکھتے ہی اپنی داغی سیب کی سی آنکھیں نچاتی ہوئی چلائی۔

"واہ رے میرے ناگرائی — اے — واہ رے میرے رانجھے۔ واہ رے میرے کونگ پوش۔" پھر ہنستے ہنستے لال ہوگئی پھر پاس آئی اور نورد کا بازو تھام کر محلہ والوں کو پکارنے لگی کہ میرا ناگرائی واپس آگیا ہے۔

لیکن اس کے ناگرائی روز واپس آتے تھے۔ اس لئے محلہ میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اداس سی ہو کر وہ اسے لیکر ایک طرف تھڑے پر بیٹھ گئی۔

نورد نے اُسے شور کرنے سے منع کیا۔ اور کہا "دیکھو میں تھکا ہوا ہوں۔ مجھے گھر جانے دو۔ چھیڑ مت" — عورت نے شوخ انداز سے اپنے ہاتھ اٹھائے اور انہیں رانوں پر ٹپکتے ہوئے بولی۔ "جاؤ تمہیں روکتا کون ہے۔ مگر جاؤ گے کہاں؟"

"کیوں" رہتی "گھر پر نہیں ہے؟"

عورت اپنی بھیانک ہنسی سے پھر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

"رہتی؟ ارے کافر تجھے اس بے ہودہ طریقے سے بات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بیگم اختری جان نوش لب کو "رہتی" پکارتا ہے؟"

اس چڑیل کا طنز نورد کی سمجھ میں نہ آیا۔ آخیر اُسے قابو میں کرنے کے تنہا ذریعے کی پناہ لیتے ہوئے اُس نے عورت کی ٹھوڑی ہاتھوں میں لے کر لگاتار دس پندرہ ناشائستہ جملے کہہ ڈالے۔ ایسے میں وہ کچھ سہم گئی اور شرماتی ہوئی بولی۔

"رہتی نے دھندا کر لیا ہے۔ وہ جو دریا پر جھکا ہوا مکان ہے۔ جس کے چھجے پر پھولوں کے گملے ہیں اور اوپر مینا کا پنجرا ہے۔ اسی میں بیٹھتی ہے" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

نورد اٹھا اور اپنی ٹوپی کو ہاتھوں سے مسلتا ہوا اس نئے گھر کی طرف پیدل باندھ کر چلنے لگا۔ سیڑھیوں کے پاس ایک خوب سنورے ہوئے بالوں والا آدمی بیٹھا حقہ پی رہا تھا

لنگر سے نورد کو اوپر جاتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ "او ہالو کہاں جاتا ہے" نورد رکا نہیں۔

وہ آدمی اپنے حقے اور لوتی کی راحت کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔ لیکن چند لمحے بعد اسی تیزی سے سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا واپس آ گرا۔ اور کچھ سوچ کر پھر تمباکو پینے لگا۔

نورد ایک بند سے عیش خانے میں داخل ہوا۔ فرش پر ایک لال گبا بچھا ہوا تھا۔ اور اس پر کونے میں تکیوں سے آراستہ ایک سفید چادر۔ کھڑکیاں بند تھیں اور بتی جل رہی تھی روشنی کا عکس کھڑکیوں کے آگے لٹکی ہوئی موتیوں کی جھالر دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے شیشوں اور کچھ نیم برہنہ تصویروں پر پڑ رہا تھا۔ اُس کی رہتی سلک کی رضائی اوڑھے آنکھوں میں خفیف سا کاجل ڈالے۔ سرہانے کچھ پھول رکھے ایک بڑی سی چارپائی پر سو رہی تھی۔

نورد اپنی سالم ٹانگ کے سہارے کھڑا ہو کر مبہوت اُسے دیکھتا رہا۔ اگر وہ اس وقت اُسے خنجر بھونک دیتا یا اپنے کپڑے اتار کر اُس کے ساتھ جا لیٹتا تو یہ دونوں ہی باتیں ناممکن تھیں۔ لیکن وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ ایسی حالت کا اس کو کبھی خواب میں بھی سامنا نہ ہوا تھا وہ رنڈیوں کے پاس جا چکا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی اتنی خوبصورت نہ تھی، نہ کوئی اس کی بیوی تھی، اچانک رہتی نے آنکھیں کھولیں وہ یقین نہ کر سکی اور اُٹھ بیٹھی۔ نورد کو اُس کے بشرے سے معلوم ہوا کہ وہ پچھلے واقعات یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور نورد کی آنکھوں میں بھی اپنے وہ پچھلے کارنامے ناچنے لگے۔ جب وہ رہتی کو سڑک ہی پر پیٹنے لگ جایا کرتا تھا لیکن پہچاننے سے محبت بیدار ہو گئی اور وہ چلّا اٹھا "او حرامزادی۔ خنزیر کی بچی۔ مجھ سے اس ناپاک کیتاپن کے بغیر نہ رہا گیا؟

او تیرے باپ کی نسل دوزخ میں جائے۔ میں وہاں آگ میں جلتا رہا اور تو یہاں گلچھرے اڑاتی رہی۔ او . . . . "

پیشتر اس کے کہ نورو کی آواز حسبِ دستور تیز ہوتی اور ہاتھ اٹھانے کی نوبت آتی۔ رہتی نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے میں کچھ اصلیت تھی یا نہیں۔ اس کو صرف رہتی ہی جانتی تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ بدل چکی تھی۔ اس کے چہرے کا الھڑپن بدستور قائم تھا لیکن اب وہ اس سے کام بھی لیتی تھی۔ وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ اس سے جتنا کم کام لیا جائے ردِعمل زیادہ ہوتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اُسے اپنے خاوند کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ بے وقوف ہے۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ نورو اُسے معاف کر چکا تھا۔ وہ پاس بیٹھی، روتے ہوئے گلے سے اپنی بے شمار مصیبتوں کا حال کہہ رہی تھی۔ نورو ہمدردی سے سر ہلا رہا تھا۔ بے شک وہ بچی تھی۔ وہ کیا کرتی؟ لوگوں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کے خاوند کو کستت واڑ میں قید کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اُسے یہ کہا کہ اُسے کلکتے لے گئے ہیں۔ رشتہ داروں نے منہ موڑ لیا تھا۔ کھاتی کہاں سے ——

بیٹا بھی ایسا نالائق نکلا کہ صاحب کے چکر میں آ کے ماں کو بھی بھول گیا۔ دوبارہ وہ دریا میں کود گئی لیکن بدنصیب کو لوگوں نے نکال لیا

ا ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ب کے پاس اور کیا چارہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے ابھی تک کسی کا فش کو نہیں چھوا۔ حالانکہ وہ پیسے زیادہ دیتے ہیں۔ اور وہ پانچوں وقت نماز بھی پڑھتی ہے۔

"اچھا جو ہوا سو ہوا" نورو نے کان میں دیا سلائی پھیرتے ہوئے کہا۔ لیکن اب یہ رویہ بدلنا ہوگا۔ ہماری موجودہ حالت دونوں ہی کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ بیٹا ایسا گنوار نہ نکلتا۔ رہتی کو شریف زادیوں کی طرح پھر سے میلے کپڑے پہننے ہونگے اور منہ ہاتھ دھونا بھی دس بیس دن کے لئے ملتوی کرنا ہوگا۔ سر میں راکھ ڈال کر بال سپید سے کروا لینے ہونگے۔ تاکہ زمانے کی انگشت نمائی کا اندیشہ ذرا سے رہی متفق ہو گئی۔ اٹھی اور جلد ہی بھیس بدل کر پرانی ہو گئی۔

اس کے بعد وہی ہوا جس کے محلے والے منتظر تھے۔ بیگم اختری جان نوش لب کے چوبارے سے ایک دم چیخ پکار کی آواز آنی شروع ہوئی۔ تصویریں اور مورتیوں کی جھالریں موسم گرما کی بارش کی طرح یکایک ٹپک پڑیں۔ سننے والوں نے نہ صرف مرد کے بچے کی جرأت کی داد دی بلکہ کستت واڑ سے آئی ہوئی کئی گالیاں بھی اپنی لغت میں بڑھا لیں۔ اختری جان نوش لب کی چیخ پکار سے محلے کے در و دیوار کو لرزا ہونے لگا۔ لعنت . . . . . ٹھڈے جوتوں۔ تھپڑوں اور چھڑی سے پیٹنے کی صدائیں آنے لگیں۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ بیگم ننگے سر سیڑھیوں سے رِڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی ہیں۔ اور اُن کے پیچھے لنگڑا نورو پلنگ کا ایک رنگین پایہ ہاتھ میں لئے جلدی جلدی نیچے اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سڑک پر پہنچتے ہی بیگم اس کے نہ میں سر پٹک پٹک کر رونے دھونے کرنے لگیں۔ اس کے ناک اور منہ سے لہو بہہ رہا تھا۔ نورو نے اُسے تو وہیں چھوڑا اور "جا رہا نی نشین" دلال کے سنورے ہوئے بالوں کو تھاما اور سڑک پر گھسیٹ کر اس کی کھوپڑی کو پتھروں پر دے ٹپکا ساتھ ہی اس کی کمر میں تین چار گھونسے بھی جمائے دو کہا

لمحوں میں اُسے بے جان لوتھڑے کی طرح چت کردیا۔

اس کے بعد نورو نے بیگم کی چٹیا پکڑی اور اُسے ندی کی طرف لے چلا تاکہ قصہ ہی پاک کر دے۔ عوام جن میں کئی بیگم کے چاہنے والے بھی تھے۔ اب برداشت نہ کر سکے۔ لوگ سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ اب وہ تماشہ دیکھنے کی بجائے بیگم کو چھڑانے کے لیے بڑھے۔ عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی ہوئی اپنی اپنی قیمتی رائے کا اظہار کر رہی تھیں۔ لیکن جتنا لوگ اُس کے چھڑانے کے لئے اصرار کرتے تھے۔ اتنا ہی نورو کا ارادہ مضبوط ہوتا جاتا تھا جب نورو نے اپنی تمام پرانی حرکتوں کو دہرا لیا۔ تب اُس کے دل کو آرام ملا۔ وہی موٹی ڈھول کی سی گندے سیب کی سی آنکھوں والی "رہتی" بیگم کو اپنے بے رحم ناگرائی کے ہاتھوں چھڑانے کے لئے آئی اور آن کی آن میں کامیاب ہو گئی۔

پھر اسی پرانے گھر میں جس کی چھت پر پیاز کی کھیتی تھی۔ نورو نے اطمینان کا سانس لیا۔ رہتی کے ساتھ میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گذارنے میں اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ کیونکہ رسم پوری سنجیدگی کے ساتھ نبھا دی گئی' رہتی نے بھی چہرہ سے بہتے ہوئے لہو کو پونچھا۔ پھر یہ دیکھا کہ نوٹوں کا بلندہ ازار بند میں محفوظ ہے اور گھر کے کام میں لگ گئی۔ نورو ساتھ والی چھت پر ایک بزرگ کے ساتھ حقہ پینے لگا۔ اسی گھر کے ایک نوجوان نے بازار سے اُسے ایک ململ کی پگڑی لا دی۔ اسے اپنے اُنہیں میلے کپڑوں پر سجا کر اور ایک للچائی ہوئی نظر سے رہتی کو دیکھ کر وہ دنیا کو اپنی نئی زندگی کی خبر دینے کے لئے نکل پڑا۔ شام ہو چکی تھی۔ بازار میں بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ گھروں میں سے چیل کے دھوئیں کی خوشبو آ رہی تھی۔ نورو کے من میں اس وقت صرف دو خیال تھے۔ ایک تو اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ دوسرے جیل کے پھاٹک میں سے جو دنیا اتنی آرام دہ معلوم ہوتی تھی وہ اب پھیلی ہوئی اور پھیکی پھیکی نظر آ رہی تھی۔ جیل سے وہ بڑے نیک ارادے لیکر نکلا تھا۔ اب اُن کے پورا ہونے کی امید نظر نہ آتی تھی۔ رہتی کے جسم کے لئے اُس کے خون میں زبردست بھوک تھی۔ شاید وہ رات کو رہتی کو اسی طرح پاک صاف ہو کر آنے کا اشارہ کرے۔ لیکن اس کی زندگی کا سہارا تو جیب تھا۔ اور وہ کتنی صفائی سے کتی کاٹ گیا تھا۔ شام ہو گئی۔ لیکن ابھی تک نہیں آیا۔ کیا ہی اچھا ہوا۔ کہ اُسے کچھ دنوں کے لئے جیل میں سونے دیا جائے۔ ابھی کچھ گھنٹوں کی آزادی کافی ہے

اسی سوچ میں وہ لنگڑاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا دھیان ایک کھانے پینے کی دوکان کے باہر پڑے ہوئے صندوق کی طرف گیا۔ اس میں سے کسی لڑکی کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

تُہاڈا ردشے   پوشے متہ جانانو

نورو ٹھہر گیا۔ یہ کون گا رہی تھی؟ اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے کوئی بیس آدمی کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں لیکن کسی کے چہرہ پر ذرا بھی رحم کی علامت نہیں ہے۔ کہ گانے والی کو اس قید سے نکالے۔ یہ صندوق اُس کی کوٹھڑی کے مقابے

میں کتنا چھوٹا تھا۔ اتنے میں گانا بند ہوگیا۔ دوکاندار نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا اور اس میں سے ایک بھالی سی نکالی۔ نورو ایک کر آگے بڑھا اور اندر جھانک کر پوچھنے لگا۔ "ستی کہاں ہے؟"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ اتنے میں ایک پرانے ہمجولی نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور اُسے دوکان کے اندر لے گیا۔

رات کے دس بجے نورو اس دوکان سے لڑکھڑاتا ہوا نکلا۔ لڑکی پھر وہی گیت گا رہی تھی۔

زلہارو شے رو شے　　پو شے متپہ جانانہ

نورو نے ہنستے ہنستے ڈھکنا اٹھایا اور جھانک کر پھر رکھ دیا۔ لیکن اب کوئی نہ ہنسا۔ سڑک خالی تھی اپنے دوست سے رخصت ہوکر نورو آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چلا اور ساتھ ہی ساتھ اُس کا دل اپنے گھر کی طرف سے اچاٹ ہونے لگا۔ کیا رکھا ہے وہاں؟ ببیوں کے ساتھ لپٹ چکی ہے جیب کے گھر آنے کا سبب بھی وہی ہے۔ نہ جانے اب بھی کسی یار کو بغل میں لئے ہوئے لیٹی ہو۔ ننھے میں اگر کسی کی فطرت دو رخی ہو جاتی ہے اور کسی کی ہنسی۔

نورو واپس لوٹ گیا۔ مشرق کی طرف آسمان لال لال تتیوں کی روشنی سے انگارا ہو رہا تھا۔ امیرا کدل میں مجمع کا شور رسنائی دے رہا تھا۔ نورو کے دماغ میں شراب کی مستی بڑھ رہی تھی نہ قدمی کے ساتھ وہ بھی امیرا کدل کی طرف چلا۔

بڑے بازار میں کافی بھیڑ تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ کھڑے تھے۔ مہاراج کی موٹریں گزر رہی تھیں۔ نورو نے بھیڑ میں ٹھہرنا پسند نہ کیا سرکتا سرکتا لوگوں کی گالیاں اور دھکے کھاتا ہوا پل کے پاس پہنچ گیا۔ بھیڑ میں سے نکل کر وہ پاس ہی کے باغ میں چنار کے نیچے جا بیٹھا۔ اُس کا ہاتھ اُٹھ کر اُس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ اُس میں ایک سونے کی گھڑی اور زنجیر تھی۔ ایک چمڑے کا بٹوا بھی تھا۔ نورو نے اُسے کھول کر دیکھا اُس میں پندرہ روپے تھے۔

وہ ہنسنے لگا۔ اور گھڑی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اُس کی انگلیاں اب ویسی مشاق نہ رہی تھیں۔ لیکن ناکارہ بھی نہ ہوئی تھیں۔ یکایک اُس نے بٹوہ اور گھڑی نفرت سے دور پھینک دی اور اپنی مٹھی کو کھولنے اور بند کرنے لگا۔ لیکن اُس کے مَس کی بچینی دور نہ ہوئی اُٹھ کر پھر بازار میں آیا۔ موٹریں گذر چکی تھیں اور ہجوم منتشر ہو رہا تھا۔ نورو کو محسوس ہوا کہ اُس کے دل بہلا دے کی جتنی چیزیں تھیں سب بکھر رہی ہیں۔ درحقیقت جو لوگ ایک آدمی کو موٹر میں گذرتے ہوئے دیکھنے کے لئے کھڑے رہیں اور پھر چپ چاپ گھر چلے جائیں وہ ادھر تھے ہی کیا۔

بھیڑ میں ایک جگہ گا نٹھ سی پڑی ہوئی تھی۔ ایک موٹے پیٹ والا آدمی کبھی پل پر ادھر اور کبھی اُدھر جاتا۔ جدھر وہ جاتا بھیڑ اُس کے پیچھے جاتی۔ نورو کو پتہ چلا کہ اُس کی سونے کی گھڑی چوری ہوگئی ہے۔ اُس کے بعد ایک اور ٹولی تھانیدار کی نگرانی میں آ پہنچی۔ اُن میں سے ایک کا بٹوا گم ہوگیا تھا اور ایک کا قلم۔ ایک دوسرے کا جیب کتر گیا تھا۔ نورو کو پہلے تو تعجب ہوا

لیکن پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ اکیلے جادوگر کا کام نہیں تھا۔ کوئی اور بھی کھیل رہا تھا۔ پل کے نیچے دریا اپنی مستانہ چال سے بہہ رہا تھا۔ دکانوں میں ستبھرں کسی ہونے والی شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ تختِ سلیمانی پر چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ پل کے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر نورو نے گنگنانا شروع کیا

زلما رد تسے ردشے بوشے منتہ جانانو

دلوماں پوسے مدنو

پھر آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ لنگڑا نورو بھی اس کی ایک شاخ کے ساتھ پیچھے پیچھے چلا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس حالت میں جا رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے اور کیوں؟ کبھی کبھی وہ ادھیڑوں کو ٹوٹتے دیکھتا یا ان کے لباس پہنتے ہنسی کرتا۔ لیکن وہ سیدھے سامنے نکل آگے چلے جاتے جن سے اسے معلوم ہوا کہ رات کو بھی لوگوں کے دفتر کھلے ہیں۔

اب آہستہ آہستہ ہوئی کہ گھر جائے لیکن ایک ایک قدم کے ساتھ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ملیں بس نیلم آگے بڑھ رہا ہے۔ حبیب خاں گھر پر نہیں ہوگا۔ رہنی کتنوں کے ساتھ لیٹ چلی ہے۔ ناپاک عورت۔ اب بھی کسی کی بغل میں بیٹھی ہوئی۔

آخر کار اس ادھیڑبن میں نورو نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آج ہی رات دوسری شادی کرے گا۔ حبیب اور رہنی کو اب وہ شکل تک نہ دکھائے گا۔ عورتیں ڈھولکوں میں بیٹھ کر اس کی شادی کے گیت گائیں گی۔ اور وہ صندوق کا گانا بھی ضرور گنوائے گی۔

لیکن اس کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوگی اور وہ پیسوں کے لئے ہی تو بھیڑ کے پیچھے جا رہا تھا۔

شالیمار باغ کے فواروں کے نزدیک پہنچ کر اس نے راستہ بدل دیا۔ باغ کے بائیں طرف تین چار سفید کوٹھیاں چاند کی روشنی میں سو رہی تھیں۔ انہیں میں سے ایک پر اس کی نظر جم گئی۔

کوٹھی کی بغل میں ایک پیڑ تھا۔ نورو اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کسی محبوبہ کی آغوش میں جکڑا ہو۔ آہستہ سے اس نے پگڑی اتاری۔ اور اس کو زمین پر رگڑ کر میلا کیا۔ اس کے بعد اس کو رسی کی طرح گانٹھ کر بازو کے نیچے دبا لیا

کوٹھی کے سامنے سات فٹ اونچی دیوار تھی۔ اور اس کی منڈیر پر کانچ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ سڑک کی ٹوہ لیکر نورو بڑے آرام سے دیوار کے پاس گیا اور سایہ میں پوشیدہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک بھکاریوں کی طرح بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے پگڑی کو ڈھیلا کیا۔ اور ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ منڈیر کے کانچ پر ٹپکا۔ وہ فوراً کانچ

کے ساتھ جم گئی۔ اس کے بعد اس نے پگڈنڈی میں جگہ جگہ گانٹھیں لگائیں۔ اس طرح پگڈنڈی کی دوہرائی میں قدم رکھ رکھ کر وہ دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ اور بڑی تیزی سے پگڈنڈی کی سیڑھی کو باہر سے اٹھا کر اندر کی طرف لٹکایا اور پھسل کر باغیچے میں آ گیا۔ یہ پگڈنڈی کھول کر اس نے اس طرح پھیلا دی جیسے کسی نے کوئی کپڑا سکھانے کے لئے دن میں ڈال دیا ہو اور اٹھانا بھول گیا ہو۔ ... ایک کنارے کے نیچے نورو نے اپنا جوتا چھپا دیا تاکہ ڈھونڈنا نہ پڑے۔

مکان کے آگے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کے شیشے کے سب دروازے بند تھے۔ چٹخنیوں کو کاٹ کر دروازہ کھولنا ناممکن تھا کیونکہ نورو کے پاس کوئی اوزار نہ تھا۔ اس لئے وہ مکان کے پیچھے کی طرف گیا۔ اوپر کی چھت کے ایک کمرے میں بتی جل رہی تھی ... اس میں نوکر برتن مانجھ رہے تھے۔ مکان کے ایک طرف لکڑی کی تنگ سیڑھی تھی جس کا دروازہ ابھی بند نہیں کیا گیا تھا۔ نورو دبے پاؤں اوپر چڑھ گیا اور باورچی خانہ کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوکر برتن دھو رہا ہے اور دوسرا پلیٹیں صاف کر رہا ہے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ دونوں کم از کم آدھ گھنٹہ تک منہ پھیر کر اس طرف نہیں دیکھیں گے۔ یہ دھیان کر نورو بالکل ان کے سامنے سے ہو کر گذر گیا اور ایک اندھیرے کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن فوراً ہی اسے ایک نوکر کے گانے کی آواز اپنی طرف آتی سنائی دی اور وہ فوراً دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ نوکر اندر آیا۔ اس کا کلیجہ دھڑکنے لگا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر نوکر نے بجلی کا بٹن دبا دیا تو اسے کیا کرنا چاہیئے۔ مگر نوکر نے بجلی کا بٹن نہیں دبایا۔ کوئی چیز اٹھا کر باہر چلا گیا۔ نورو دوسرے دروازے میں سے ہو کر مکان کے اندر جا گھسا۔ یہاں ایک گلی سی تھی جس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اوپر چلی جاتی تھیں۔ فرش لکڑی کا تھا اور چرچر کرتا تھا۔ لیکن نورو ہلکے قدموں سے اوپر والی سیڑھی پر چڑھ گیا۔ پھر اپنے ہاتھوں کے سہارے جنگلے پر زور ڈال کر تین چھلانگوں میں تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ اب ایک منزل باقی تھی وہ بھی چڑھ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ چھت پر کوئی نہیں رہتا۔ مطمئن ہو کر سیڑھیوں میں بیٹھ کر وہ دم لینے لگا۔

سیڑھی کے دائیں بائیں کے دروازوں سے چاند کی روشنی چھلک کر اندر آ رہی تھی۔ اس کی مدد سے نورو نے اس گھر کے اندر اپنی نظر دوڑائی۔ بالکل سنسان تھا۔ نورو کو اپنا وہاں ہونا بہت عجیب سا لگا۔

اس کے دل میں کسی نے چٹکیاں سی لینی شروع کیں۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ اس لئے کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ مجھے ان کے گھروں کے وہ حصے دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ جسے وہ خود دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ دولت صرف کر کے مکان بنواتے ہیں۔ اور پھر انہیں بالکل بھول جاتے ہیں۔ صبح اٹھتے ہی کام پر چلے گئے۔ رات کو آئے اور چٹخنیاں لگا کر سو رہے۔ ان لوگوں نے کبھی اس طرح سیڑھیوں پر بیٹھ کر چاند کو نہیں دیکھا۔ حقیقت میں مکانوں کا مالک تو میں ہوں۔ پاس آتے ہی ان کی دیواروں سے دوستی پیدا کر لیتا ہوں۔ میں ان کے سینے چیر کر اندر چلا جاتا ہوں اور وہ مجھے یاد کرتے رہتے ہیں۔

ایک سفید بلی ایک کونے سے نکلی اور نورو کو دیکھ کر ڈر گئی ۔ نورو بھی گھبرا سا گیا ۔ اور پھر ہنسنے لگا ۔ خداوند نے اُسے غرور کی سزا دی ۔

نوکر اب سو گئے ہوں گے ۔ یہ قیاس کر کے نورو پیچھے کی چھت پر آہستہ آہستہ آیا ۔ یہاں اُس نے ایک کمرے کے کواڑ کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا ۔ چاند کی روشنی کمرے کے اندر آ رہی تھی ۔ دیوار کے ساتھ ایک میز پر کچھ بوتلیں تھیں ۔ اور باقی کمرہ بھی میز کرسیوں سے پُر تھا ۔ نورو نے ایک بوتل کھولی اور ناک سے لگائی ۔ پھر غٹا غٹ دس پانچ گھونٹ پی گیا ۔ اس کے بعد وہ کرسیوں سے بچتا ہوا ساتھ والے کمرے میں گیا ۔ یہ بھی خالی تھا ۔ کیا سارا مکان ہی خالی ہے ۔

اس کمرے کے ایک طرف میز پر کچھ چیزیں پڑی تھیں ۔ نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ یہ تیل کی بوتلیں ، کنگھی ، برش وغیرہ ہیں ۔ نورو نے دراز کھول کر دیکھے یہاں اُسے سونے کی چار چوڑیاں اور دو انگوٹھیاں ملیں ۔ نورو نے اِسے بہت ہی اچھا شگون سمجھا ۔ اُس کی ہونے والی بیوی کے لئے زیور کا انتظام بہت ہی آسانی سے ہو گیا ۔ انہیں جیب میں ڈال کر اُس نے درازوں کو پھر ٹٹولا ۔ لیکن اور کچھ نہ ملا ۔ واپس لوٹتے وقت اُس نے دیکھا کہ اُس کی ٹانگیں یعنی ٹانگ کچھ لڑکھڑا رہی ہے ۔ یہ سمجھ کر کہ شراب اگر خاص مقدار میں پی جائے تو تسلی بھی ثابت ہو سکتی ہے ۔ اُسے خوشی ہوئی ۔ اُس نے پہلے کمرے میں آ کر تیل کی باقی ماندہ شراب بھی ختم کی ۔ تب اُسے خیال آیا کہ دلہن کے لئے زیور تو لے لیا اگر تیل کنگھی اور شیشہ بھی لے چلوں تو کیا ہرج ہے ؟ زمانہ بدل رہا ہے مجھے بھی اپنے خیالات بدلنے چاہئیں ۔ میں اپنی دلہن رنڈیوں سے بھی خوبصورت بنا کر رکھوں گا ۔ وہ کسی دوسرے مرد سے تعلق نہیں رکھے گی ۔ صرف مجھے ہی پیار کرے گی ۔

اب نڈر ہو کر اُس نے بجلی کا بٹن دبایا ۔ کمرہ چندھیا اٹھا ۔ اُس نے دیکھا کہ دیواروں سے لگی ہوئی دو تین الماریاں کھڑی ہیں وہ رُکتا رُکتا اُن کے پاس پہنچا اور اُن کے کواڑ کھول دیئے ۔ پھر دیکھا کہ الماریاں سلک اور اون کے نرم نرم کپڑوں سے بھری ہوئی ہیں اور اُن سے بھینی بھینی دلکش خوشبو آ رہی ہے ۔ اُس نے کپڑے فرش پر ڈالنے شروع کئے ۔ پھر اُن کو اکٹھا کیا اس کے بعد تیل کنگھی شیشہ لینے کے لئے ڈریسنگ ٹیبل تک گیا شیشوں کے بیچ میں ایک چاندی کی چھوٹی سی بہت ہی خوبصورت سرمہ دانی دیکھی ۔ اُس کا دل باغ باغ ہو گیا ۔ اگر دلہن سجی ہوئی ہو تو کیا دولہا یونہی رہے ؟ وہ کپڑوں کے درمیان آئینہ اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا ۔ اور آنکھوں میں سرمہ کی سلائی پھیرنے لگا ۔

دروازہ سے پہرے دار کی آواز اُس کے کان میں پڑی ۔ خبردار ، خبردار ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے ؟

یہ آواز نورو کو بڑی سریلی معلوم ہوئی خاص کر ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے ، والا حصہ جیسے پہریدار نے یہ صدا خاص اُسی کے سننے کے لئے لگائی ہو ۔ بڑے آرام سے اُس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگایا ۔ اور اس بات کی کوشش کی کہ آنکھوں ہی

میں پڑے۔

پہریدار کی پھر آواز آئی۔

خبردار ہو ..... اسے؟

نوروکو پھر بہت لطف آیا۔ بچوں کی طرح نقل اتار کر اس نے بھی اونچی آواز میں کہا:-

خبردار ہو ...... اسے؟

محلے کے پہریدار کو یہ آواز سن کر بہت اطمینان ہوا۔ فنکاروں کو فنکاروں کی داد سے مسرت ہوتی ہے۔ وہ اپنا لٹھ دیوار کے سہارے رکھ کر ایک نئے طور سے للکارا۔

ہٹ۔ ہٹ۔ آہ ہ ہ ہ ہ۔ خبردار ہو ... اسے؟

ادھر سے بھی صدائے بازگشت آئی۔

ہٹ۔ ہٹ۔ آہ ہ ہ ہ ہ۔ خبردار ہو ..... اسے؟

لیکن ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ و پکار شروع ہوگئی ـــ انجنیئر صاحب کے گھر سے گھبرائی ہوئی آوازیں آنی شروع ہوئیں اور پہریدار بھاگا۔ پھاٹک کود کر مکان کے اندر گھسا اور فوراً ہی بندوق کا ایک ہوائی فیر کیا۔ نیچے کی چھت پر انجنیئر صاحب اور ان کا خاندان برامدے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ اب اوپر سے لگاتار آوازیں آرہی تھیں۔

ہٹ ہٹ۔ آہ ہ ہ ہ ہ۔ خبردار ہو ... اسے؟

ہٹ۔ ہٹ۔ آہ ہ ہ ہ ہ۔ خبردار ہو ...... اسے؟

مترجمہ نسائی

چینگ تن یہ

کون سا راستہ

(چینگ تن یہ ـــــ ۱۹۰۷ء)

یہ مصنف اپنے متعلق خود یوں رقمطراز ہے -

میں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوا۔ میرا خاندان جو زمینداروں کے طبقہ سے تھا، صوبہ ہوپان میں مانگسی کی وادیوں میں رہتا تھا۔ لیکن میرے دادا کے بعد سے اس کا تنزل شروع ہوا۔ میرے والد کو تلاشِ معاش کی آوارہ گردیوں میں پورے خاندان کو ساتھ لئے چلنا پڑا۔ اس طرح پانچ سال کی عمر سے میں ان کے ساتھ ہوں۔ اور کئی ہی جگہیں گھوم چکا ہوں۔ اٹھارہ سال کی عمر تک کہیں جا کے میں نے اپنی تعلیم شنجاؤ (صوبہ چیکیانگ) کے ایک مڈل اسکول سے ختم کی۔ ۱۹۲۳ء میں پیکنگ گیا۔ لیکن وہاں کسی اسکول میں داخل نہیں ہوا۔ وہاں مجھے میرا نیا عقیدہ مارکسیت واضح طور سے حاصل ہونے لگا اور رفتہ رفتہ تاریخ کی اس واحد حقیقت کو میں نے سمجھا۔ اس کے بعد میں معمولی کلرک، فوجی معاون، اخبار کا نامہ نگار اور مضمون نگار، اسکول ماسٹر اور نہ جانے کیا کیا رہا۔

چونکہ میرے والدین اور ایک بہن کو ادبیات سے شدید شغف تھا اس لئے فطرتاً مجھ پر ان کا اثر پڑا۔ مڈل اسکول ہی میں میں نے چند طلباء، مضحکہ خیز کہانیاں لکھی تھیں۔ ۱۹۲۵ء میں پیکنگ کے اخبار سے میری ایک تحریر شائع کی جو نام نہاد اشاریت کی تقلید میں لکھی گئی تھی۔ اس وقت میرا یہ عجیب احمقانہ خیال تھا کہ ادب اور عمل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ بعد میں میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔

۱۹۲۸ء میں حقیقت پسندانہ انداز میں لکھنے کے لئے میں اپنے کو تیار کرنے لگا اور ایک کہانی "ساڑھے تین دن کا خواب" لکھی۔ یہ رسالہ "تیز دھارا" میں شائع ہوئی۔ جس کا ایڈیٹر لوہسون تھا۔ اس سے لکھنے کے لئے میری ہمت بڑھی۔ میری تحریریں دو ناول — "ایک سال" اور "مانگچینیگ کا ماسٹر" کہانیوں کے مجموعے "جمل وحرکت"، "ہوائی حملہ"، "گول ممس"، "چینگ منگ تہوار" وغیرہ اور بچوں کی دو دو کہانیوں پر مشتمل ہیں۔

میرے کردار دوستوں، رشتہ داروں اور ان لوگوں سے لئے گئے ہیں جن سے میں اکثر ملتا رہتا ہوں۔ پہلے مجھ میں کمزوری تھی کہ اپنے کرداروں سے محض کہانیوں کے موضوع کو ظاہر کرنے کا کام لیتا تھا اور پیچیدہ فطرتِ انسانی کے مظاہر کو نظر انداز کر جاتا۔ اب میں نے اس غلطی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ "مثالی کردار" کی اہمیت کو میں یاد رکھوں گا اور اس کی کوشش کروں گا۔

مضمون میں ڈکنس، موپساں، زولا، بالزاک، ٹالسٹائی، چیخوف، گورکی اور لوسن کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر پڑا۔ سوویٹ روس کی نئی تصنیفوں، خاص کر 'فنڈ لیڈی' 'ریڈ گروم' (جس کا انگریزی میں 'نیس' کے نام سے ترجمہ ہو چکا ہے) کا بھی مجھ پر بہت اثر ہوا۔ ان مصنفوں کی کتابیں پڑھ کے مجھے اپنی کمتری کا احساس ہوتا ہے لیکن انہی سے اور بھی مجھے سیکھنے اور لکھنے کی خواہش ہوتی ہے، گویا ان اساتذہ کی رہبری میں!

ہینگ تمن یہ کی ایک نئی طویل کہانی "نفرت" زندہ چین میں چھپ چکی ہے۔

حسبِ تقدیر خلاف خواہشوں میں انتخاب کیسے کا سامنا کرا دے ——— شہہ نگ (زندہ چین صفحہ ۴۲)

۱

سیہانگ ہوا نے کھلی کھڑکی سے ایک نظر باہر ڈالی اور پھر کاہلی سے میز کو دیکھنے لگی۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ جنگلی انار کی کلی کی طرح سرخ تھا۔ کھڑکی سے ہلکی ہلکی ہوا آ کے لیمپ کے ریشمی جھالر کو لہرا رہی تھی۔ ہوا کے ساتھ باہر سے ایک مغنی کی آواز بھی آئی جو غنائی شعر میں تصورات بھر کے گا رہا تھا۔ اس کی تصویریں سکڑ گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے منہ کا مزا ناخوشگوار ہو گیا ہے، جیسے کوئی بیر کھالی ہو۔ اس نے اٹھ کے ایک مٹھائی لی اور بڑی نفاست سے منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

ہاں بہن، تو تم کیسے جاؤ گی؟
دوسری عورت نے، جو سگرٹ پی رہی تھی اور بے خیالی سے ایک تصویر کو دیکھ رہی تھی، سر گھما یا
"اس؟ ہاں، تو کیا کہہ رہی تھی میں؟"
"میرا خیال ہے تم مجھ پہ نکتہ چینی کر رہی تھیں"
او ——— ہاں؟ وہ جم کے بیٹھ گئی اور سگرٹ سے راکھ جھاڑ کے بولی "تو میری پیاری، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری زندگی۔

جب اس نے بولنا شروع کیا تو سیہانگ ہوا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن فوراً ہی اس کی نظر اُجٹ کے آئینہ پر چلی گئی۔ اپنے جسم کی خوبصورتی اور نمایاں کرنے کے لئے اس نے نشست بدل لی۔ وہ بڑی نزاکت سے منہ چلا رہی تھی اور بڑے غور سے سن رہی تھی جب کوئی خود اس کے متعلق باتیں کرتا تو وہ ہمیشہ بڑے دھیان سے سنتی۔
اپنے اوپر نکتہ چینی و تبصرہ کیا جانے سے وہ لطف لیتی تھی۔ آخر یہی کیوں؟ ہر شخص اس کی تعریف کرتا تھا اور اسے پسند کرتا۔ وہ دولتمند تھی، اور دل کھول کے تفریح کر سکتی تھی اور یہی تو اس کی سب سے بڑی بنا تھی۔ وہ سب مرد اور عورتیں جن کے گانے کی آوازیں جھیل کے پرے سے آ رہی تھیں اس کے مہمان تھے۔ یہ شاندار باغ اس کا تھا اور یہ وسیع قصباتی عمارت اس کا "عشرت محل" جہاں وہ گرمیاں

گذارتی تھی۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ لوگ اکثر کہتے "یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ اونچے خاندان میں پیدا ہوئی ہے۔"
یہ سچ ہے کہ کیتی سینگ ہو نے اپنی ماں کے ساتھ بڑی معاشی کی زندگی گذاری تھی لیکن اس کا اپنا انداز ہمیشہ سے ایک اعلیٰ رتبہ خاتون جیسا تھا۔ اب بہت سے لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے اور جو بیس ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ اس کی دولت اور اس کے شوہر کے منافعوں کا اندازہ کرتے۔ اس کا شوہر شکر، ورربڑ کا دلال تھا۔ پھر بھی ان سب کے باوجود اس کے بہتیرے دوست معترف تھے۔

کہ اس کا مذاق بڑا ستھرا تھا اور کبھی بھی وہ اپنی دولت کا ذلیل طریقہ سے اظہار نہیں کرتی تھی۔
"یقیناً وہ جانتی ہے کہ مسرت کہاں ڈھونڈنی چاہیئے اور کیسے حاصل کرنی چاہیئے۔"
"وہ کہتے ہیں ایسی زندگی میں کسی کو شکایت نہ ہونی چاہیئے۔"

اور بلا شبہ اس میں مبالغہ نہ تھا۔
جب کبھی لوگ اس کے بارے میں باتیں کرتے تو سنگ ہوا بالکل الگ تھلگ ہو کے بڑی متانت اور بے تعلقی سے ان کی تنقید اور رائے زنی پر غور کرتی۔ وہ اپنے کو یقین دلاتی کہ اس نے اپنے غرور کو بالکل بند کر دیا ہے اور فیصلہ کا انتظار کر رہی ہے۔ یا پھر اس بچے جیسی معصومیت اور بھولا پن دکھلاتی جو ڈانٹ اور ملامت کا انتظار کر رہا ہو۔ پھر بھی بعض مرتبہ باوجود کوشش کے، وہ مسکراہٹ نہ روک سکتی اور اس وقت بڑے انداز سے اپنا سر آئینہ کی طرف گھما دیتی اور دیکھنے لگتی کہ چہرہ پر غازہ اور پوڈر کی ضرورت تو نہیں، وہ اپنی چچیری بہن کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کا دماغ کام کرنے لگا۔ "اس اُد عورت یا مرد میں کیا فرق ہے؟ وہ تو بالکل ایک عجیب سی مچھلی کی طرح ہے۔ نہ عورت نہ مرد۔ اس کا چہرہ بالکل سادہ ہے، نہ غازہ، نہ پوڈر۔ بال چھوٹے چھوٹے ہیں اور اس کے کولھوں کے اوپر تو بالکل سیدھی سادی کھڑی لکیریں ہیں۔ نہ خم، نہ دائرہ۔ اس کی آواز تو ایک دم پھٹی ہوئی ہے۔ بولتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رسی میں بندھ کے گھسٹ رہی ہو۔"

اس کی بہن اس وقت بڑے جوش میں تھی اور آخر کار اپنی بات کے اصل حصہ پہ پہنچی تھی: "اپنے چاروں طرف نظر ڈالو، اس زمانہ کو دیکھو جس میں ہم ہیں!" ــــ وہ منہ سے دھوئیں کے گہرے بادل نکال رہی تھی ہلکے ہلکے کش نہیں، بڑی بڑی پھونکیں جیسے دھماکے کے بعد کے بھبکے! ــــ "تم نے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے؟ تم اس شان و شوکت میں کب تک زندگی بسر کئے جا سکتی ہو؟ اسے زندگی کہہ بھی سکتی ہو؟"

.. .. تھوڑی سی خاموشی ....

"میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں حقیقتوں کا کچھ احساس نہیں۔ اپنی اس مصنوعی دنیا میں چھپی ہوئی تم روزانہ اخبار بھی نہیں پڑھتیں۔ ایک لمحے کے لئے فرض کرو کہ ربڑ کا بازار گر جائے، پھر تم کہاں ہوگی؟ تم ان امکانات کا خیال تک کرتے ہوئے ڈرتی ہو ــــ تمہاری تفریح

میں خلل پڑے گا، ہے نہ؟ واقعہ یہ ہے کہ تمہاری جیسی حسین عورت ——"

اس نے یکایک سینگ ہُوا کو دیکھا۔ وہ اپنے گلابی چمکتے ہوئے ناخنوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے منہ کی مٹھائی نگلی۔ —— نگلنے میں اس کی گردن دلکش معلوم ہونے لگی! —— اور کچھ دیر چپ رہی۔ پھر ایک حسرت بھری ٹھنڈی سانس لے کے بولی: "ہٹاؤ بھی، ایسی باتیں نہ کرو۔ آج کا دن، ہر دن، میں صرف تفریح میں گذار دینا چاہتی ہوں۔"

"اگر کوئی بڑی آفت آجائے تب؟ شنگھائی کے انقلاب اور جنگ سے بھی بڑی! ایسی باتیں یکایک ہو جایا کرتی ہیں۔ ملا کسی غیر کے ممکن ہے بیسیوں سال گزر جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کل ہی کچھ ہو جائے۔"

"کل"! سینگ ہُوا کی بھنویں اوپر اُٹھ گئیں۔ "اس کا خیال بھی کرنے سے پہلے میں مرجانا پسند کرونگی۔ اگر کل ہی کوئی واقعہ ہو جائے —— تو پھر کل ہی میری موت بھی ہے!"

اس کی بنتِ عم مسکرائی اور کھڑکی کی طرف رخ کئے کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر بولی:

"میرے خیال میں چچا چچی نے تمہیں اچھی تعلیم دی ہے۔ تم ان کی اکیلی بیٹی ہو۔ بلاشبہ انہوں نے تمہیں ——"

"مجھے کیا؟" سینگ ہُوا نے آئینہ پر ایک چوری کی نگاہ، اور جو کچھ وہاں نظر آیا اس سے بعد خوش اور مطمئن ہو کے اپنا انداز وہی رکھا

"کیا؟! انہوں نے تمہیں ایک دولتمند کی بیوی بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔"

سینگ ہُوا نے مسکرا کے پوچھا: "لیکن کیوں؟"

دوسری عورت نے اپنے کاندھے ہلائے: "تمہیں خوش رکھنے کے لئے۔ کیا یہ پتہ نہیں کہ انہوں نے تمہیں بڑے ناز و نعمت میں رکھا؟ انہوں نے تمہیں بیگم کی طرح رہنا سکھایا۔ ایک سچ مچ کی بیگم کی طرح۔ اور اب تمہیں ایک بیگم بنا دینے میں کامیاب بھی ہوگئے۔ تم نے لکھ پتی سے بیاہ کر لیا ہے۔ تم خوش ہو؟ نہیں؟ اور تمہارے سارے خاندان کو بھی فائدہ پہنچا ہے۔"

"نہیں، نہیں، یہ بات نہ تھی! میں ایسی فرماں بردار کب تھی؟ تمہیں یاد نہیں اس سال جب اماں نے اُن حضرت چین سے میری منگنی کرنی چاہی تو میں نے انکار کر دیا تھا؟ پھر بار بار میں انکار نہیں کرتی رہی؟"

"اور اب؟"

سینگ ہُوا شرما گئی: "یہ تو بات ہی دوسری ہے۔ یہ شادی تو میری خود —— میری خود اپنی ——"

بنتِ عم نے اپنے چہرہ پر سے چھوٹے چھوٹے بال بے صبری سے ہٹائے اور تمام آداب و تہذیب کو نظر انداز کرتی ہوئی پیر پر پیر چڑھا کے بیٹھ گئی۔

"میں کہتی ہوں ہوں تمہارا فلسفہ تمہاری تعلیم ہی کا نتیجہ ہے۔ تاہم —— ان وسس برس میں تمہارے ساتھ کیا ہوا میں نہیں جانتی

"لیکن تم ..."

لاپرواہانہ انداز سے بولتی ہوئی وہ سینگ ہُوا کو غور سے دیکھتی رہی۔ عنفوانِ شباب میں ان کی خوب ملاقات رہی تھی لیکن جوانی کے بعد وہ ایک بار بھی نہ مل سکیں۔ اسے یاد تھا کہ اس نے سنا تھا کہ سینگ ہُوا نے کسی کام کے لئے کالج چھوڑ دیا تھا لیکن وہ کام کیا تھا؟

اس وقت تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جو زندگی وہ بسر کر رہی ہے اس کے لئے پچھلے تمام برسوں میں باضابطہ تیاری کی گئی تھی ——— ایک دولتمند کی بیوی بننے کی!

"میرا خیال ہے کہ یہ بالکل فطری بات ——— بورژوا عورتوں میں رہ کے سوا شادی شدہ زندگی کی بیکار تفریحوں کے اور کیا حوصلہ ہو سکتا ہے۔ ایسے پس منظر نے تمہارے دماغ کو اس طرح کی زندگی کے لئے تیار کیا۔ اور تمہاری شادی ان عقائد کے بالکل مطابق ہے جو تمہیں سکھائے ———"

سینگ ہُوا یکایک کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی متانت اور اس کا سکون غائب ہو گیا اور بڑے جوش سے وہ بول اٹھی

"نہیں، نہیں! یہ سب بالکل غلط ہے"

"غلط ہے ... تو تم ———"

"سراسر غلط۔ میں نے ان سے اس لئے شادی کی ——— اصل میں تمہارا جو بھی خیال ہے اس سے بالکل مختلف حالات میں یہ سب کچھ ہوا۔ میں ——— دیکھو نہ، میں نے شروع میں ان سے ملاقات اس لئے ——— اس لئے ———"

سینگ ہُوا بڑی سنجیدگی سے سوچتی ہوئی میز پر جھکی رہی لیکن فوراً ہی اس نے اپنا دلکش انداز تبدیل کر لیا۔ اپنی بید مجنوں جیسی کمر کو ذرا سا جھکایا اور ایک پیر اُٹھا کے اس میں خم دے کے پیچھے کی طرف کر دیا۔ اور پھر بولی:

"میں نے ان کی صحبت اس لئے قبول کی ——— اس لئے ———"

"کس لئے؟"

"انقلاب کے لئے!" آہستہ دھیمی آواز میں وہ بولی۔

"انقلاب اور تم!" اس کی بہن حیران ہو کے پیچھے ہٹ گئی۔ "تمہارا مطلب ہے کہ تم کمیونسٹ رہ چکی ہو؟"

"بالکل"

اس کی بہن منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے میز کو دیکھا جس پر مٹھائیاں لدی ہوئی تھیں، ایک انیون کا لیمپ رکھا ہُوا تھا اور ایک گلاس، جس میں کی آدھی شراب پی گئی تھی۔ اس عیش و عشرت کے گناہ آلود ماحول سے دور سینگ ہُوا کا کرتی اور تصور اس کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا، سینگ ہُوا جو خلوت گاہ میں چار چار یا پانچ گھنٹے اپنی آرائش اور سنگار میں گذارتی، سینگ ہُوا

جس کے لئے، جہاں بھی وہ جاتی، دوست ہوتے، ولائتی شرابیں، ناچ گانے، شطرنج، چوسر، گنجفے، سینگ ہُوا جس کو ہر مہینے ذاتی خرچ کے لئے ہزار دو ہزار ڈالر ملتے اور جس کا جب جی چاہتا نئی گاڑی خریدتی ——— یہی سینگ ہُوا انقلابی؟ اور پھر اس کا یہ دعوےٰ کہ اسی کے ذریعہ اسے اس کا شوہر ملا!

"لیکن میں اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ پچھلی باتیں دبی ہی رہنے دو۔"

یہ کہہ کے سینگ ہُوا نے اپنا بازو اوپر اُٹھایا اور ہوا میں ہلاتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی بہن کی آنکھیں اس کی طرف ہیں اور بلا ارادہ وہ ادھر مڑی انکی نگاہیں مل گئیں لیکن جلدی سے وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"میں سمجھی نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہیں اپنے شوہر جیسے شخص سے انقلابی کاموں کے سلسلہ میں کیسے ملاقات ہوئی؟ یا تم بتانا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ لیکن جب میں اپنی اس زمانہ کی زندگی کا خیال کرتی ہوں تو میرا دل . . . " اس نے جملہ ختم نہیں کیا کھڑکی کے پاس جاکر اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے چوکھٹے میں وہ ایک تصویر معلوم ہو رہی تھی! باہر آسمان پہ چاند نکلا ہوا تھا۔ دھیما دھیما چمکتا ہوا دائرہ، جیسے نارنگی کی ایک پھانک . . . .

٢

. . اسی چاند کے نیچے کتنی ہی بار وہ لئن ون کین کے مضبوط بازوؤں کا سہارا لئے کیچڑ اور گندگی بھری گلیوں سے گزری تھی وہ اس سے کچھ اُونچا تھا۔ اس کے ہاتھ مضبوط تھے اور سرد، وہ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنی فولادی گرفت میں لے لیتے۔ وہ اس سے بالکل لگی ہوئی چلتی، اتنا سمٹی ہوتی کہ زمین پر دونوں کا ایک ہی سایہ پڑتا۔

اسی طرح ایک رات وہ ایک ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتے چلے جا رہے تھے کہ اس نے پوچھا: "تمہیں یقین ہے کہ تم یہ کرسکو گی؟"

"بالکل یقین ہے!" اس نے مسکرا کے کہا: "صرف ذرا سا دلربائی کا کام ہے اور اس کے صحیح طریقہ سے ———"

"آہ! میرا یہ مطلب نہیں۔ یہ غیر متعلق بات ہے۔ میں صرف ———"

ان کے سامنے ایک بڑا سا سایہ نمودار ہُوا۔ وہ فوراً چپ ہو گیا۔

سینگ ہوا کانپ گئی اور اسے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اس کالے سائے کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی بھیانک مگر دہرا گزرتی معلوم ہوئی۔ لیکن کچھ ہوا نہیں۔ یہ لئن ون کین کے نزدیک سے بغیر رکے ہوئے نکل گیا۔ اس نے گھوم کے اس شخص کی طرف گھورا۔ (پتہ نہیں کون تھا) اور پھر اطمینان کی سانس لے کے اپنی ساتھی کے چہرہ کی طرف سے مضطرب نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے چہرہ کا انداز اور رنگ ذرا بھی نہ بدلا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی:

"نہیں یقین ہے کہ تم اس سے روپے وصول کر سکو گی؟ اس دلال سے ——— کیا نام ہے اس کا؟"

ـ لی

"ہاں لی۔ تو آتی تری ہم تم اس سے حاصل کر لوں؟"

"میں بالکل دعوے سے تو نہیں کہہ سکتی" وہ مسکرائی۔ "سب کچھ دل ربائی پر منحصر ہے۔ غیر معمولی کشش پر۔ اس کے علاوہ اور کسی صورت سے کامیابی نہیں ہو سکتی" وہ اس کے اظہارِ پسندیدگی کی متوقع تھی اور اس مسئلہ کی تفصیل و تشریح کے لئے آمادہ تھی۔ اس پر اور جھک گئی۔ لیکن اس کے ہونٹ بند رہے اور آنکھیں زمین پر، جیسے کہ وہ بہت فکر میں ہو۔ بعض مرتبہ وہ اس کو بالکل بھول جاتا اور اتنا تیز چلنے لگتا کہ وہ اس کا ساتھ نہ دے سکتی۔ وہ ایک مرتبہ تو تاروں تک گھر میں بیٹھی تھی۔

"ٹھنگنا گھر پر ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں؛ ہاں گھر ہی پر ہے ——— تمام دن پلنگ پر پڑا رہا"

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بے رنگ زرد چہرہ آگیا جس کی مغموم آنکھوں کے نیچے سیاہ جھائیاں تھیں۔ اسے پھر ڈر لگنے لگا۔

"اسے اچھا کرنا چاہیئے!"

"لیکن کیسے، کس چیز سے؟" لن دن کین نے منہ سکوڑ لیا۔ "ہمارے بہتیرے ساتھیوں کو یہی بیماری ہے۔ اگر ہم سبھوں کو آرام اور علاج کے لئے بھیجیں تو پھر کام کے لئے روپے کہاں سے آئیں گے، کام کو چلائے گا کون؟"

اس کے بازو کا سہارا لئے وہ کانپ گئی۔ "پھر تم احتیاط کرو۔ ہاں تمہیں احتیاط کرنا چاہیئے!"

اس نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ "کوئی خاص احتیاط کرنے کا میرے پاس وقت کہاں؟ اس کے علاوہ میں موت کے لئے تیار ہوں۔ آج یا کل مجھے مرنا ہی ہے۔ ایسے نہیں تو دشمن کے ہاتھ سے!"

اس نے دل سے اٹھتی ہوئی آہ کو اندر ہی اندر دبا دیا۔ اور بڑی کوشش کی کہ اس کا ڈر ظاہر نہ ہونے پائے۔ اس نے زبان دانتوں تلے دبالی یہاں تک وہ پھولنے لگی اور گال پھڑکنے لگے۔ وہ سوچنے لگی کہ ٹھنگنا ہوا اور کتنے دنوں تک بچے گا۔ لن دن کین کے گھر پہنچ کے اسے اپنے اوپر قابو رکھنا ایک دم مشکل ہو گیا۔ اس کا تمام بدن کانپ رہا تھا۔

بیمار ہو کر تیز بخار تھا اور اس کا چہرہ بالکل سرخ ہو رہا تھا۔ جب کھانسی آتی تو چہرہ سکڑ جاتا اور بدن درد کی شدت سے دوہرا ہو جاتا۔ آخر کار اس نے بھر منہ بلغم پھینکا اور اس سے کچھ سکون ہوا۔ تکیہ پر گر کے آنکھیں بند کئے پڑا ہانپتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ دکھ بھری آواز میں لن دن کین سے بولنے لگا۔ کمرہ کی ہوا بالکل گندہ تھی اور ہر چیز پر بیماری کا اثر معلوم ہوتا تھا۔ لن دن کین اسی کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں کھانسی اٹھتی رہتی۔ جب لن نے اسے بتایا کہ میٹنگ ہوا نے موجودہ ضرورت کے لئے کافی روپے

ونے کا وعدہ کیا ہے تو وہ بڑی کوشش سے چہرہ اٹھا کے شکر گزاری سے مسکرایا۔ بینگ ہُوا منہ پر رومال رکھے کھڑکی کے پاس ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ یونانیو اُسے دیکھنے لگا۔ تو اُس نے۔ رومال ہٹا کر جواب میں مسکرانے کی کوشش کی۔

"جب تک روپیہ نہ ملے ہم یہاں کا کام جاری نہیں رکھ سکتے۔ اور اس وقت ہم چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ وہاں ـــــــ اس کا دم ٹوٹنے لگا ـــــ وہاں ہمارے شہید ساتھی ۔ وہ بھی ۔۔۔"

وہ پھر پھٹی پھٹی آواز میں کھانسنے لگا۔ اس کا سارا جسم اینٹھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی آنتیں تک باہر نکل پڑیں گی۔ اس کا چہرہ اور لال ہو گیا اور رگیں تنی ہوئی رسی کی طرح ہو گئیں۔ وہ اس طرح اُچھل اُچھل کے کھانس رہا تھا کہ چارپائی چرچر بولنے لگی۔ آخر کار پھر بہت سا بلغم نکلنے سے سکون ہُوا اور وہ بستر پہ پڑ کے منہ کھولے زور زور سے سانس لینے لگا اس کی آنکھیں آدھی بند تھیں۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں بینگ ہُوا نے دیکھا کہ وہ اس کے پریشان چہرہ پر نظریں جمائے ہے اس کی مردہ سی مسکراہٹ یہ کہتی معلوم ہو رہی تھی کہ "میں اتنا بیمار نہیں کہ میرے لئے پریشان ہُوا جائے۔"

"اگر ہمارے منصوبے پورے ہو جائیں تو ہم یہاں ایک بڑی تحریک قائم کر دیتے ہیں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہانگ کانگ کی شورش سے بھی بڑی!" وہ سوکھی سوکھی سانسیں لینے کو رکا: "اس وقت واقعی صورت حال نازک ہے۔ اگر ہم اس وقت سنبھال سکیں۔ اس لی سے تم کتنا حاصل کر سکو گی؟ اس سے تمہارا کوئی رشتہ ہے؟"

"اس کا پورا نام لی سو لی ہے خاص میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ جب میں چچی کے گھر رہتی تھی تو وہیں اس سے ملاقات ہوئی تھی میری چچی اپنی بیٹی کو اس سے بیاہنا چاہتی تھی۔ وہ مجھے صرف ایک رشتہ دار کی حیثیت سے جانتا ہے اور بس۔ پھر بھی وہ مجھ سے بہت خلاق اور توجہ سے ملتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے بتایا کہ وہ عجیب مضحک اور تھکا دینے والا شخص تھا۔ اس کی تفصیل بھی اس نے بیان کی۔ پھر بولی: "لیکن اس کی کچھ پروا نہیں۔ جو ہمیں چاہیئے بس وہ مجھے حاصل ہو جائے! دلربائی اور دلکشی کے فنکارانہ استعمال کو کامیابی ضرور ہونی چاہیئے!"

دوسرے ہی روز اس نے لی سو لی کے ساتھ کھانا کھایا، شراب پی اور پھر چائونگ پارک میں گئی جہاں بیٹھے وہ موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ وہ خوب پوڈر لگائے ہوئے تھی اور گالوں پر خوبانی جیسا ہلکا رنگ تھا۔ وہ برابر مسکرا رہی تھی اس کا چہرہ پھول جیسا پیارا اور خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔

لی سو لی دلچسپ بننے اور دلکش کرنے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔ "آج کتنا خوبصورت چاند نکلا ہے!" اس نے اپنی تائی شان لہجے میں کہا۔ اس نے اس طرح کے اور بھی رومانی خیالات کا اظہار کیا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ ٹھنڈی آہ بھی بھر لیتا گویا کچھ مذاق بھی کر رہا ہو۔ "تم جانتی

ہو نہ ؟" اس نے بار بار پوچھا۔ وہ اس کی بے انتہا خاطر کر رہا تھا۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتے وہ بڑے شائستہ انداز سے اپنے موٹے بازوؤں کے خم کا سہارا پیش کرتا۔

لی سولی کی عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ اس کا سر کے بیچ کا تھوڑا سا گول حصہ بالکل چندلا تھا۔ لیکن ادھر اُدھر خوب چمکیلے بال تھے اور ان بالوں میں داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے کنگھی کرنے کی عادت تھی۔ جب کبھی شکر یا روئی کے بازار کی حالت پر باتیں ہوتے لگتیں تو بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کی بھویں اُوپر اُٹھ جاتیں۔ لیکن ان موضوعات پر وہ عورتوں کے سامنے باتیں نہیں کرتا تھا اس کی آنکھیں نیم باز تھیں اور اکثر وہ بڑی حسرت سے کہا کرتا کہ لوگ اسے سمجھتے نہیں۔ اپنی گول توند کی طرف کوئی اشارہ اسے خاص طور سے ناگوار تھا۔ اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ وہ موٹا نہیں بلکہ صرف اس کا پیٹ اوروں سے ذرا بڑا ہو گیا ہے۔ اور اس واقعہ کی توجیہہ یہ پیش کرتا کہ وہ بیر پیتا ہے۔

اب سینگ ہُوا نے کنکھیوں سے اس کے چکنے چہرے اور باہر نکلے ہوئے دانتوں کو دیکھا اور دل میں سوچا کہ کسی دن اس کی چھپری بہن پاؤچن ان موٹے بازوؤں کی گرفت میں ہو گی اور یہ دانت اس کے گالوں پر ہونگے اور اس خیال سے اُسے بڑا لطف آیا۔

"ہنسی کیوں ہو؟" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"میں پاؤچن پر ہنس رہی تھی ——— یہ خیال کر کے کہ اگر وہ تمہیں یہاں دیکھ لے تو حسد کے مارے جل جائے۔"

اس نے بھویں سکیڑلیں اور بے خیالی سے سر کھجانے لگا: "تم تو جانتی ہو ——— اس کی افتادِ طبع میرے لئے مناسب نہیں اور تم ——— تم تو ——— لیکن میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میری صحبت میں تم بے کیفی تو نہیں محسوس کرتیں؟"

وہ مسکرائی اور اپنے خاص فن کا استعمال کرتے ہوئے ہلکے سے اس کا بازو دبا دیا۔ بولی کچھ نہیں۔

تیز ہوا اس کے ریشمی گاؤن کو اس کے پیروں سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ شراب کا سرور آ چکا تھا۔ اس کا جسم بے حد ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بادلوں پر چل رہی ہو۔ ہوا میں تیرتی ہوئی کوئی خوشبو اس کی زبان پر مٹھاس پیدا کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ کسی پھول کی مہک تھی، یا ہرے گھانسوں کی، یا کہیں کوئی عطر مہک رہا تھا؟ سیر کرنے والوں کے چہرے اسے بے حد نرم اور مطمئن نظر آ رہے تھے گویا دنیا میں دکھ درد جیسی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ہوا میں تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ "دنیا ہے کچھ رنگین اور حسین!" وہ چل نہیں رہی تھی۔ اُڑ رہی تھی۔ اس کے اندر کہیں سے بات بات پر ہنسی کے چشمے اُبل رہے۔ اس کے ہر ہر لفظ پر اس کا سارا جسم گلگنا معلوم ہوتا۔ معمولی سے معمولی حرکتوں اور اشاروں ——— گردن کے ایک خم، کاندھوں کی ایک جنبش ——— میں اسے ایک نئی لذت مل رہی تھی۔ روش کے موڑ پر تو وہ بالکل پھسلتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے پہلے کبھی نہیں معلوم ہوا کہ شنگھائی واقعی میں ہے، اس میں اتنی زندگی ہے!"

ان کے آگے بچے چیختے اور ہنستے ہوئے گھاس پر لوٹ رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی ان ہی میں سے ایک

ہے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یکایک اس کے چہرہ پر سے ایک نقاب نوچ کے پھینک دی گئی۔ اور وہ زیادہ آسانی سے سانس لے سکتی ہے۔ اسے آزادی مل گئی تھی اور اسے پھر صرف زندہ رہنے کی سیدھی سادی مسرت حاصل تھی، یہ جاننے کی کہ دنیا کی ہر چیز اس کی خوشی کے لئے ہے اور دوسرے لوگ بھی اسی لئے پیدا ہوئے ہیں۔

اندھیرا ہونے لگا۔ چاند جھبر جھبری بدلیوں کے پردہ میں چھپا بیٹھا تھا ہوا ٹھنڈی ہونے لگی اور رینگ ہوا کے کپڑے اس کے جسم سے اور چمٹ گئے۔

لی سولی نے یکایک اپنا موٹا بھاری ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا اور . . . ایک دم سے وہ اپنی حقیقت کیطرف واپس آگئی۔

"تمہیں اسکول پہنچا دوں؟"

اسکول! وہ بھول گئی تھی کہ اسے اس کا صحیح پتہ معلوم نہیں تھا اور لین دن کین کے ساتھ اس کی زندگی کی خبر نہ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ ابھی تک اسکول ہی میں۔ اس نے جلدی سے کہا۔

نہیں میں ہوسٹل نہیں جاؤں گی۔ چچی کے گھر تک پہنچا دیجئے۔ آج وہیں رہونگی"

دونوں موٹر میں سوار ہو گئے۔ اس کا چہرہ سینگ ہوا کے بالکل نزدیک تھا۔ "اگر میں تمہارے کوئی کام آسکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ کہوں؟"

اُس کا کچھ اور ہی خیال تھا لیکن وہ چپ رہی ٹھنڈی سانس لے کے اس نے سوچا "زیادہ اچھا تو یہ ہوتا کہ اس وقت دن کین میرے ساتھ ہوتا۔ لیکن دن کین چاندنی کی سیر میں کب وقت برباد کرنے والا تھا! آج کی شام کے بارے میں یہ خیال ہوگا کہ اتنا وقت اور اتنا روپیہ انقلاب کا برباد ہوا۔ اس نے اصلی مقصد کے بارے میں لی سے کچھ نہ کہا تھا۔ کل ہو جائیگا۔ اس نے اس سے کل بھی ملنے کو طے کیا تھا اور اب سوچ رہی تھی کہ کامیاب ترین جھوٹ کیا ہوگا۔ اس سے کہے گی کہ کوئی چیز —— بہت ضروری چیز خریدنے کے لئے اسے رُوپوں کی ضرورت ہے یا کسی کا قرض ادا کرنا ہے . . . خیر کل دیکھا جائے گا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کم سے کم آج میں آزاد رہی ہوں اور زندگی کا لطف اُٹھایا ہے"

لیکن وہ جانتی تھی۔ کہ یہ آزادی بھی محض ایک دھوکا تھی۔ اُس ڈرامہ کا محض ایک ٹکڑا جو اس سے بھی کوئی بڑی طاقت آخر تک کھیلے جا رہی تھی۔ اس بڑی طاقت کے سامنے وہ محض ایک ذرہ ناچیز تھی اور آج اس نے جو خوشی محسوس کی تھی۔ وہ حقیقت میں بالکل مہمل تھی۔ یہ مسرت حقیقی تھی، نہ دیرپا۔ وہ مصیبت بھرا چھوٹا سا گھر جہاں اسے جلد ہی واپس جانا تھا، وہ خفیہ کام جس میں وہ دوسروں کے ساتھ ایک مقصد کے لئے متحد تھی۔ ان چیزوں میں ایک جان تھی، ایک مقصد تھا۔ یہی زندگی تھی اور زندگی کے معنی . . .

. . . جد و جہد!

۔ پھر شام کا وقت تھا اور پھر وہی نارنگی جیسا چاند جو اب کچھ بڑا ہو کر آسمان پر چمک رہا تھا۔ لوسے ہوئے کمرے میں کئی شخص تھے اور ان میں یینگ مُوا بھی تھی۔ وہ اس کی چارپائی سے بہت دور بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی طرف دیکھنے کی اسے ہمت نہ ہوتی تھی۔ کھانسی اس بیچارے بیمار کے جسم کو کیسے جھٹکے ڈال رہی تھی! وہ اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھے جا رہی تھی اور بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھی

"ختم ہو گیا" کسی نے دھیرے سے کہا۔

لین دن کین نے کمرے میں کوئی دوا چھڑکنی شروع کی۔ بہتو نے اس لاغر مرجھائے ہوئے جسم کو سہارا دے کے اٹھایا اور آدسن نے چارپائی کے پاس بیٹھ کے بوڑھے مُو کی ٹھوڑی پکڑ لی۔ اس میں اتنی بھی قوت نہ رہی تھی کہ اپنے سہارے بیٹھ سکے۔ اب کھانسی لگاتار آتے جا رہی تھی اور کھانسنے کے ساتھ ہونٹ خون سے تر ہو جاتے تھے۔ اس کی ناک اور ٹھوڑی ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا رنگ پرانی وارنش جیسا ہو گیا تھا اور تمام چہرہ موم جیسا زرد۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ پر مردنی چھائی تھی جب کھانستا تو اس کا بدن بھر سے ٹوٹتا ہوا معلوم ہوتا۔ باوجود اتنی تکلیف کے اسے بولنے کی زبردست خواہش ہوئی گویا اسے کوئی بہت ہی اہم بات بتانی تھی۔ اس کا منہ ہلنے لگا اور ہونٹوں سے کچھ ٹوٹے پھوٹے سمجھ میں نہ آ سکنے والے الفاظ نکلے

"بولو نہیں۔ کچھ دیر چپ چاپ پڑے رہو۔"

یکایک یینگ مُوا چیخ اٹھی اور شدت جذبات سے بے قابو ہو کر جنونانہ طریقہ سے رونے لگی۔ ہر شخص حیران ہو کے اسے دیکھنے لگا۔ . . "میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی جان کچل کے نکالی جا رہی ہے۔"

"کامریڈ لین! مہربانی سے انہیں گھر لے جاؤ۔" جماعت میں سے کسی نے کہا

لین دن کین نے اس کا بازو پکڑا تو وہ بڑی مشکل سے کھڑی ہو سکی۔ وہ اسے کچھ اٹھائے کچھ گھسیٹے ہوئے باہر لے گیا، وہ اپنے حلق کی تنی ہوئی رگوں کو زور سے پکڑے تھی۔ باہر نکل کے لڑکھڑاتی ہوئی چلی تو اداس خو طبیعت نے اس کے ڈر کی جگہ لے لی۔

"کیوں ایسا ہے؟" وہ مری ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "زندگی ہمارے لئے ایسی کیوں ہے، تلخ خطرے اور دکھ سے بھری ہوئی موت ہر گھڑی سر پر منڈلاتی ہوئی؟"

لین نے اسے اور زور سے پکڑ لیا اور چپ رہنے کو کہا۔

"لیکن یہ سب کچھ کس لئے؟ اسے کیا ملا آخر؟ اب وہ مر رہا ہے۔ پچھلے سہے ہوئے تمام چھوٹے چھوٹے دکھ، درد ایک بڑے دکھ میں ڈوب رہے ہیں ——— یہی ہے نہ موت؟ تمہیں یاد ہے ابھی کتنے دن ہوئے کہ اس کے اسی جسم میں زندگی بھری ہوئی تھی۔ ابل رہی تھی، اور اب وہ اس بھیانک بیماری سے مر چکا، قریب قریب مر ہی چکا ———"

"چپ بھی رہو! . . . کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم سب بھی یہی نہیں محسوس کرتے؟ کچھ دیر چپ رہو! بے پناہ دکھ" گھر پہنچ کے سینگ ہُوا نے اپنے کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا اور بستر پر گر پڑی۔ تنی ہوئی رسی کی طرح اس کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ اس کی چھاتیاں کس گئی تھیں اور بہت بڑھی معلوم ہو رہی تھیں۔ لئن کھڑا اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

"ان سب کا نتیجہ کیا ہے، وان گین؟" اس نے آنسو بھری آواز میں پوچھا۔ "بوڑھا چون بھی یاد ہے نہ۔ اس کی زندگی کیسی دکھ بھری تھی اور آخرکار وہ بھی اسی طرح مر گیا! کیا راحت اور مسرت کی خواہش کرنے کا آدمی کو حق نہیں؟"

لئن بستر پر بیٹھ گیا لیکن دوسری طرف دیکھتا رہا۔ وہ اس کے دل کی دھڑکن سن رہا تھا اور اس کی سسکیوں کی کپکپی محسوس کر رہا تھا۔ وہ آگے کو جھک گئی اور اپنا سر اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔

آخرکار وہ بولا "راحت اور مسرت؟ . . . تمہارا مطلب ہے کہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے کو سنہرے کویے میں لپیٹ لو اور جب تک تمہیں شہتوت کے پتے ملتے رہیں ساری دنیا جہنم میں جائے! چونکہ ہم اس طرح کی زندگی نہیں بسر کر سکتے، چونکہ ہم پورے پاکیزہ نہیں بلکہ انسان ہیں کیا واقعی اسی وجہ سے ہمارا یہ اعتقاد نہیں کہ سچی خوشی حاصل کرنا ممکن ہے؟"

سینگ ہُوا نے اپنی زندگی پر قابو پانے کی کوشش کی اور اس سے اس کا لب و لہجہ عجیب سا ہو گیا "میں اکثر سوچتی ہوں کہ انسان کی زندگی دس بیس ہی سال تو ہے۔ پھر کیوں ہم خود سے مصیبت اور دکھ مول لیں؟"

لئن اختلاف کرنے لگا۔ لیکن وہ بات کاٹ کے بولی:

"سنو۔ چونکہ ہم انسان ہیں اسی لئے تو ہمیں انتخاب کرنے کا حق ہے اور کوئی ضرور نہیں کہ یہ انتخاب تلخ ہی ہو۔ کیوں؟ بعض وقت مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں روشنی، کھلے آسمان اور مسرت، صرف معمولی خوشی، کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور ہماری یہ زندگی ہمیشہ چھپی چھپی، ڈر اور احتیاط سے بھری، صاف خوشگوار ہوا اور سنہری دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے حق تک کو چھینتی معلوم ہوتی ہے۔"

لس دن کین نے چڑچڑاہٹ سے اسے دیکھا اور جواب دیتے وقت اس کی آواز میں ایک تکان سی تھی۔

"سچ مچ کی آزادی کی خاطر ہمیں پرانے بندھنوں کو توڑنے کے لیے لڑنا پڑیگا۔ اور ایک نئی سماج بنانے کی جدوجہد کرنی ہوگی ——— لیکن دیکھو نہ، تم تو یہ سب جانتی ہی ہو، سمجھتی ہو۔ تم نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔"

سینگ ہُوا نے سر اٹھایا اور اپنے ہونٹ اس کی ٹھوڑی سے لگا دیئے۔

"ہاں میں یہ سب ——— جانتی ہوں، لیکن ہماری زندگی میں یہ آزادی حاصل ہو سکتی ہے؟"

"اگر ہمارے سامنے نہیں تو ہمارے بعد۔ اس درمیان میں ہی تو ہمیں کچھ کرنا ہے۔" اس نے جھک کے اسے اپنے بازوؤں

میں لے لیا۔ "آج تمہارے اعصاب پر بہت زور پڑا۔ کچھ آرام کرو۔ کل میں تم سے مفصل گفتگو کروں گا!"

اس نے اسے کپڑے اتارنے میں مدد دی اور وہ بستر پر لیٹ رہی۔ وہ واپس جانے کو تھا کہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے بولی:

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ شاید آج میرے حواس ٹھیک نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے خیر تم جاؤ۔ کل مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے!"

وہ اسے روشنی بجھاتے اور دروازہ بند کرتے دیکھتی رہی اور سیڑھیوں پر اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنتی رہی جب آواز غائب ہو گئی تو اسے پھر ڈر لگنے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے خیال ہوا کہ کمرہ میں کوئی ہے اور اس نے اچھل کے روشنی جلائی۔ اس نے پکارا۔ کوئی جواب نہ پا کے اس نے سوچا کہ دروازہ پر کوئی سرکاری جاسوس ہوگا۔ تھک کے پھر بستر پر پڑ رہی۔

"میں اسے برداشت نہیں کر سکتی!" وہ زور سے بولی۔ "غور کرنے پر یہ کیسی حماقت معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے چند ہی سال رہ گئے ہیں اور انہیں اس طرح پھینک دیا جائے ایک ایسے مقصد کے لئے جس کی تکمیل ہم نہیں دیکھیں گے۔ جو شاید اس طریقہ سے کبھی حاصل بھی نہ ہو"

دوسرے دن صبح سویرے لمن دن کیس کے واپس آنے سے پہلے اس نے پارٹی سے ایک مہینہ کی چھٹی کے لئے ایک پرچہ لکھا اور اس کے پاس بھیج دیا۔ جلدی جلدی اپنی چیزیں چمڑے کے تھیلے میں بھریں اور جمی کے گھر چلی گئی . . . .

گرچہ لی سو لی کوئی بے انتہا دلکش آدمی نہ تھا تاہم اس میں خوبیاں تھیں۔ مثلاً سینگ ہوا کی کسی خواہش کے ہلکے سے اظہار کا بھی فوراً اور بڑی دریا دلی سے استقبال کرتا۔ اور اس کو خوش کرنے کے طریقے سوچنے میں بہت مصروف رہتا وہ جانتی تھی۔ کہ لی سو لی کی یہ توجہ اس کی چچی کو پسند اور گوارا نہ تھی ——— ایسا ہونہار داماد ہاتھ سے نکلتے دیکھ کے ہوتا بھی کیسے! ——— لیکن کامریڈ سینگ ہوا نے اس کی فکر نہ کی۔ اپنے کام سے چھٹکارا پا کر چند پر مسرت دن جو اس نے چرائے تھے ان سے لطف اٹھانے کا اسے حق تھا۔

اس کی مسرت بھی تھی

اپنے سارے جسم پر پوڈر ملتی اور گھنٹوں چہرہ پر غازہ لگاتی اور بناؤ سنگار کرتی۔ وہ پوری طرح رنگ رلیاں منا رہی تھی ہر شام لی کے ساتھ جاتی اور رات کو دیر سے آتی۔ آنکھوں میں خمار ہوتا اور ہونٹوں پر شراب کی کڑواہٹ۔ دن کو اس کی نئی موٹر پر ادھر ادھر سیر کرتی پھرتی۔ رومانی کہانیوں اور سینما کے اشتہاروں کے علاوہ کچھ نہ پڑھتی۔

دو ہفتے بڑی جلدی سے گزر گئے اور ایک روز جب وہ لی کی گاڑی میں گھر واپس آئی تو اپنے چھوٹے چچیرے بھائی

کو ایک اہم خبر کے ساتھ انتظار کرتے پایا۔

"کوئی آدمی تم سے ملنے آیا تھا۔ لیو نام بتاتا تھا۔"

"لیو! یہ تو لین وِن کین کا دوسرا نام تھا۔ کوئی پرچہ بھی چھوڑ گیا ہے؟"

"نہیں اس نے صرف یہی کہا کہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ بولا، کوئی خاص بات نہیں۔"

سِنگ ہُوا کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ اسے یکایک ندامت محسوس ہونے لگی۔ لین کا لانبا قد اور خوبصورت سنجیدہ چہرہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ شاید وہ اسے ملامت کرنے آیا تھا؟ یا کوئی اہم خبر لایا ہو؟ شاید اس کے پیچھے پولیس لگی ہو اور وہ پناہ لینے آیا ہو؟ وہ کانپ گئی۔ اس پر نگاہ رکھی جا رہی ہوگی۔ چاروں طرف نظر دوڑا کے اس نے دیکھا کہ صرف ایک صاف ستھرا گرم کمرہ ہے جس میں قیمتی لکڑی کا سامان روشنی میں دمک رہا ہے۔ اور اسے اطمینان ہوا کہ یہاں کوئی دستاویز نہ تھی، نہ ضبط شدہ کتابیں۔ ہر چیز بے داغ اور معصوم تھی۔ ہر چیز حسین تھی۔ بیماری کے جراثیم کا پتہ تک نہ تھا۔ اسے یونا ہُو یاد آ گیا اور وہ دوسروں کے بارے میں سوچنے لگی، جو محنت اور کام کر رہے تھے۔ اسے ایک بار احساس ہوا۔ کیا ساعت سے پہلے اجازت لئے بغیر اسے چلا آنا چاہئے تھا؟

اس کی چچی چاندنی کے مہنال کی گڑگڑی پیتی ہوئی آ گئی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ لیکن آخر کار اس کے اسکول کے دوستوں کا ذکر چھیڑ لیا۔ آج کل آدمی کو دوست ذرا ہشیاری سے بنانے چاہئیں۔ لیکن سِنگ ہُوا کا وہ دوست "لیو" تو بڑا اچھا نوجوان تھا۔

"تمہارا گہرا دوست ہے وہ؟ ہے نہ؟"

"ہاں، ہم ساتھی ہیں۔"

بوڑھی خاتون اپنے سونے کے دانت چمکا چمکا کر اس "نوجوان" کی دلکشیوں کا قصیدہ پڑھنے لگی۔ "وہ واقعی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے انداز بہت دلکش ہیں، ہر ہر بات سے تیزی اور ذہانت ٹپکتی ہے، غرضیکہ اگر اس کی باتوں سے اندازہ لگایا جائے تو) اس سے زیادہ دلکش نوجوان اب تک اس کی نظروں سے نہیں گزرا۔ اس نے اس کی تعریف میں اور لطیف اور مؤثر جملے کہے۔ اور اپنی بھتیجی کو غور سے دیکھتی رہی کہ اس پر ان کا کیا اثر ہوتا ہے۔

سِنگ ہُوا خوش ہو ہو کے مسکراتی رہی لیکن دل میں سوچ رہی تھی: "یہ نہ سمجھنا کہ تم مجھ سے کچھ پتہ چلا لو گی۔ میرا خیال ہے کہ میں اس لی سوں کو اپنے قابو میں کئے ہوئے تمہاری پہنچ سے دور ہی رکھوں گی۔"

جب چچی چلی گئی، تو اس نے غصہ میں اپنا موزہ کرسی پر پٹک دیا اور پھر دہرایا: "میں اسے اپنے قابو میں رکھونگی"

بہرحال، اب وہ بہی بہنے رہ گئے تھے اور وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد اسے اپنے کام پر، انقلاب کے لئے اسی پوشیدہ زندگی میں واپس جانا ہے۔ وہاں پہنچ کے پھر اس کی انفرادیت، اس کی اپنی ذات مٹ جائیگی۔ وہ پھر اس تحریک کا ایک ذرہ بن جائیگی جس کی جڑ عوام میں تھی اور جس کے نزدیک فرد کی صرف اس حیثیت سے اہمیت تھی کہ وہ (فرد) ایک نظام میں جو کسی ذات واحد سے بہت بڑا ہے، محض ایک تصوری خیال ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے پھر ہشیار رہنا ہوگا، بیماری ہی سے نہیں بلکہ خطرے سے ـــــ گرفتاری، قید یا اس سے بڑھ کے، اذیت جس میں اس کے نرم پیر اور جسم کچل دیئے جائیں گے۔

دکھ میں زندگی گذارو اور مصیبت میں مرو!

وہ واپس کیوں جائے؟ اس کے بغیر کام تو نہیں رکا رہیگا۔ اس کے علاوہ اب اسے اس کام میں کوئی دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے الگ ہوجانے سے وہ اس سے کتنی نفرت کریں گے! وہ انہیں یہ کہتے ہوئے سن رہی تھی: "نھی مینگ ہوا نے اس بڑی توند والے چینی تاجر کے ہاتھوں اپنے کو بیچ دیا ہا!" غصہ سے اس کی پیشانی پر شکن آگئی اور اس نے اپنے کو سمجھایا کہ اسے ان کے بارے میں بالکل نہ سوچنا چاہیئے، کم سے کم اور دو ہفتوں تک نہیں۔

پھر بھی . . . .

"اگر میں الگ ہوجاؤں تو وہ مجھے معاف کردیں گے؟" اس نے اپنے آپ سے بہ آواز پوچھا؛ "لیکن دن کین معاف کردے گا؟"

اسے خیال آیا کہ شاید اب تک انہوں نے اس کا نام خارج بھی کردیا ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو اچھا ہی ہے۔ اچھا ہی ہے! اس نے اس قطعی طور سے کہا گویا خود کو یقین دلا رہی تھی کہ واقعی ایسا ہوچکا ہے، وہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کے چہرہ سے بے انتہا ذہنی الجھاؤ اور کوفت کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر وہ تیزی سے چکنے فرش والے غسل خانہ میں گئی اور لانبے قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ پہلے اپنے چہرہ کو دیکھا پھر نیچے اپنے جسم کے نازک خطوط پر نظر دوڑانے لگی جو ریشمی لہروں کی طرح کمر سے اوپر اٹھتے ہوئے اس کے چمکیلے بالوں تک پہنچتے تھے۔ اس نے اپنے کو چے کمان کی طرح لچکائے اور اپنے بازو بڑے انداز سے اوپر اٹھائے اور دیر تک محویت کے عالم میں کھڑی اپنے سامنے آئینہ کی تصویر کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی رہی جیسے آرٹ کے کسی نادر نمونہ کو بے تعلقی سے دیکھ رہی ہو!

"یہ سب کس لئے ہے؟" یکایک اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

وہ نرم گول کاندھے، اونچی چھاتیوں کے محراب کا دل دھڑکا دینے والا حسن، اور وہاں سے لکیر بھری بھری ہاتھی دانت جیسی رانوں تک کی نرمی اور ملائمت! کیا اس بے عیب جسم کے ساتھ، اپنے آپ اور خود فطرت کے ساتھ یہ بے انصافی ہوگی اگر ایسے دلکش جسم کو اندھیرے اور گندگی میں دفن کر دیا جائے؛ شاید بالکل ہی مہمل اور بیکار مہم کے لئے اسے خطرے میں ڈالا جائے؟ اسے وحشیانہ اذیتوں کا نشانہ بنایا جائے؟ وہ بھول چکی تھی کہ اس کا جسم اتنا شاندار تھا اور اب اس کی چمک دمک سے اس کی آنکھیں حیران رہ گئیں۔ اس نے اپنے ہاتھ چہرہ پر رکھے اور کنپٹیوں کو پھڑکتی ہوئی محسوس کیا۔ جب آئینہ پر نظر پڑی تو عجیب و غریب دلفریب ابھار اور خم سے جو چھاتی سے ران تک موسیقی کے ایک مسلسل راگ کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بے حد متاثر ہوئی۔ آرٹ کے اس نمونہ کا اس نے جمالیاتی اصطلاحوں میں تجزیہ کرنا شروع کر دیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔

"ٹکڑے؛" اگر وہ پکڑی گئی تو اس کے کتنے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے؟ وہ کانپ گئی۔

اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ منہ دھونے کے لئے اٹھی۔ پہلے گرم پھر ٹھنڈے پانی سے۔ اس نے پوڈر، غازہ، کریم ہونٹوں کی سرخی سب دھو ڈالا۔ سادہ معمولی چہرہ نکل آیا۔ اسی چہرہ کے ساتھ وہ مزدور عورتوں میں تنظیمی کام کے لئے جاتی تھی۔ کچھ بھی رنگ و روغن نہ ہوتا۔ بھنویں تک سادہ ہوتی تھیں۔ اس نے پھر آئینہ میں دیکھا اور پھر اپنے ساتھیوں کا خیال اور ان کے اونچے اونچے خوابوں کا۔ اسے ندامت سی محسوس ہونے لگی اور اُسے غصہ آ گیا۔

کچھ توڑ پھوڑ کے وہ اپنی جذباتی کمزوری کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان سے قطع تعلق کیوں نہیں کر سکتی تھی؟ لنن دن کین کی صورت اس کے سامنے آ گئی اور وہ غصہ میں چیخ اٹھی: "اچھا ہو یا برا، لیکن مجھے ایک ہی زندگی ملی ہے اور اس کے لئے ایک ہی بار انتخاب کا موقع ہے! تمہارا جتنا جی چاہے مجھ پر لعنت ملامت کر دو، لیکن میں تو اپنا یہ جسم خطرے میں ڈالنے، اسے اذیت کے لئے پیش کرنے نہیں جاتی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی!"

ہر شخص کو آزادی ہے کہ ادھر اُدھر جہاں جی چاہے جائے۔ پھر اسے کیوں نہیں؟

وہ غسل خانہ سے اپنی خلوت گاہ میں دوڑ گئی اور بستر پر گر پڑی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور کنپٹیاں زور زور سے پھڑک رہی تھیں، جیسے کہ ابھی پھٹ جائیں گی۔ اس نے اپنے ٹھنڈے ہاتھ پیشانی پر رکھ لئے۔ وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔ ہر بات سے ایک دوسری بات نکلتی اور پھر اسی سے اس کی تردید بھی۔ آخرکار اس کا سارا غصہ لنن پر مرکوز ہو گیا۔

یکایک دوسرے کمرے سے اس کی چچی کی آواز زور سے آئی۔ وہ اپنی بیٹی پاؤ چن سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ سینگ ہوا کی طرف ایسی لی لی توجہ کی شکایت کرتی معلوم ہو رہی تھی۔

تو ابھی تک بارچن اپنے کو اس کے ہاتھوں بیچنا چاہتی ہے" سینگ ہُوا نے سوچا" میں ایسا نہیں سمجھتی۔ نوجوان عورتوں کا اپنے کو موٹے بوڑھے آدمیوں کے ہاتھ بیچنا بہت بُرا ہے۔ میں ایسا نہ ہونے دونگی!"

لیکن وہ روک کیسے سکتی تھی؟ خود اسے قبول کر لے، اس سے شادی کر لے؟ اس کی آنکھوں کے سامنے ان گنت توندوں اور بے شمار باہر نکلے ہوئے دانتوں کی قطار آگئی۔ اس نے لی سولی کو بے خیالی سے سر کھجاتے دیکھا، ہر ہر لفظ پر زور دیتی ہوئی اس کی بے جان جاری آواز سنی۔ اس کے متعلق مجموعی طور پر سوچنے کا اثر ایسا ہوتا جیسے اس نے رینڈی کا تیل پی لیا ہو! اپنے جسم کے گرد ان موٹے موٹے بازوؤں کی گرفت، اس گول مٹول توند سے لپٹائے جانے کا خیال۔ آخ ... رینڈی کے تیل کا ایک گھونٹ!

پانچ چھ دنوں تک وان لین اور دوسرے ساتھیوں کے متعلق اس کا ضمیر مطمئن نہ ہو سکا اور وہ اداس رہی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ انہیں اپنا مذاق اڑانے، اس امیر جذباتی تجربے اپنے تعلقات پر بڑے مزے سے ہنستے سُن رہی ہے۔ جب کبھی وان لین کا تیغ تبسم اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا تو وہ اپنے کو یقین دلاتی کہ لوگوں نے اسے سمجھا نہیں۔ ایسے موقع پر اسے لی سولی سے ہمدردی ہونے لگتی۔ اسے بھی دنیا سے شکایت تھی۔ شاید یہ سچ ہی تھا کہ بہت کم لوگ اسے سمجھتے تھے۔

آخرکار اس نے فیصلہ کیا وہ وان لین سے مفصل گفتگو کرے گی۔

اس کے مکان پر پہنچی تو وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی، کمرے میں جانے والی سیڑھیوں پر چڑھنے سے پہلے دل کی دھڑکن کو روکنے کے لیے وہ کچھ دیر ٹھہر گئی۔ دل ہی دل میں بات شروع کرنے کے لئے جملے بناتی رہی۔ اس مانوس دروازے سے ایک اجنبی چہرہ نکل کے مشتبہ انداز سے اسے دیکھنے لگا:

"کسے ڈھونڈھتی ہو؟"

"مسٹر لیو ... یہاں کوئی مسٹر لیو رہتے ہیں؟"

"نہیں، اس گھر میں کوئی لیو نہیں!"

وہ نیچے اُتر کے تیزی سے چلی آئی۔ اسے یہ تکلیف دہ احساس ہو رہا تھا کہ شاید اس پر نظر رکھی جا رہی ہے یا پیچھا بھی کیا جا رہا ہے لیکن وہ تلاش سے باز نہ آئی۔ ہر ہر جگہ ماری پھری۔ پہلے تمام ساتھیوں کو ڈھونڈھا۔ سب کے سب غائب تھے ... ہر جگہ اسے شبہ کرنے والی نگاہوں کا سامنا ہوا۔ آخر ایک پرانا دوست وینگ چاؤتی مل گیا۔ لیکن اس نے اس ملاقات پر کوئی خوشی نہیں ظاہر کی۔ صرف چپ چاپ سرد مہری سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے سوالوں کا مختصر اور مبہم جواب دیا۔ مشتعل ہو کے سینگ ہُوا نے اس کا کندھا پکڑ کے اسے زور سے جھنجھوڑا۔ اپنا منہ اس کی ناک کے پاس لیجا کے تھرتھراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"چاؤتی، کیا میں کوئی بلا ہوں، زہر ہوں؟ وان لین آج کل کہاں ہے؟ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟ مجھ سے تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے

"بتاؤ وہ کہاں ہے، مجھے اسی سے ملنا ہے، اس سے ضروری باتیں کہنی ہیں۔"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ بڑے اطمینان سے اسے گھورتے ہوئے بولا:

"سچ مچ میں نہیں جانتا۔"

سنگ ہُوا کا جی چاہا کہ اسے مارے، مار مار کے اس کا پتہ پوچھ لے۔ پھر خواہش ہوئی کہ اس سے لپٹ جائے، اس کے گلے سے لگ جائے، روتے، اس سے التجا کرے کہ وہ اسے نہ چھوڑے۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکی۔ چپ چاپ طیش میں کھڑی اسے دیکھتی رہی اور . . . آنسو پی کے چلی آئی۔

"اب الزام مجھ پر نہیں۔" وہ بار بار اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ "انہوں نے ہی مجھے چھوڑ دیا ہے۔"

تین دن کے بعد وہ پھر چاؤ لی کے گھر پہنچی اور دن کین کے لئے ایک خط دیا۔ خط کیا تھا بھاری بلندہ تھا۔ اوپر سے بند کرکے "س۔ ہ" کی مہر لگی ہوئی تھی۔

یہ تین ہزار لفظوں کی طویل تحریر اس نے دو راتوں میں تیار کی تھی۔

پہلے تو اس نے اپنی افتادِ طبع کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ کیا تھا اور لکھا تھا کہ کئی لحاظ سے وہ کچھ نرالی تھی۔ وہ دوسری عورتوں سے مختلف تھی۔ اس نے ثابت کیا تھا کہ اس کی طبیعت انقلابی کام کے لئے موزوں نہ تھی اور جنگ اور جد و جہد کا ماحول اس کے فلسفہ زندگی کے مطابق نہیں تھا۔ اس نے اپنے فلسفہ زندگی کی تشریح کی۔ اپنی پسند کے مطابق آزادی میں خوشی خوشی رہنے کا حق۔ اس نے بتہ چلایا تھا کہ انسان کو صرف ایک ہی زندگی ملتی ہے اور تاریخ سے بھی وہ اس خیال کی کوئی تائید نکالنے سے قاصر تھی کہ اس کے بعد لوگ اس بات کے لیے پریشان ہونگے کہ اس نے اپنی زندگی کس طرح گذاری۔ لیکن اس کے فلسفہ اور معینہ کام سے تصادم کے علاوہ بھی کیا انہوں نے اسے پہلے نہ چھوڑا تھا؟ (اس نے ایک سطر، ایک لفظ سے بھی اس طرف اشارہ نہیں کیا کہ وہ بھاگ آئی تھی یا یہ کہ انہیں یہ فکر ہوگی کہ کہیں وہ غداری نہ کرے) لیکن اب جب سب کچھ ختم ہو چکا، وہ چاہتی تھی کہ وہ اس کا نظریہ سمجھ لیں۔ بس وہ موت سے ڈرتی نہیں تھی۔ لیکن اسے زندہ رہنے کی خواہش تھی۔ آخر میں اس نے لن دن کین سے محتاط اور ہشیار رہنے کی التجا کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ وہ ذاتی دوستی بھی ہمیشہ کے لئے قائم رکھنے کو تیار تھی، اگر وہ چاہے تو۔

سنگ ہُوا کو اطمینان نہیں ہُوا۔ یہ خط بھیج دینے کے بعد بھی وہ دن کین کو نہ بھول سکی۔ رہ رہ کے یہ خیال آتا:

"اب کبھی بھی اس سے ملاقات نہ ہوگی؟ کبھی بھی نہیں؟"

اس کی زندگی کے مسئلے حل نہیں ہو گئے تھے۔ اب وہ چچی کے گھر زیادہ نہیں رہ سکتی تھی ——— پاؤ چن کا رشک و حسد ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا ——— لیکن پھر بھی وہ طے کر چکی کہ اپنے افلاس زدہ گھر میں تو واپس نہیں جائے گی۔ اس نے اپنے کرایک

مہینہ اور وقت دیا تھا۔ اور اسی میں کوئی نہ کوئی صورت نکلنی تھی!

وہ ایسا محسوس کر رہی تھی۔ کہ کسی اتھاہ سمندر میں موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہے اور کہیں کوئی کنارہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس ایک چیز سے قطع تعلق کے بعد، جس کی وجہ سے کچھ دنوں تک اس کی زندگی کا ایک مقصد تھا، اب اس کے سامنے کوئی منزل نہ تھی، کوئی راستہ نہ تھا اور وہ بھٹک رہی تھی . . .

اور اسی کیفیت میں وہ لی سول سے ملی۔

اس نے پھر اس کے چندلے سر پر نظر ڈالی، پھولے پھولے پچکے چہرہ کو غور سے دیکھا اور منحوس دانتوں کو دیر تک تکتی رہی۔ اس نے اپنے کو یقین دلانا چاہا کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں اور محبت اسے دلکش بنا دے گی۔ بار بار اپنے آپ سے کہہ رہی تھی: "میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے اس سے سچ مچ محبت ہے!" اس پر بھی جب اس کے بازوؤں نے اسے گرفت میں لیا اور اس کا بڑا سا منہ اس کے منہ سے لگا تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ کوئی کڑوی دوا پی رہی ہے، اسے کسی جرم کی سزا مل رہی ہے۔

"آہ!"

"سینگ ہوا آؤ ہم لوگ جلدی سے شادی کر لیں ——— میرے نینیا تک جانے سے پہلے۔ بولو، کیا کہتی ہو؟"

اس نے لمبی سانس لی :۔ "اس معاملہ میں میری کوئی خاص رائے نہیں!"

اس نے بڑے جوش سے آگے کو جھک کے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے چمٹا دیئے اور دیر تک اسی طرح رکھے رہا۔ آخر جب الگ ہوا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ ہانپ رہا تھا۔ بڑی للچائی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں خوشی کی چمک سے پھیلی ہوئی تھیں۔ بے خیالی میں موٹے ہاتھ سے وہ اپنے بال سہلانے لگا۔

یکایک سینگ ہوا نے صوفے میں منہ چھپا لیا اور سسکنے لگی۔

"کیوں، کیا ہوا؟" اس نے حیران ہو کے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

بہت دیر کے بعد سینگ ہوا نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ لے آئی اور اپنا گال اس کے گال سے سٹا کے بولی:

"کچھ نہیں۔ بس بہت خوش ہوں!"

۳

مسٹر لی سول کے عیش محل کے سامنے جھیل کی سطح زرد ہو گئی۔ وہ ایک کشتیاں جانے کے راستے میں . . . دھرے

پھسل رہی تھیں اور فضا پر ایک اداس دلکشی چھائی تھی۔

سینگ ہوا کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی دیر سے ہلی تک نہ تھی۔ نہ اس نے اپنی بہت سی باتوں کا جواب ہی دیا تھا۔ اب ہوا ذرا تیز ہو رہی تھی اور مغنی کی آواز کمرہ میں بھری جا رہی تھی۔ وہ تصورات حزیں گا رہا تھا بار بار یہی گا تا وہ کیوں گا تا تھا، اس سے اسے دن کین کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ کہاں ہوگا؟

"دھواں کا کوئی خط آیا ہے؟" اس کی بہن نے یکایک زور سے پوچھا۔

سینگ ہوا چونک گئی "کس کا؟"

"تمہارے سہر کا، اور کس کا"

"اوہ" اس کا چہرہ تمتما گیا "ہاں آیا ہے"

وہ یکایک پلٹی۔ سر کو جھٹکا دے کر اپنی ہنس جیسی گردن کی پوری خوبصورتی اور نظر فریبی نمایاں کرتی ہوئی بہن کے پاس آئی۔ اور اپنی موہنی مسکراہٹ کے ساتھ ——— جس کے لئے وہ اتنی مشہور تھی ——— دولتمند خاتون والی دھیمی آواز میں بولی

"آؤ بہن چلو۔ آج چاندنی میں جھیل کی سیر کریں . . . دو بوتل شراب لیتے چلیں گے ——— ایک تمہارے لئے ایک اپنے لئے۔ ایں؟ آؤ جلدی سے چلیں! آج خوب پئیں گے، خوب!" . . .

چودھری برکت علی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے مرکنٹائل پریس ... لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبِ لطیف لاہور سے شائع کیا۔

وزیر اعظم پنجاب کی زرّیں رائے

بنک کی اقتصادی تجارتی اور صنعتی ترقی میں مسلمانوں نے برادران وطن کے ساتھ ساتھ کافی حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے ... اس سلسلے میں عمدہ مدد پہنچا رہا ہے۔ میں بنک کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

لاہور ۲۰ فروری (دستخط) سکندر حیات

[illegible] ... اپنے اہل ملک ... عموماً مسلمانوں کو ... وہ اس ادارہ کی ہر ممکن امداد کریں ... کاروبار سے مسلم قوم کی امداد مقصود ہو۔

[illegible] فروری

دی سنٹرل ایکسچینج بنک انارکلی لمیٹڈ لاہور

نہایت مسرت کے ساتھ اپنے حصہ داران میں

چھ (۶) فی صدی منافع (فری آف انکم ٹیکس) کا اعلان کرتا ہے

اور قوم سے متوقع ہے کہ وہ اس ادارہ کی امداد میں بیش از بیش حصہ لیں ... کامیاب بنانے میں کوشاں ہو کر اسے اپنی اقتصادی مرفّع الحالی کا ذریعہ بنائیں۔ بنک کی ترقی مقابلتاً نہایت تسلی بخش ہے اس کا منافع پہلے سال کی نسبت سے تین گنا بڑھ گیا ہے جیسا کہ تقابل کا گوشوارہ ظاہر کر رہا ہے۔

سال	سرمایہ جاری شدہ	سرمایہ ادا شدہ	امانتیں	ڈیویڈنڈ	سرمایہ کاروبار	ریزرو فنڈ	منافع
۱۹۳۷ء	۷۱,۸۰۰	۲۸,۳۷۰	۱,۷۳,۷۲۲	۵ فیصدی	۲,۴۰,۷۲۹	کوئی نہیں	۱۹۸۴
۱۹۳۸ء	۷۳,۲۵۰	۳۲,۳۸۰	۲,۱۴۴۸	۵ فیصدی	۲۶,۹۰۳۹	۲۰۰۰	۲۷۱۵
۱۹۳۹ء	۹۹,۱۰۰	۳۸,۲۶۵	۲,۷۸,۱۱۴	۶ فیصدی	[illegible]	[illegible]	۴۸۹۸
۱۹۴۰	۱,۱۳,۷۵۰	۴۹,۰۷۰	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۵۰۰۰	۶۵۱۸

المشتہر: میاں احسان الحق صاحب بی۔اے مینیجنگ ڈائرکٹر

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہو جائیں گے



سائنس کی حیرت انگیز ایجاد جو سیاہ اور بدنما جلد کو سفید اور دلکش بنا دیتی ہے

ہندوستان کے تمام کالے گورے ہو جائیں گے۔ یہ "فلوروزون" کی وجہ سے ہوگا۔ ہمارا دعویٰ ہے۔ ہم گذشتہ کئی برسوں سے اس معاملہ کی ریسرچ کر رہے تھے۔ اس ایجاد سے ہر ایک شخص گورا ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہ برقرار دوامی زندگی اور خوبصورتی میں عروج اور رتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ رات سوتے وقت "**فلوروزون**" کے چند قطرے ہتھیلی پر ڈال کر چہرے پر دو چار منٹ مالش کیجیے۔ صبح چہرے کو نیم گرم پانی سے دھو ڈالیے۔ متواتر چار ہفتہ ایسا کیجیے۔ اور اس کے بعد آئینہ میں اپنی شکل دیکھیے۔ آپ حیران ہو جائیں گے۔ وہ چہرہ جو سیاہ گندمی رنگ کا تھا۔ مائل چہاسے جھائیوں وغیرہ کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اور بدنما مرجھائے ہوئے چہرے پر بہت جوانی اور بہار آگئی ہے۔ فلوروزون سائنس کی حیرت انگیز ایجاد ہے اس کے قطرے میں فلوروزون تیزابی جن گیس، سائنٹیفک طریقوں سے شامل کی گئی ہے۔ جو جلد کی سیاہی کو لے کر اپنے میں جذب کر لیتی ہے۔ اور جب آپ صبح اٹھتے ہیں۔ اس وقت آپ کے چہرے کی سیاہی، کیل، مہاسے، جھائیاں وغیرہ آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہیں۔ اور چار ہفتوں میں بدنما چہرہ حسین اور دلکش ہو جاتا ہے۔ ہر ایک مرد عورت اس سہل سائنٹیفک ایجاد سے دائمی خوبصورتی اور ناز حاصل کر سکتا ہے۔ فلوروزون کے استعمال کے بعد عارضی خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے کریم پوڈر وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ فلوروزون چہرے کے علاوہ جسم کے ہر ایک حصہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بالکل بے ضرر ہے۔ فلوروزون کا مکمل کورس صرف روپیہ آٹھ آنے میں ملتا ہے۔ ڈاک خرچ الگ۔

ہندوستان کے ہزاروں مرد عورتیں "فلوروزون" سے فائدہ اٹھا چکے ہیں

تیار کنندگان۔ فلوری کیمیکل انڈسٹریز

ہندوستان کے نمائندگان: فلوروزون ڈپو۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۷۵ (A.L.R) بمبئی

سالنامہ

ادب لطیف

نئی کتابیں

میرے نغمے — سلام مچھلی شہری
ادب کثیف — حاجی لق لق
ادب اسلام اور اسلامی مفکرین
تاریخ احرار — چوہدری افضل حق
میرا افسانہ
پاکستان (انگریزی)
نگارشات — محمد باقر
کلیاں — عصمت چغتائی
بحر الکاہل کی سیاست — ابن خالدی
قومیت اور بین الاقوامیت — محمد قاسم حسن
ممالک اسلامیہ کی سیاست — عشرت حسین صدیقی
بزم اکبر — قمرالدین بدایونی
ایران بعہد ساسانیاں — مترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال
جزیرہ سخنوراں — غلام عباس
کیا خوب آدمی تھا
آثار جمال الدین افغانی — قاضی عبدالغفار
معمار اعظم
روسی ادب اول و دوم — محمد مجیب
گورکی کی آپ بیتی — مترجمہ اختر حسین رائے پوری
عبدالقادر
کتاب اسلم (حصہ اول)، اردو کی انسائیکلوپیڈیا
محسوسات ماہر — ماہر القادری

گرہن — راجندر سنگھ بیدی
ٹوٹتے ہوئے تارے — کرشن چندر
آہنگ — اسرار الحق مجاز
آیات و نغمات — جوش
رومانی افسانے (انتخاب رسالہ رومان)
سرگزشت شباب — مجنوں گورکھپوری
وحی الٰہی
قصص القرآن
انقلاب روس — ایم ایم جوہر
نقش فریادی — فیض احمد فیض
فاسزم — مترجمہ تاری
آزادی کی راہیں — برٹرینڈ رسل
زندہ چین — مترجمہ نمانی
آج کا مصر — پروفیسر محمد حسن
مزاحیہ ڈرامے — جلیل احمد
شعرستان — اختر شیرانی
خار و گل — ایم اسلم
اقبال کا مطالعہ — نذیر نیازی
مولانا محمد علی کے سفر یورپ (مرتبہ سرور صاحب)
ساز شکستہ (ناول) — مولانا رشید اختر ندوی

مکتبہ اردو لاہور